بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

دسمبر 2020

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 8
حمد، تنویر پھول 9
نعت، سید ظفر علی شاہ بخاری 9
نبیؐ کی باتیں، ادارہ 10

انٹرویو

ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات، شاہین رشید 21
بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا، آمنہ زریں 15
دستک، شاہین رشید 26
جب تجھ سے ناتا، ف۔ الف 35
شعاع کے ساتھ، ادارہ 248

ناول

نور القلوب، تنزیلہ ریاض 38
شام کی حویلی میں، رخسانہ نگار عدنان 170

مکمل ناول

شام شہر ملال میں، نوشین فیاض 132
عسر یسرا، حسنہ حسین 82
قصہ ایک جل پری کا، حنا بتول 192

نادلٹ

بھرم، مونا شاہ قریشی 60

افسانے

روزی، شازیہ الطاف ہاشمی 56
دعا تھی کوئی، فرحت جبیں 80
حسن آراء، ماریہ کامران 121
روپ بہروپ، عندلیب زہرا 124
سونا چاندی، حمیرا شفیع 127
پچھتاوا، شازیہ جمال طارق 229

نظمیں و غزلیں

غزل، خمار بارہ بنکوی 234
غزل، صابر ظفر 235
غزل، ابتاف ابرک 234
نظم، حمیرا شفیع 235

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ..... 840/- روپے
ایشیاء، افریقہ، یورپ ..... 18,000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .. 20,500 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

مستقل سلسلے

خط آپ کے — رضیہ جمیل — 30
مسکراہٹیں — ادارہ — 239
باتوں سے خوشبو آئے — شگفتہ جاہ — 236
کھلتا کسی پہ — خالدہ جیلانی — 240
تاریخ کے جھروکے — امت الصبور — 250
آئینہ خانے میں — واصفہ سہیل — 252
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 255
خوبصورت بنئے — ادارہ — 257

دسمبر 2020
جلد 35 شمارہ 04
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ادارہ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [illegible]
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ادارہ

پلیٹ صاف کرنا

حضرت ام عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ حضرت نبیشہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہمارے ہاں تشریف لائے جب کہ ہم ایک پیالے میں کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص پیالے میں کھانا کھائے، پھر اس (پیالے) کو چاٹ لے تو پیالہ اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔'' (ترمذی)

فائدہ:

1۔ مذکورہ روایت سنداً ضعیف ہیں، تاہم پیالے اور پلیٹ وغیرہ کو انگلیوں سے صاف کرنے کا ذکر صحیح مسلم کی روایت میں موجود ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم پلیٹ کو انگلی سے صاف کرلیا کریں۔

2۔ خاص طور پر آج کل کے ماحول میں جس طرح بعض لوگ برتن میں زیادہ کھانا لے لیتے ہیں اور تھوڑا سا کھا کر باقی ضائع کردیتے ہیں۔ یہ انتہائی بری عادت ہے۔ اس سے کھانے کی بے قدری ہوتی ہے۔ اور بلاضرورت ضائع کرنا تبذیر میں شامل ہے جس کے مرتکب کو قرآن نے ''شیطان کا بھائی'' کہا ہے۔ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ کھانا کھاتے وقت پلیٹ میں صرف ضرورت کے مطابق لیا جائے اور اس میں بچایا نہ جائے۔ اور جو پکا ہوا کھانا بچ جائے، وہ پھینکنے کے بجائے ضرورت مندوں، غریبوں اور ہمسایوں میں تقسیم کردیا جائے۔

ثرید کے درمیان سے کھانا منع ہے

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک پیالہ پیش کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس کے کناروں سے کھاؤ۔ اس کی چوٹی چھوڑ دو، اس میں برکت ڈالی جائے گی۔'' (ابوداؤد)

فوائد ومسائل:

1۔ چوٹی سے مراد برتن کے درمیان کا کھانا ہے جو برتن بھرا ہوا ہونے کی صورت میں کناروں کی نسبت کچھ بلند ہوتا ہے۔

2۔ جب ایک برتن میں کھانے والے اپنے اپنے سامنے سے کھائیں تو اس حدیث پر بھی عمل ہو جاتا ہے کیونکہ درمیان کا کھانا کناروں سے کھائے جانے کے بعد کھایا جاتا ہے۔

3۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے سے رزق میں برکت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب کھانا رکھا جائے تو اس کے کنارے سے لو اور اس کا درمیان چھوڑ دو کیونکہ برکت اس کے وسط میں نازل ہوتی ہے۔'' (ابوداؤد)

کھانوں پر ثرید کی فضیلت

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''مردوں میں سے بہت افراد کامل ہوئے لیکن عورتوں میں سے صرف مریم بنت عمران (علیہ السلام) اور فرعون کی بیوی آسیہ (رضی اللہ عنہا) کامل ہوئیں۔ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کو دوسری عورتوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو دوسرے کھانوں پر فضیلت ہے۔'' (مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ایسے ہی ہے، جیسے دوسرے کھانوں پر ثرید کی فضیلت ہوتی ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ انسانوں میں کمال کا سب سے بلند مقام نبوت کا ہے جو عورتوں کو حاصل نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وما ارسلنا من قبلک الا رجالا۔'' (اے نبی! ہم نے آپ سے پہلے صرف مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے ہیں۔'' اس لیے حدیث میں وہ کمال مراد ہے جو صرف وہبی نہیں بلکہ اس میں کسب کا بھی حصہ ہے، یعنی صدیقیت کا مقام۔ گزشتہ امتوں کی عورتوں میں صدیقیت کا اعلیٰ ترین مقام حضرت مریم علیہ السلام اور حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا۔ امت محمدیہ میں یہ مقام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے۔

ثرید، روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے شوربے میں بھگو کر بنایا ہوا ایک قسم کا کھانا ہے۔ اس دور کے ماحول میں یہ بہترین کھانا تھا جو غذائیت کے لحاظ سے بھی بہترین ہے اور لذت کے لحاظ سے بھی، اس کے علاوہ آسانی سے تیار ہو جاتا ہے، جلدی ہضم ہو جاتا ہے اور بہت سے فوائد کا حامل ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر دعا

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موجود کھانا (فارغ ہونے پر) اٹھایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، ایسی تعریف جو بہت زیادہ ہو، پاکیزہ ہو اور اس میں برکت دی گئی ہو، نہ کفایت کیا گیا (کہ مزید کی ضرورت نہ رہے) نہ یہ آخری کھانا ہے، نہ اس سے بے نیازی ہو سکتی ہے، اے ہمارے رب!'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

اس دعا کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ''یہ تعریف کافی نہیں سمجھی گئی (کیونکہ انسان کما حقہ، حمد کر ہی نہیں سکتا) نہ چھوڑی گئی (بلکہ یہ حمد و شکر مسلسل ہے کیونکہ رب کی نعمتیں مسلسل حاصل ہو رہی ہیں) نہ اس تعریف سے بے نیاز ہو سکتی ہے (کیونکہ حاصل نعمتوں کو قائم رکھنے کے لیے اور مزید نعمتوں کے حصول کے لیے بندے کو حمد و شکر کی ضرورت رہتی ہے۔'') کھانے کے آخر میں یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔

گزشتہ گناہ

حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جس شخص نے کھانا کھا کر یہ دعا پڑھی: ''ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے جس نے یہ (کھانا) مجھے کھلایا اور مجھے یہ (کھانا) عطا کیا بغیر میری کسی طاقت کے اور بغیر میری کسی قوت کے۔'' اس کے گزشتہ (تمام) گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ کی نعمت پر اس کا شکر ادا کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔

شکر گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

2۔ رزق کے حصول کے لیے اگرچہ ایک حد تک انسان بھی کوشش اور تدبیر سے کام لیتا ہے، تاہم اس کوشش کو کامیاب کرنا اور تدبیر بھانا بھی اللہ ہی کا فضل ہے اور اسی کی توفیق سے ہے۔

مل کر کھانا کھانے کا بیان

حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کھانا کھاتے ہیں تو سیر نہیں ہوتے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شاید تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟''

انہوں نے کہا: ''جی ہاں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

فوائد و مسائل:

1۔ مل کر کھانا کھایا کرو اور اس پر اللہ کا نام لو، تمہارے لیے اس میں برکت ہو جائے گی۔''

2۔ مل کر کھانا برکت کا باعث ہے، تاہم الگ الگ کھانا بھی جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔''

3۔ بسم اللہ پڑھنا بھی برکت کا باعث ہے۔

مل کر کھانا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مل کر کھاؤ، الگ الگ نہ کھاؤ کیونکہ برکت جماعت (اور اجتماعیت) کے ساتھ ہے۔''

کھانے کی چیز میں پھونک مارنا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پینے کی چیز میں پھونک نہیں مارتے تھے اور برتن میں سانس نہیں لیتے تھے۔'' (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔ ایک شخص نے کہا: اگر برتن میں کوئی ناپسندیدہ چیز (تنکا وغیرہ) نظر آ جائے تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے انڈیل دو۔'' (تھوڑا سا پانی انڈیل دو تاکہ وہ بھی نکل جائے) اس نے کہا: ''میں ایک سانس سے (پیتا ہوں تو) سیر نہیں ہوتا۔'' فرمایا:

''پیالے کو منہ سے ہٹا لیا کرو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ برتن کو منہ سے ہٹا کر سانس لینا چاہیے۔

جب خادم کھانا لائے تو اس کو کھانا دینا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب کسی کے پاس اس کا خادم اس کا کھانا لے کر آئے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ساتھ بٹھائے اور وہ (خادم) اس (مالک) کے ساتھ کھائے۔ اگر ایسے نہیں کر سکتا تو اسے اس میں سے کچھ (کھانا) دے دے۔''

ملازم کو کھانا دینا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب تم میں سے کسی کا خادم اس کا کھانا لائے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ساتھ بٹھائے یا اسے تھوڑا سا کھانا دے دے کیونکہ اس نے اس کی گرمی اور دھواں برداشت کیا ہے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ خادم اور نوکر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرنا چاہیے۔

2۔ اگر کوئی خاص کھانا تیار کیا گیا ہو تو نوکر اور ملازم کو بھی گنجائش کے مطابق دیا جائے تاکہ اس کے دل میں حسرت نہ رہے۔ اس سے اس کے دل میں مالک کی محبت اور عزت و عظمت بڑھے گی، نیز ایسا کرنے سے اس کے دل میں اپنے مالک کا مال وغیرہ چوری کرنے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہوگی۔

3۔ فیکٹری کے مالک کو چاہیے کہ پیداوار میں

سے کچھ نہ کچھ ملازمین کو بھی تحفے کے طور پر دے۔

4۔ملازم کو تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ حسن سلوک کے طور پر دینا چاہیے۔

5۔ملازمین سے کام لیتے وقت ان کے جذبات اور حالات کا لحاظ رکھنا چاہیے، نیز مالک کو ان کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا چاہیے۔

میز اور دسترخوان پر کھانا کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میز پر رکھ کر کھانا نہیں کھایا اور نہ طشتری اور تھالی میں۔ قتادہ رحمتہ اللہ نے کہا: پھر لوگ کس چیز پر رکھ کر کھانا کھاتے تھے؟ انہوں نے فرمایا دسترخوان پر۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔مولانا عبدالغنی رحمتہ اللہ سنن ابن ماجہ کے حاشیہ نجاح الحاجہ میں خوان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس پر رکھ کر کھانا دولت مندوں اور متکبروں کی عادت ہے تاکہ انہیں کھانا کھاتے وقت جھکنے یا سر جھکانے کی ضرورت نہ پڑے۔'' اس لیے اس کا ترجمہ چھوٹی میز یا تپائی وغیرہ کیا جاسکتا ہے۔

2۔سکرجہ چھوٹی پلیٹ یا تھالی اور رکابی وغیرہ کو کہتے ہیں جس میں چٹنی وغیرہ رکھی جاتی ہے۔ یہ لذت پسندی اور عیش پرستی کا مظہر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا سادہ اور زود ہضم ہوتا تھا، اس لیے چٹنی وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

3۔دسترخوان سے مراد وہ کپڑے یا چمڑے کا ٹکڑا ہے جسے بچھا کر اس پر کھانا رکھا جاتا ہے۔ اہل عرب اب بھی میز کرسی استعمال کرنے کے بجائے زمین پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھانے کے عادی ہیں۔

کھانا اٹھائے جانے سے پہلے اٹھنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب دسترخوان (پر کھانا) لگا دیا جائے تو کوئی آدمی (فارغ ہو کر) نہ اٹھے حتی کہ دسترخوان اٹھایا جائے۔ اور اپنا ہاتھ نہ روکے اگرچہ سیر ہو گیا ہو، حتی کہ لوگ فارغ ہو جائیں۔ اور (اگر اسے ضرورت نہ ہو تو چاہیے کہ (اپنا) عذر بیان کر دے) کیونکہ آدمی (ہاتھ روک کر) اپنے ساتھی کو شرمندہ کر دیتا ہے اور وہ بھی (شرم کی وجہ سے) ہاتھ روک لیتا ہے۔ ممکن ہے اسے ابھی کھانے کی (مزید) ضرورت ہو۔''

ہاتھ میں (کھانے کی) چکنائی کی بو ہو تو (بغیر ہاتھ دھوئے) سو جانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اگر کوئی شخص اس حال میں سو گیا کہ اس کے ہاتھ میں چکنائی کی بو تھی اور اس نے ہاتھ نہیں دھویا تھا، پھر اسے کوئی تکلیف پہنچ گئی تو وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔''

فوائد و مسائل:

1۔کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔

2۔گھی والا کھانا یا مٹھائی وغیرہ کھا کر بغیر ہاتھ دھوئے سونا منع ہے۔

3۔اس ممانعت میں یہ حکمت ہے کہ چکنائی کی بو کی وجہ سے چیونٹیاں بستر پر آ سکتی ہیں، ان سے سونے والے کو نقصان یا تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہے۔ بعض اوقات چوہا وغیرہ بھی کاٹ لیتا ہے جو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

4۔روزمرہ معاملات میں ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے جن سے نقصان کا خطرہ ہو۔

بھوک اور جھوٹ

حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا حاضر کیا گیا۔ آپ نے ہمیں کھانے کی پیش کش کی۔ ہم نے کہا۔

''ہمیں خواہش نہیں (بھوک نہیں ہے۔)''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بھوک اور جھوٹ کو

اکٹھا نہ کیا کرو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ کھانا کھاتے وقت موجود افراد کو کھانے کی پیش کش کرنا اچھی عادت ہے۔

2۔ کھانے کی پیش کش کی جائے تو بھوک ہونے پر قبول کرنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیے۔

3۔ بھوک نہ ہو تو ایسی پیش کش قبول نہ کرنے میں حرج نہیں۔ شکریہ ادا کر دینا چاہیے، تاہم بہتر ہے کہ ایک دو لقمے لے لیے جائیں۔

4۔ جھوٹ تکلف کے موقع پر بھی اچھا نہیں۔ معذرت کے لیے کوئی اور مناسب انداز اختیار کر لیا جائے۔

شرف

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جن کا تعلق قبیلہ، بنو عبدالاشہل سے تھا، ان سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر (صبح) کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"آیئے، کھانا کھایئے۔" میں نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ افسوس! کاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں سے کچھ کھا لیتا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس روایت کے راوی وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے بلکہ یہ ایک اور صحابی ہیں، اس لیے راوی نے وضاحت کر دی کہ ان کا تعلق بنو عبدالاشہل کے قبیلے سے ہے۔

2۔ روزے دار کو اگر کھانے کی دعوت دی جائے تو نفلی روزہ چھوڑ کر دعوت قبول کر لینا بہتر ہے، تاہم روزہ مکمل کرنا بھی جائز ہے۔

جہنم میں پہنچانے والا عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے سے (لڑنے کے لیے) ملتے ہیں تو قاتل اور مقتول (دونوں فریق) جہنم میں جائیں گے۔" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قاتل ہے (اس لیے مجرم ہے) مقتول (کے جہنمی ہونے) کی کیا وجہ ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ جب کوئی شخص جرم کی پوری کوشش کرے لیکن کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے تو اللہ کے ہاں وہ بھی مجرم ہے۔

2۔ جو شخص ارتکاب جرم کا عزم رکھتا ہو لیکن ارتکاب سے پہلے رجوع کر لے تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور توبہ کی وجہ سے ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

دونوں جہنمی

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب دو مسلمانوں میں سے ایک اپنے بھائی پر ہتھیار اٹھاتا ہے تو وہ دونوں جہنم کے کنارے پر ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے ایک اپنے ساتھی کو قتل کر دیتا ہے تو دونوں جہنم میں داخل ہو جاتے ہیں۔"

فوائد و مسائل:

1۔ جہنم کے کنارے پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس غلطی کی وجہ سے ان دونوں کے جہنمی ہونے کا خطرہ ہوتا ہے لیکن ان کے لیے جہنم سے بچنے کا موقع باقی ہوتا ہے کہ لڑائی سے باز آ جائیں۔

2۔ مومن کا قتل جہنم میں پہنچانے والا عمل ہے، البتہ توبہ یا قصاص سے یہ گناہ معاف ہو سکتا ہے۔

خیمہ

مصنف:۔ میرال طحاوی
ترجمہ:۔ اجمل کمال
تبصرہ:۔ آمنہ زریں

کہانی اور زندگی میں محض ہجے مختلف ہیں۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں انسان کو درپیش رہتے ہیں۔ گزر جاتی اور پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے ثبت کیے ہوئے نشانوں کی نشانیاں۔ اور پھر ان سے بنتی ہیں۔ کہانیاں۔

کسی نے کہا تھا کہ آسمان پر موجود ستارے۔ زمین پر موجود انسانوں کے برابر ہیں۔ تو..... پھر ایسا ہے کہ کہانی بھی ایک کائنات ہے۔ کہکشاں ہے۔ ستاروں سے بھرا آسمان ہے یا پھر بھید بھری زمین۔ جستجو کرنے والوں پر۔ ان کی چاہ اور ظرف کے مطابق آشکار ہوتی ہے۔

تو..... کہانی ایک دلچسپ کردار ہے۔ جو روپ سروپ بدل بدل کر۔ پڑھنے والوں کے عالی حصے کو ہفت رنگ کیے رکھتی ہے۔ اور اس ہفت رنگی میں رنگے جانا۔ ایک ایسا دروں بیں تجربہ ہے۔ جو اس ہنڈولے میں بیٹھے۔ وہی جانے!

تو..... کہانی کی محبت میں مبتلا۔ سوال کا ایک کنکر اچھالتا ہے کہ جو کہانی سے محبت کرتے ہیں۔ کیا وہ مسجد، مندر، دھرتی، دل کا قتل کر سکتے ہیں؟

کہانی سے محبت کا مزاج رکھنے والے دہشت اور وحشت پھیلا سکتے ہیں؟

تو..... کہانی کو معمولی سمجھنے کے رجحان نے کس چیز کو فروغ دیا بھلا؟

تو..... کیا دنیا صرف ہائی وے سے دکھائی دینے والی شے ہے؟

اس ہائی وے سے اُتر کر کیا اترائی میں کوئی بستی آباد نہیں؟ کیا دنیا صرف پہاڑوں کی ہیبت اور خوش نمائی جیسی ہے؟ اس پر چڑھنے اور اترنے کی مشقت پر نگاہ نہیں جا سکتی؟

گزارنے کی قید۔ گزرنے کی مشقت سے نسبت رکھتی ہے اور پھر جو گزرے۔ وہ گزرنے والا ہی جانتا ہے بس۔

ازل سے ابد تک چلتی ہوئی اس دنیا کے روزمرہ معمولات۔ ہر نظر کے لیے اتنے عام نہیں ہوتے۔ جتنے کہ عام طور پر فرض کیے جاتے ہیں۔ خاکی دنیا کے عناصر کی خوب صورتی کچھ دلوں پر اس طرح منعکس ہوتی ہے کہ اس کی ست رنگی لفظ بن کر اپنے پڑھنے والے کو سحر زدہ کرنے کا ہنر آزماتی ہے۔

اور مٹھی بھر خاک کے کمالات سے انکار مشکل ہی نہیں۔ ناممکن بھی ہے۔

تو چلتے ہیں۔ مصر کی میرال طحاوی کے ''خیمے'' کی جانب۔ جہاں آپ کی ملاقات فاطمہ سے ہونے والی ہے۔ فاطمہ جو کہانی کی روح رواں ہے۔ اور خود اس کی روح ایک ایسے جہاں کا سفر کرنے کی عادی ہے۔ جو دوسروں کی بصارت اور بصیرت کی پہنچ سے باہر ہے۔ اور دراصل تو ہم سب کے اندر ہی ایک ایسا جہاں موجود ہوتا ہے۔

کہانی کے بیان پر ماحول اور محل وقوع کے رنگوں کا جادو سر چڑھ کر بولے تو ہمیں نئی سرزمین دریافت کرنے جیسی مسرت ہوتی ہے۔ خطہ عرب کا ہو اور داستان گوئی چھب نہ دکھائے۔ سرزمین مصر کی ہو۔ اور فرعونوں کا ذکر نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ناول کا تانا بانا کہانی کے اندر کہانیوں سے بُنا

گیا ہے۔ صحرا کے اسرار اور فرعون کی رہ چکی سرزمین پر ابھی تک اس کے اثرات کا اثر موجود ہے۔

سنیے۔ فاطمہ بچپن میں سونے سے پہلے اپنی آپا سے کون سی کہانی سن رہی ہے۔

''وہ میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے مجھے ایک کہانی سنانے لگی۔'' سورج آسمان میں پورا چکر لگا کے ایک دائرہ بن جاتا ہے۔ سورج ایک لڑکی ہے، اور ساری لڑکیوں کی طرح اس کے سات چہرے ہیں۔ اور پھر ایک لمبی رات آتی ہے جس میں وہ اپنا آخری چہرہ، بوڑھی عورت کا جھریوں والا چہرہ چھپا لیتا ہے اور رونے اور بین کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ دوڑ کر غیاب کے پہاڑوں کے پیچھے چلا جاتا ہے، جو لوہے اور آگ کے پہاڑ ہیں۔ ہمارے اور ان دو پہاڑوں کے درمیان دو بند ہیں اور کھولتے ہوئے لوہے کا ایک کنواں جس میں سورج گر جاتا ہے۔''

''کون؟ کون ہے وہ اماں سردوب؟''

''فرعون ہے اور ممنم اور یاجوج کے غلام ہیں۔''

شغف جب تک دیدنی معاملات سے ہو۔ تب تک دنیا خیریت سے رہتی ہے۔ نادیدہ عناصر سے شغف، جنون، دیوانگی اور آسیب قرار پاتے ہیں۔ لیکن قرار پانے سے پہلے کے مرحلوں کی کھوج کون لگا سکا ہے؟

تو چلیے۔ جدید زمانے کے ہائی وے سے اتر کر۔ ایک ایسی صحرائی بستی میں۔ جہاں معاش کا دارومدار کھیتی باڑی اور تاج وتخت کا دارومدار بیٹوں کی پیدائش پر ہے۔

ایک ایسا گھرانہ۔ جہاں تضادات کا تصادم صحرائی بگولے کی طرح زندگیوں کو لپیٹتا چلا جا رہا ہے۔

دادی جا کمہ۔ جو اسم بامسمّٰی کی صورت گری کرتی نظر آتی ہے۔ اس تصادم کا نکتہ بالا خیز ہے۔

بوڑھی حکمران اور سخت گیر نگران۔ کرخت زبان اور سخت رویے کی یکجائی سے دادی حاکمہ کی حاکمیت۔ کسی کی مختصر سی کائنات کو گرہن زدہ سورج کی طرح اندھیر کیے ہوئے ہے۔

''میں اسے دور سے دیکھتی رہتی۔ وہ مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ اپنی چھڑی سے، جسے وہ اپنی گھوڑی کو قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ وہ ہر چیز کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی۔ میری بہنوں کی کپڑوں کی الماریاں، توشہ خانوں میں رکھی درازوں والی الماریاں، مکھن اور پنیر کے مرتبان، سامان کے کھوکھے اور مرغیوں کے دڑبے۔ وہ بطخوں کے سیے ہوئے انڈے گنتی، ان ننھے کبوتروں کو شمار کرتی جن کے پر پھوٹنے لگے تھے، غلے کی تمام بوریوں کو کھول کھول کر دیکھتی کہ کہیں ان میں کیڑے تو نہیں پہنچ گئے، یا عورتوں نے ان میں ہاتھ تو نہیں ڈالا۔ صافیہ گھبرائی ہوئی اس کے آگے آگے بھاگتی اور اس کے حکم سنا کرتی۔''

طبقاتی تقسیم۔ اس زمین کے کسی خطے کو بھی اپنی جلوہ آرائی سے محروم نہیں رکھتی۔ وہ نیم تاریک گوشہ ارض ہو۔ یا چمک دار نیلے آسمان تلے ہرا بھرا پھر۔ خاک اور ریت اڑاتا۔ دنیا کی نظروں سے اوجھل رہنے والا۔ مسافر کو دہشت زدہ کرنے والا۔ صحرائی خطہ۔

''بکری کے بالوں سے بنا خیمہ اونٹ کی پیٹھ سے گرا کر زمین پر ڈال دیا گیا اور اسے نصب کرنے کے لیے کیلیں ٹھونکی جانے لگیں۔ منٹوں میں خیمہ ہوا میں بلند ہو کر خوب لمبا چوڑا ہو جائے گا اور پھاٹک کے سامنے کی خالی جگہ بھر جائے گی۔ اس کے سارے گوشے مہمانوں سے بھر جائیں گے۔ غلام ادھر سے ادھر چکر لگانے لگیں گے اور رنگ اڑے جلابیوں اور سپاٹ پیروں والے بہت سارے دہقان آ آ کر جمع ہو جائیں گے۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ابا کے پاس جائیں گے اور سر جھکا کر

انہیں تعظیم دیں گے۔ پھر وہ ان کی انگلیوں کے سروں کو چھوئیں گے اور التجا بھری اطاعت سے ان انگلیوں کو بار بار چومیں گے۔ اور وہ، ان کی گردن تنی ہوئی ہوگی، جیسے انھیں ان سب کے وجود کا احساس ہی نہ ہو۔ جب یہ سب ہنگامہ تھم جائے گا تو وہ مکان میں داخل ہوں گے اور غلام ان کے پیچھے پیچھے سامان اٹھائے چلتے ہوں گے۔''

نامحسوس طریقے سے ہم یہ جان جاتے ہیں کہ فاطمہ ایک خوش حال اور بااثر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن یہ خوش حالی اور اثر و رسوخ۔۔ کیا واقعی خوشی، مسرت اور کامیابی کے حقیقی پیمانے ہیں؟

یہ کہانی ہی کا وصف ہے کہ.....

ہم جو اشتراکیت کو انسان کے اعلیٰ اوصاف کی پرکھ کے لیے، بنیاد خیال کرتے ہیں۔ دور دراز میں بسنے والے۔ زندگی کو جھیلتے کرداروں کے کرب و بلا میں خود کو شریک محسوس کرنے کے تجربے سے گزرتے ہیں۔

چار بہنوں میں سب سے چھوٹی، فاطمہ کو نیند نہیں آتی تھی۔ اور جن آنکھوں میں نیند نہ اترے۔ وہاں زندہ خیال مجسم ہونے لگتے ہیں۔ بے قراری، جس روح میں بسیرا کرتی ہے۔ اپنے مسکن کی تلاش میں اسے یا تو لوگوں سے الگ کر دیتی ہے۔ یا پھر ممتاز۔

محض پانچ سالہ فاطمہ کو کھیلنے کے لیے ہمجولی اور میدان چاہیے تھے۔ یہ میسر نہیں تھا تو پھر تصور کی پنہائیاں تھیں یا اونچے پیڑ۔ جہاں وہ اترتی اور چڑھتی رہتی تھی۔ تصور کی ان پنہائیوں نے ایسے کردار تراشے کہ کہانی کا تانا حقیقت اور بانا فسانہ بنتا گیا۔

چھم سے اترنے والے خیال کی طرح۔ خود آپ کو پتا نہیں چلتا کہ کب کون سی حقیقت جلوہ گر ہو رہی ہے۔

زود حس، تیز نگاہ اور متحرک تخیل کے عناصر فاطمہ کی ہیئت تراکیبی میں شامل تھے۔ کہانی در کہانی۔ ایک سلسلہ ہے۔ جو بادی النظر میں بکھرے ہوئے تخیل کا روزن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انجام تک پہنچتے پہنچتے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اصل صورتحال کے بالکل متوازی ایک ایسی کہانی چل رہی تھی۔۔ جس کے استعارے، تشبیہات اور کردار، تخیل کے آسمان پر اڑتی پتنگیں تھیں جن کی ڈور فاطمہ کے ہاتھ میں تھی۔

ریت انتہا تک پھیلی ہوئی تھی اور جوان سورج کے رنگ سے چمک رہی تھی۔ اور ان کے چہرے آسمان اور زمین پر انڈیلے ہوئے سنہری رنگ کو پیتے جا رہے تھے۔ وہ دوڑ کر بچھوؤں کو ان کے بلوں میں سے پکڑ کر اٹھا لاتیں۔ پھر وہ ان کی دم کو چل دیتیں اور زہر بہہ بہہ کر ریت پر پھیل جاتا۔ وہ چھپکلیوں کا پیچھا کرتے ہوئے قہقہے لگاتیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کو ایک گڑھے میں چمک دار رنگ والا سانپ دکھائی دیا۔ اس نے سانپ کے منہ کو زور سے ریت پر رگڑا، پھر سوئی دھاگا نکال کر اس کا منہ سی دیا اور اسے ریت پر تڑپنے کے لیے ڈال دیا۔

کہانی میں گندھی ہر کہانی۔ فاطمہ کے تخیل پر اڑتی پتنگ تھی۔ اس صورت حال سے پڑھنے والے کی واپسی فاطمہ کے ساتھ ہی ممکن ہوتی ہے۔ جب وہ بتاتی ہے کہ.....'' تب بڑھیا کے چیخنے چلانے کی آواز میرے خواب آلود سر میں داخل ہوئی۔'' فاطمہ، بدبخت لڑکی! کیا کر رہی تھی تو شیطان کی بچی، کنویں کی تہہ میں سونے گئی تھی؟ اپاہج تو تھی ہی، اب آسیب زدہ بھی ہوگئی۔''

پیڑوں پر چڑھ کر باہر دیکھنے کی خواہش کے پورا کرنے میں فاطمہ کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

''میں نے ہاتھ بڑھا کر دوسری شاخ کو پکڑنا چاہا لیکن وہ میرے ہاتھ نہ آئی۔ زمین نے میرے سر کے گرد ایک چکر سا لگایا۔ جب مجھے ہوش آیا تو سر دوب میری سوجی ہوئی ٹانگ پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ انگلیاں تیل میں بھگو کر مالش کرتی رہی اور چاروں طرف سے کوسنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ مرد کے بغیر گھر ایسا ہے جیسے کنویں کے بغیر نخلستان۔ ملعون کہیں کی، کمبخت۔

کسی دن گردن ٹوٹے اور سر سینے پر آپڑے تو اچھا ہو۔ اللہ مجھے حوصلہ دے کہ اپنے بیٹے کی پیدا کی ہوئی ان بلاؤں سے نمٹ سکوں۔

فاطمہ کا درخت سے گرنا، ایک بار نہیں۔ کئی بار ہوا۔ اور ٹوٹی ہوئی ٹانگ۔ مرحلہ وار بگڑتے بگڑتے اپنے آخری انجام تک پہنچ گئی۔

اونچی دیواروں کے پار دیکھنے کی خواہش نے اسے عمر بھر کے لیے اپنی ٹانگ سے محرومی عطا کی۔

مگر کیا یہ خواہش تھی؟ جو پہلے سراب اور پھر آسیب بنی؟

کیا ایسا نہیں تھا کہ وہاں صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولت تو کجا، اس کا تصور بھی موجود نہیں تھا۔

کہانی کے آئینے میں ان کہی کو منعکس کرنا۔ واللہ۔ لکھنے والوں کا معاملہ ضبط و اظہار دنیا سے نرالا ہوتا ہے۔ اپنے ماحول، اردگرد میں جاری معمولات سے اختلاف رکھنا، ناانصافیوں پر نگاہ رکھنا اور کوتاہیوں پر آواز بلند کرنا، دشوار ترین انسانی ردعمل ہے۔ اس راہ میں تنقید کے پتھر کھانے، دشمنی کے در کھلنے کے باوجود ڈٹ جانے کی استقامت سب کے بس کی بات نہیں۔

خیر.....

دادی صرف سخت گیر اور کرخت نہیں تھی۔ بلکہ اسے بیٹیوں کی پیدائش سے نفرت بھی لاحق تھی۔ عورت ہو کر بیٹی کی پیدائش پر ماتم کناں ہونا۔ عورت ذات کا عجیب و غریب پہلو ہے۔ گو کہ دیگر سماجی معاملات میں بھی عورت ہی عورت سے متصادم پائی جاتی ہے۔ مگر خود اپنی حاکمانہ زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی، اپنے جیسی مخلوق سے بے زاری کا اظہار قدرے تعجب انگیز ہے۔

کھلتی ہے ایک اور کھڑکی جو فاطمہ کی زندگی کے صحن میں کھلتی ہے۔ اور پڑھنے والا تو معمول بنا، مسحور ہوا۔ ہر کھڑکی سے جھلک دکھلاتے۔ صحرائی وجود دیکھتا چلا جاتا ہے۔

''یہ عورت جب سے اس گھر میں آئی ہے۔ اس نے مصیبتوں کے سوا کچھ بھی نہیں دیا۔ جب بھی اللہ اسے بیٹا دیتا ہے، وہ جاتا رہتا ہے، اور اس کا دماغ بھی چل گیا ہے۔ جب اسے دورے پڑتے ہیں تو اس کی صورت دیکھ کر مجھے اپنی روح کے لیے خوف محسوس ہوتا ہے۔ یہ نحوست کی نشانی ہے۔''

جی..... یہ فاطمہ کی اماں کا ذکر ہے جو دادی حاکمہ کی زبانی ہو رہا ہے۔

کہانی۔ کہی ہی تو جاتی ہے۔ مگر ایک ان کہی۔ ہر کہانی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے اور یہی اس کہانی کہنے والے کا نکتہ کمال ہوتا ہے۔ جو قاری کے ذہن رسا کے مطابق خود کو منکشف کرتا ہے۔ اور انکشاف کا وہ لمحہ ہی۔ حاصل کا لطف رکھتا ہے۔ اور ان منزلوں سے گزرنا ہی تو پڑھنے والوں کو محبوب ہوتا ہے۔

فاطمہ کی اماں کو درپیش مسائل، اس ان کہی کی ایک مثال ہے۔ وہ جسمانی صحت ہے، ذہنی یا روحانی۔ ان کو بہرحال علاج کے قابل سمجھنے کا امکان تک نظر نہیں آتا۔

فاطمہ اور ابا کی محبت، ان کھردرے لمحوں اور لہجوں کے بیچ نخلستانی چشمے کی طرح ہے۔

''کیسی ہو تم، ابا کی ہرنی؟''

ابا نے کہا۔ ''یہ فاطمہ کی گھوڑی ہے۔ ابا کی پیاری فاطمہ کی۔ میں اسے نہیں بیچ سکتا۔ آپ کوئی اور گھوڑا چن لیں۔''

دادی سے وصول کی گئی ہر تلخی کا نعم البدل ابا کی بے پناہ شفقت تھی۔ اس سارے منظرنامے میں، وہ کم گو، دھیمی طبیعت اور سنجیدہ رہنے والے شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ البتہ دادی کی حاکمیت کے سامنے وہ بھی خم کھائے رہے۔

جب ابا اندر آئے تب بھی وہ تمبا کو کو ہتھیلی میں مسلتی رہی اور اپنی چھوٹی، سکڑی آنکھوں میں چالاکی کی چمک لیے ان کے سفر اور چراگاہوں کا حال

پوچھتی رہی۔ وہ اس کے سامنے ادب سے بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں نے کبھی ان کے سینے کو فخر سے تنا ہوا اور ان کے گزرتے وقت لوگوں کو دبک کر ادھر ادھر ہوتے دیکھا ہی نہ ہو۔

دادی حاکمہ کی حاکمیت کہانی کے ماحول پر چھائی ہوئی تاریکی ہے۔ منفی ہی سہی۔ کردار دلچسپی سے خالی نہیں۔

''اللہ ان کے شر سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ میری جتنی بیٹیاں ہوئیں سب جاتی رہیں۔ لوگ مجھ سے پوچھتے تھے، حاکمہ تیری بیٹیاں کہاں چلی جاتی ہیں؟ اور میں جواب دیتی تھی: میں دن رات دعائیں کرتی ہوں۔ اس لیے اللہ مجھے شر سے بچائے رکھتا ہے۔''

انسان اپنے فعل کی تاویل تو گھڑتا ہی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ اللہ کے فعل کی توجیہہ بھی خود پیش کرنے کی جسارت رکھتا ہے۔ واللہ۔

کتاب کا حجم مختصر سہی۔ مگر موضوع کی وسعت صحرائی ہے۔ زبان کا آہنگ بلند اور ادبی شان لیے ہوئے ہے۔ بات کہنے کا ڈھنگ ہی تو زبان کے وصف کا اظہار ہے اور وہ نہایت پر اثر ہے۔

پڑھیے کچھ خوب صورت جملے:۔

''سات راتیں گزر گئیں، چاند کی پتلی سی قاش بڑھ کر کٹا ہوا نصف دائرہ بن گئی۔''

''سورج کی آنکھ پھوٹ کر سرخ ہوگئی اور آخر گرد و غبار نے اسے بجھا دیا۔''

''کاش آسمان صاف ہوتا۔ جب کوئی پرندہ رخصت ہوتا ہے تو پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ وہ خط بھی نہیں بھیجتا۔ رخصت ہونے کے بعد پرندہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔''

''وہ مسکرائے اور ان کی مسکراہٹ کا عکس میرے چہرے پر رنج اور افسردگی کی صورت میں پڑا۔

پہاڑ اونچے ہیں۔ آسمان اونچا ہے، ستارہ اونچا ہے اور چھوٹی سی چڑیا کے پاس دو پنکھ ہیں۔''

اس کہانی کی ان کہی ایک نہیں ہے۔ بلکہ منزل بہ منزل ہر باب ایک نئی کہانی کے ساتھ جڑی ہوئی ان کہی کا کھیل جاری رہتا ہے۔ پڑھنے والا، خود کو حیرت کے سپرد کر کے، صحرا کی ریت سے نگینے وصول کر سکتا ہے۔

بدو روایات کے مطابق، فاطمہ کی بہنوں کی شادی طے ہونے سے لے کر لباس اور زیورات کی تیاری، بارات کی آمد اور رخصتی دادی حاکمہ کے زیر انتظام منعقد ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں بہنوں کو بیاہ کر لے جانے والے آپس میں باپ اور بیٹا تھے۔

زندگی کا قید خانہ۔ پنجرے بدل بدل کر آزادی کے فریب میں مبتلا رکھتا ہے۔ قید رہتے ہوئے بھی رہائی کے سراب نظر آتے ہیں اور پنجرے بدل بدل کر فرار کے شوق پورے کیے جاتے ہیں۔

فاطمہ اپنی ٹانگ کے علاج کے سلسلے میں ایک غیر ملکی خاتون کے گھر مقیم رہی۔ ''این'' کو دراصل فاطمہ کی پالتو گھوڑی ''خیرہ'' میں نہایت دلچسپی تھی۔ اسی دلچسپی نے اسے فاطمہ کے قریب ہونے کا موقع دیا۔ اور وہ خیرہ اور فاطمہ دونوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔

این، فاطمہ کی کہانیاں بھی شوق اور دلچسپی سے سنتی تھی۔ یہاں فاطمہ کی داستان گوئی عروج پر پہنچی۔ لیکن یہ قصے محض سماعتوں کی تواضع کے لیے نہیں تھے۔ یہ فاطمہ کی ذات سے جڑے خواب، خواہش اور خوف کی داستان تھی۔

چاہے گئے خواب، کچلی ہوئی خواہشیں اور پیش آنے والا خوف۔

کتاب کے کل بارہ ابواب ہیں۔ اور ہر باب ایک نئی دستک سے کھلتا ہے۔

میری پیاری چڑیا، ایسی جگہ کیوں اترتی ہو۔ جہاں شکاری نہیں دیکھ لیتا ہے؟ (باب نمبر چھ)

کل رات ایک خواب نے مجھ سے کہا۔

عمدہ چیزیں ان کو پہنچتی ہیں جو صبر سے انتظار کرتے ہیں (باب نمبر سات)۔

"یاس اور امید کے درمیاں۔

کیوں، میری جان، تم نے کیوں مجھے چھوڑ دیا؟" (باب نمبر گیارہ)

کہانی بالکل زندگی کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی سے ہی تو تشکیل پاتی ہے۔ سو، منزل تمام ہونے پر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے وہ باتیں جو سرسری نگاہ سے گزر جاتی ہیں۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو بین اشارے تھے کہ انجام کیسا ہوگا؟

لیکن..... انجام اگر پہلے سے معلوم ہونے لگیں..... تو بساط کائنات کی ہر بازی۔ ایک ہی انجام سے دوچار ہو..... تو پھر؟

یک رنگی۔ کائنات کو کہاں زیبا ہے؟

اس کی ست رنگی ہی تو اس کا جال ہے۔ مضبوطی سے بنا ہوا۔

اماں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور دادی نے بیٹے پیدا کرنے کے لیے ابا کی دوسری شادی کروائی۔ فاطمہ نے سوتیلی ماں کی بے اعتنائی بھی سہہ لی۔ اور دوا بہ کے حربے اس کو بیٹوں کی ماں نہ بنا سکے۔ اور وہ فاطمہ کو آسیب زدہ قرار دے کر گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

دادی نے بھی رخت سفر باندھا۔

فاطمہ بالآخر اپنی ماں کی طرح ہو گئی۔ لاچار، افسردہ اور ہر وقت آنسو بہانے والی۔ اور صافیہ دادی کی طرح منتظم اور نگران بن گئی۔ ابا بوڑھے ہو گئے۔

دو چھوٹی لڑکیاں اب بڑی ہو گئی تھیں۔ اپنے ہاتھوں میں کاپیاں سنبھالے وہ گدھے پر بیٹھ گئیں اور محافظ انہیں اسکول لے گیا جو بہت دور، پہاڑیوں کے دوسری طرف واقع تھا۔ راحات سوچتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ انہیں جاتا دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ "ذرا سوچو، فاطمہ، اگر تمہاری دادی یہ دیکھ لیتی تو کیا ہوتا۔ وہ دروازے کو ان لڑکیوں کے خون سے رنگ دیتی۔ وقت کی ہوا ہر شے کو اڑا لے جاتی ہے۔"

راحات، ابا کی تیسری بیوی تھی۔۔ اور دو بیٹیاں فاطمہ کی سوتیلی بہنیں تھیں۔ اسکول جانے کا ذکر اور منظر۔ خود بخود کڑیاں جوڑنے لگتا ہے۔

اور یہ تاریکی کے آخری سرے پر روشنی کی واحد علامت نظر آتی ہے۔

تحریر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ ادیب اور مترجم میں سے زیادہ کس کا احسان مند ہوا جائے؟

دوسری زبان تک فہم کی رسائی ایک دلچسپ عمل ہے۔ لیکن اس زبان کے ادب تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

عالمی ادب سے عمدہ انتخاب اور تراجم کا بیڑہ جناب اجمل کمال نے نہایت دل بستگی سے اٹھا رکھا ہے، جس کے لیے ہر پڑھنے والا ان کا ممنون و احسان مند رہے گا۔

سڑکوں پر پلے کارڈ اٹھانے اور نعرے لگانے جیسا مہذب احتجاج ہو، یا با اختیار گروہ سے متصادم ہونے والا پرتشدد احتجاج۔ عوامی مظاہرہ کہلاتا ہے۔

ادیب کا احتجاج اس ضمن میں بھی اپنی ندرت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور تحریر دبی ہوئی چیخ کی طرح لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور کتنے ہی قلوب و اذہان پر اپنا اثر چھوڑنے کی تاثیر رکھتی ہے۔۔ حتی کہ سرحدیں عبور کر کے دور دیس بھی پہنچ جاتی ہے۔

میرال طحاوی کا "خیمہ" بھی اسی قسم کا اظہار ہے۔ جو بظاہر حالات و واقعات اور حادثات کا تسلسل اور بیانیہ ہے۔ مگر درحقیقت، زندگی کو درپیش مسائل اور لاحق خطرات کی جانب بین اشارہ ہے۔

ہر بدیسی کتاب اپنے آپ میں ایک طلسماتی کشش رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے ہم ان دیکھے زمانوں، کرداروں اور ان کی مخصوص عادات، رسم و رواج، تمدن اور مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اور آگاہی تو خود ایک منتر ہے۔

ان دیکھی جگہوں کا سفر ممکن ہے؟

اور کتاب اس کا اثبات ہے۔

☆

ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات

شاہین رشید

بندھن کے لیے اس بار ہمارا انتخاب سرائیکی زبان میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی خاتون نسیم اختر صاحبہ ہیں۔ جو آج کل بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر فرائض انجام دے رہی ہیں۔

''کیا حال ہیں آپ کے؟''

''جی الحمدللہ..... کرم ہے میرے رب کا۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟''

''میں 5 جولائی 1974 میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئی۔ میں نے ابتدائی تعلیم اپنے محلے کے اسکول ایم سی پرائمری اسکول نمبر 9 سے حاصل کی یہ گرلز اسکول تھا۔ پھر میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 2 سے حاصل کی۔ میٹرک بورڈ میں میری پانچویں پوزیشن تھی جس کی وجہ سے مجھے میرٹ کی بنیاد پر اسکالرشپ دی گئی۔

بی اے تک تعلیم گورنمنٹ ڈگری کالج فار وومین سے حاصل کی۔ میں نہ صرف تعلیم میں بہت اچھی تھی بلکہ کھیلوں میں بھی تعلیم کی طرح مسلسل کامیابیاں حاصل کیں۔ میں ''والی بال'' کی بہترین کھلاڑی تھی۔ اور میں نے چار سال آل پاکستان انٹر کالجیٹ والی بال میچز کھیلے..... لیکن بی اے کے بعد یہ سلسلہ ختم کر دیا کیونکہ میں انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنا چاہتی تھی۔

اور یہ بات ہے 1995ء کی ..... اور ایک ایوننگ کالج میں بطور وائس پرنسپل جاب بھی کر لی اور اس جاب سے قبل کہکشاں کالج میں شام کی شفٹ میں بطور لیکچرر بھی کام کیا۔ اور یہ سب کچھ میٹرک کی پانچویں پوزیشن کے بعد ہوا..... جاب کی آفرز ہر وقت میرے ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر تیسرا ہے۔

میرے والد صاحب نے تین شادیاں کیں، بڑی اماں سے صرف ایک بھائی صاحب تھے جو کہ 2011 میں اللہ کو پیارے ہو گئے جبکہ ہماری بڑی اماں 1988 میں انتقال فرما گئیں۔ ان کی وفات کے بعد بڑے بھائی ہمارے ساتھ ہی رہے۔ دوسری والدہ پٹھان قبیلے سے تھیں۔ ان سے دو بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ دونوں بھائی وفات پا چکے ہیں اور والدہ بھی۔ ہماری والدہ کا نمبر تیسرا تھا اور ہم دو بہنیں اور چار بھائی ہیں اور ہماری اماں اور والد دونوں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔''

''شادی کب ہوئی اور ماشاء اللہ بچے کتنے ہیں؟''

''میری شادی 2003ء 22 اکتوبر کو ہوئی اور میرے ماشاءاللہ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی میں نے گود لی ہوئی ہے۔ بیٹی کا نام ایمن جاوید ہے۔ جبکہ محمد سجل جاوید، محمد شہباز جاوید اور محمد شاہ جہاں جاوید

بیٹے ہیں۔ میاں صاحب یعنی میرے مجازی خدا کا نام محمد جاوید اقبال ہے اور آرمی سے ریٹائرڈ کرنل ہیں۔"

"آپ نے کہا کہ "بیٹی گود لی ہے"، وجہ؟"

"وجہ یہ ہے کہ ایمن میرے دیور کی بیٹی ہے۔ میرے میاں صاحب کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے بھائی کی بیٹی کو گود لے لیا۔ اور جب ان کی علیحدگی ہوئی تو بیٹی میرے خاوند کے پاس ہی رہ گئی۔ اور جب میری شادی ہوئی تو میں نے اسے اپنی بیٹی بنالیا۔ میرے ہاں بھی اتفاق سے پہلی بیٹی ہوئی مگر وہ چند دن کے بعد ہی فوت ہوگئی چنانچہ گود لی ہوئی بیٹی زیادہ پیاری لگنے لگی۔"

"آپ کی جاوید اقبال صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ آپ کی لو میرج تھی یا ارینج اور عمروں کا کتنا فرق ہے۔

"ہماری اور ان کی عمر میں تقریباً ۵ سال کا فرق ہے پہلی ملاقات کا احوال بتانے سے پہلے میں آپ کو یہ بتادوں کہ ان سے پہلی جان پہچان بھابھی کی وجہ سے ہوئی۔ یہ مانیٹرنگ ہیڈ تھے۔ ڈیرہ غازی خان اور راجن پور کے جبکہ بھابھی کامرس کالج کی پرنسپل تھیں۔ بس ان سے رابطے کی وجہ سے رابطہ ہوا ورنہ یہ معلوم نہ تھا کہ شادی ہوجائے گی۔

اب پہلی ملاقات کا احوال بھی سن لیں۔ پہلی ملاقات میرے لیے تو نہیں مگر ان کے لیے کافی دلچسپ رہی۔ مجھے ایک آفس میں کام تھا۔ ان کی بھی مدد درکار تھی۔ یہ بھی وہیں آگئے۔ سرسری تعارف ہوا۔ کام سے فارغ ہوکر انہوں نے جاتے ہوئے کہا کہ آپ کی گاڑی جب تک آئے گی۔ آپ کو دیر ہوجائے گی میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کردیتا ہوں۔ میں مان گئی اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر آرام سے بیٹھ گئی اور گھر کا راستہ بتایا۔

مجھے ڈراپ کرنے کے بعد وہ ایسے گولی کی طرح گئے کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ گئے کہاں ہیں..... کچھ عرصے کے بعد پتا چلا کہ انہیں یہ بات بری لگی کہ میں نے انہیں ڈرائیور کی جگہ دی۔ اور خود پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے یہ بات اپنے دوستوں کو بتائی اور دوستوں نے بھی ان کا بہت مذاق بنایا۔

"پھر رشتے کے لیے بات کیسے آگے بڑھی؟"

"مجھے ان کی والدہ صاحبہ نے پسند کیا تھا۔ فوراً منگنی اور پھر نکاح ہوگیا اور پھر کچھ ہی عرصے کے بعد رخصتی ہوگئی تھی۔ نکاح کے بعد یہ بہت ریزرو ہوگئے تھے۔ میرے ساتھ کافی سیریس گفتگو کیا کرتے تھے۔ اس لیے میں بھی محتاط رہتی تھی۔ شروع شروع میں بہت زیادہ کیئرنگ بھی نہیں تھے لیکن بعد میں کیئرنگ ہوگئے۔"

"سرائیکی ایک میٹھی زبان ہے۔ شادی میں جو رسم ورواج ہیں، ان کے بارے میں بتائیں؟"

"میرا تعلق بلوچ فیملی سے ہے جبکہ میری والدہ سرائیکی بولتی تھیں ہمارے گھر میں سرائیکی زبان بولی جاتی تھی البتہ بابا جان بلوچی اور سرائیکی بولا کرتے تھے..... رسم ورواج یہ تو پوری ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ مگر مختصراً یہ کہ اب اس دور میں شادی کے رسم ورواج طبقاتی تقسیم پر منحصر ہیں مطلب یہ کہ مختلف طبقوں میں رسم ورواج مختلف ہوتے ہیں۔ البتہ منگنی، منڈھی، مہندھی، جگراتہ، رخصتی، بارات اور پھر میل یہ سرائیکی ہیبت میں مخصوص ہے۔ البتہ جب ادی کی تاریخ رکھی جاتی ہے تو اسے مخصوص نام "وگنڈھیں" کہا جاتا ہے دلہن کو "چنری" پہنائی جاتی ہے اور مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔ تاریخ عموماً چاند کی تاریخ کے مطابق رکھی جاتی ہے۔

"شادی کے بعد شہر بدر ہوئیں؟ گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟"

"میرا گھر ڈیرہ غازی خان میں تھا جبکہ سسرال فیصل آباد، نوان لاہور میں تھا۔ اور خاوند کی پوسٹنگ ملتان میں تھی۔ ولیمے کے بعد ہم ملتان آگئے۔ دونوں صورتوں میں ہی شہر بدر ہوئی۔ شروع شروع میں

مختاری کی طرف قدم بڑھنے لگتے ہیں۔ اسلام بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔''

''اب لمحہ لمحہ زندگی اور وقت بدل رہا ہے آپ یہ بتائیں کہ 2003 کے مقابلے میں 2020 میں رسم ورواج میں کوئی فرق آیا؟ اور شادی کی تیاری کہاں سے کی یا خود ہی کی؟ تیار کہاں سے ہوئی تھیں؟''

''ان سترہ سالوں میں یقیناً بہت تبدیلی آئی ہے اس وقت ایک مڈل کلاس فیملی جتنے میں پوری شادی کا زیور بنا لیتی تھی آج اس رقم میں صرف ایک تولہ سونا آتا ہے۔ کپڑوں کے برانڈز دو چار ہی ہوتے تھے۔ جبکہ آج کل مقابلہ ہے، امیر غریب اس طرف دیکھتا ہے اور اس کو اسٹیٹس سمبل سمجھا جاتا ہے۔ کسی نامی گرامی بیوٹی پارلر سے سجنا شان کا حصہ ہے۔ اگر چہ یہ ساری چیزیں اس وقت بھی تھیں مگر مجبوری نہیں تھیں آج ان سب چیزوں کو مجبوری بنا دیا گیا ہے۔ مجھے میری بھابھی نے تیار کیا تھا۔ ولیمے کے دن کوئی تیار کرنے والا نہیں تھا تو فون پر بھابھی سے پوچھ پوچھ کر خود ہی تیار ہوئی تھی.....

سسرال میں دو تین بار جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا پھر مہینے میں ایک دفعہ جاتے تھے.....

''میرے والدین کے گھر اور سسرال کے ماحول میں بہت فرق تھا۔ ماحول، کلچر، زبان کا، تعلیم کا اور بھی بہت کچھ۔ لیکن میں نے بہت جلد خود کو ان کے ماحول میں ڈھال لیا۔ نہ کبھی شکایت کی اور نہ ہی شکایت ہونے دی۔ اور پھر جب بچے ہو گئے تو لگا کہ جیسے میری ذمہ داریاں۔ اور زیادہ بڑھ گئی ہیں۔''

فیملی جوائنٹ سسٹم یا انفرادی سسٹم؟

''دونوں سسٹم کے اپنے مزے ہیں۔ جب ہم چھوٹے ہوتے ہیں تو جوائنٹ فیملی میں پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ہم بڑے ہو گئے جبکہ انفرادی سسٹم میں ایک ایک دن محنت کرنا پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جوائنٹ سسٹم میں بچوں میں خود اعتمادی بہت زیادہ آتی ہے۔ آپ خود بھی ان کا حصہ بن کر بہت کچھ کر سکتے ہیں یا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف ایک دو لوگوں پر سارا معاشی بوجھ آجاتا ہے تو ایسی صورت میں پھر خود

شادی کا سوٹ اپنی مرضی سے خریدا تھا۔ مگر بہت مہنگا نہیں بلکہ جب ''بری'' کے کپڑے بننے لگے تو مجھ سے پوچھا گیا کہ کس طرح کے ہوں تو میں نے یہی کہا تھا کہ جو عام روٹین میں پہنے جاسکیں۔ اس طرح کے نہ ہوں جو صندوق میں بند ہوجائیں اور فیشن ہی ختم ہوجائے۔''

''آج کل دکھاوا بہت ہوگیا ہے، کیا خیال ہے آپ کا؟''

''آج کل سوشل میڈیا کا دور ہے۔ کپڑے، اسٹائل، شادی بیاہ اور اس کے رسم ورواج آج میڈیا کے مرہون منت ہیں جن پر اخراجات اور وقت دونوں کا ضیاع ہوتا ہے۔''

''کہا جاتا ہے کہ لڑکی شادی کے دو چار سال کمپرومائز کے ساتھ گزار لے تو پھر اسے لگتا ہے کہ اب یہ گھر میرا ہے؟''

''جی بالکل ایسا ہی ہے..... نئے ماحول میں نئے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ میں اتنا ٹائم تو لگ ہی جاتا ہے۔ اصل میں تو یہ وقت اس ماحول میں عادی ہونے کا ہے۔ ورنہ تو دونوں ہی اپنے اپنے دائروں میں ہی گھوم رہے ہوتے ہیں۔''

''میاں صاحب کے مزاج کے بارے میں بتائیں کہ گرم ہیں۔ نرم ہیں اور کس بات پر غصہ آتا ہے؟''

''فوجی مزاج کے آدمی ہیں۔ مگر خوب بذلہ سنج بھی ہیں۔ برداشت ان میں بہت ہے مگر صرف میری حد تک، کسی اور کی بات برداشت نہیں کرتے۔ بہت جلدی غصے میں آجاتے ہیں۔ کہیں باہر ہوں تو ''عملی صورتحال'' بھی سامنے آسکتی ہے۔''

''کبھی احساس ہوا کہ شادی نہیں ہونی چاہیے تھی، کہاں پھنس گئے ہم؟''

''بالکل ایسا ہوا تھا اور بہت شدت کے ساتھ ہوا تھا۔ شروع شروع میں جب گھر پر اکیلی ہوتی تھی اور میاں صاحب اپنے کام کاج میں دور دراز تو بہت احساس ہوتا تھا کہ یہ کیا قید بامشقت مل گئی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے والدین کے گھر بھاگ جاؤں..... اور ایک بار ایسا کیا بھی تھا۔ بیٹی کو لے کر اکیلی ڈیرہ غازی خان والدین کے گھر چلی گئی تھی۔ سارے دیکھ کر بے حد پریشان ہوگئے تھے اور سب نے مجھ سے سوال کرکے پریشان کردیا تھا اور یوں یہ منصوبہ بھی ساری زندگی کے لیے ناکام ہوگیا تھا۔ واپسی پر جاوید صاحب کو بتایا تو پھر ہم دونوں کا ہی ہنس ہنس کر برا حال ہوا۔''

''ایک روایتی بیوی کی طرح اپنے میاں کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی ہیں۔ کپڑے استری کرنا، کھانا پکانا، آتے ہی پانی اور گرم گرم چائے دینا وغیرہ۔''

''میں سسرال جاکر زیادہ روایتی بیگم بن جاتی تھی کیونکہ ان کے یہاں مردوں کو ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھا جاتا ہے۔ باقی ہمارے گھر میں سہولیات موجود تھیں۔ کپڑے دھل جاتے تھے اور استری بھی ہوجاتے تھے۔ البتہ جب کوئی نہیں ہوتا تھا تو خود سارے کام کرتی تھی۔ باقی شروع شروع میں کھانا ''میس'' کا بھی کھایا۔ کلب کا بھی کھایا، مگر مجھے ہمیشہ سے ہی کچھ نہ کچھ پکانے کی عادت تھی تو میں پکایا کرتی تھی۔ اس لیے پھر وہ یعنی میاں صاحب کھانا گھر کا ہی کھاتے تھے۔ کئی بار کک بھی رکھے۔ مگر انہیں کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند نہیں آیا۔ لہٰذا کھانا خود ہی پکایا اور اب تو میری بیٹی ایمن بھی بہت اچھا کھانا پکا لیتی ہے۔''

''شادی کے بعد نام کی تبدیلی کیوں ضروری ہے؟''

''شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ باپ کے نام کے بجائے شوہر کے نام کا اضافہ کردینا بالکل بھی ضروری نہیں۔ نہ ہی اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی ہمیں اسلام میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے یہ تو آپ کا ''حسب نسب'' ہے جو ہمیشہ وہی رہے گا جو ہے۔ آپ کا شوہر صرف آپ کا شوہر، آپ کے بچوں کے

ساتھ ان کا نام آنا چاہیے۔''

''وقت کے ساتھ ساتھ محبت میں اضافہ ہوتا ہے؟ کمی ہوتی ہے؟ یا کمپرومائز ہوتا ہے؟''

''شادی کے بعد کا سفر اتنا لمبا ہوتا ہے کہ کبھی محبت اور کبھی کمپرومائز کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔ اگر صرف محبت کہیں تو جھوٹ ہوگا۔ اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے کمپرومائز ایک ایسی شہ لاٹھی ہے جس کو تھامے زندگی کٹ جاتی ہے۔ مگر تھکاوٹ ضرور ہوتی ہے بلکہ بہت ہوتی ہے۔''

''میاں صاحب خوش خوراک ہیں۔ نخرے دکھاتے ہیں یا جو مل گیا کھا لیتے ہیں؟''

''اچھی اور صحت مند اور انٹرجنک خوراک کھانا پسند کرتے ہیں، کھانے سے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کرتے۔ کھانا اچھا لگے تو پیٹ بھر کر کھا لیتے ہیں اچھا نہ لگے تو کم کھاتے ہیں۔ یا بغیر وجہ بتائے کچھ نہیں کھاتے..... میٹھا انہیں بہت پسند ہے۔ اس لیے اس کی اکثر فرمائش کرتے ہیں۔''

''گھومنے پھرنے کے شوقین ہیں؟''

''بہت شوقین مگر بچوں کی پڑھائی کی وجہ سے کمپرومائز کرتے ہیں۔ سال میں ایک بار عموماً گرمیوں کی چھٹیوں میں اسلام آباد، مری، یا پھر شمالی علاقہ جات کی طرف گھومنے پھرنے ضرور جاتے ہیں۔''

''آپ اپنے سسرال والوں پر اپنی پڑھائی کا کتنا رعب ڈالتی ہیں اور آپ کے خیال میں بیوی کو کمانا چاہیے۔ یا سب سے اچھا عہدہ یا جاب ہاؤس وائف کی ہے؟''

''نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میری چھوٹی دیورانی انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں پھر جاوید صاحب کے دو ماموں اور ممانیاں HES میں پڑھاتی ہیں ان کے کئی کزن ڈاکٹر ہیں۔ میرے سسرال میں کافی لوگ پڑھے لکھے ہیں..... اور شادی کے بعد کمانے کا انحصار آپ کے حالات پر ہے۔ اگر ضرورت محسوس کرتی ہیں تو ضرور کریں تاکہ معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے۔ اور اگر ضرورت نہیں تو ہاؤس وائف ہونا بھی اپنے لحاظ سے ایک مکمل ڈیوٹی ہے۔''

''بچوں کی تربیت میں زیادہ کس کا ہاتھ ہے۔ گھر کو کتنا ٹائم دیتے ہیں۔ آپ دونوں اور بچے آپ کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں؟''

''بچوں کی تربیت میں ماں باپ دونوں کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ جہاں تک پڑھنے پڑھانے کی بات ہے تو میں ان کی طرف زیادہ توجہ دیتی ہوں۔ لین دین کے معاملے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اسکول لے جانے اور لانے میں کسی پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ یہ فریضہ وہ خود ہی انجام دیتے ہیں..... اور کیا سوچتے ہیں بچے تو بچوں کا تو یہ حال ہے کہ اگر میرے ساتھ غرض ہو تو میرے دوست بن جاتے ہیں اور اگر اپنے بابا جان سے مطلب ہو تو ان کے گن گانے لگتے ہیں۔ بس یہی کہوں گی کہ

''بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے۔''

دستک دستک دستک

شاہین رشید

قیصر نقوی

قیصر نقوی گیارہ سال سے بیڈ پر ہیں۔

قیصر نقوی کا نام ہم جیسے سینئرز کے لیے نیا نہیں لیکن نوجوان نسل کو بتانا چاہتی ہوں کہ ''قیصر نقوی'' کا شمار بہترین فنکاراؤں میں ہوتا تھا (اللہ انہیں لمبی عمر دے آمین) ہر دوسرے تیسرے ڈرامے میں ان کا ہونا لازمی ہوتا تھا کیونکہ انہیں سب بہت پسند کرتے تھے۔ بے شمار ڈراموں میں ''ماں'' کے رول کیے۔ یوں سمجھیں کہ ان کے بغیر ڈرامے ادھورے لگتے تھے۔ پی ٹی وی کے ٹاپ کلاس ڈراموں میں انہوں نے کام کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی سال پی ٹی وی کے ڈراموں کو دیے۔ مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ جب ان پر برا وقت آیا اور یہ بیمار ہوئیں تو بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اس بیماری میں صرف ان کی بیٹیاں کام آئیں۔ بیٹے سے اللہ نے نوازا نہیں۔ بیٹیاں ہی بیٹے بنیں۔ گزشتہ دنوں ہماری ان سے دستک کے لیے گفتگو ہوئی۔

''السلام علیکم..... کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''

''وعلیکم السلام..... اللہ کا شکر ہے۔''

''زندگی اور دن رات کیسے گزر رہے ہیں؟''

''اللہ کا احسان ہے، زندگی اچھی گزر رہی ہے لیکن میں اپنی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہوں کیونکہ میں چل نہیں سکتی اور پورا دن لیٹے لیٹے بور ہو جاتی ہوں اور شدید ڈپریشن کا شکار ہو گئی ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، نماز پڑھنا یا پھر ٹی وی دیکھ لینا، بس میری تو اب یہی زندگی ہے اور اسی میں پورا دن گزر جاتا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے (آمین) کتنا عرصہ ہو گیا ٹی وی کو خیر باد کہے ہوئے؟ اور کس بیماری نے آگھیرا آپ کو؟''

''میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ٹی وی سے کیا تھا یعنی پی ٹی وی سے'' پھر جب پرائیویٹ پروڈکشنز کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر دوسرے آرٹسٹوں کی طرح کبھی پی ٹی وی کے ڈراموں میں تو کبھی پرائیویٹ پروڈکشن کے ڈراموں میں کام کرنے لگی۔ اس طرح زندگی گزر رہی تھی۔ سب کچھ اچھا چل رہا تھا اور یوں سمجھیں کہ زندگی کافی مصروف گزر رہی تھی۔ مگر کہتے ہیں نا کہ سدا دن ایک جیسے نہیں رہتے۔ سدا وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔

میرے بھی برے دن شروع ہونے والے تھے۔ ایک دن اچانک شوٹنگ کے دوران میں گر گئی اور یوں سمجھو کہ بیماری کا آغاز ہو گیا۔ آہستہ آہستہ مجھے چلنے میں تکلیف ہونے لگی اور آہستہ آہستہ میں مکمل طور پر بستر پر ہی آ گئی۔ اور اب میں بالکل نہیں چل سکتی۔ ایک ہیلپر مجھے ہر وقت چاہیے ہوتا ہے جو مجھے واش روم لے جائے اور مجھے کھانا کھلائے۔''

''ٹی وی ڈراموں سے دور رہ کر آپ کیسا محسوس کرتی ہیں؟ کیونکہ ٹی وی ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔''

''جو انسان پوری زندگی کام کرتا رہا ہو۔ وہ ایک دم سے فارغ ہو جائے تو سوچو کہ اس پر کیا بیت رہی ہو گی یا کیا بیتی ہو گی۔۔۔ کام چھوڑنے کے بعد میں بھی بہت زیادہ تنہائی کا شکار ہو گئی ہوں۔ کیونکہ اب میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے..... میں ہر وقت لیٹی رہتی ہوں یا بیٹھی رہتی ہوں اور اپنی پرانی یادوں کو یاد کرتی رہتی ہوں۔ اپنے پرانے ساتھیوں کو

یاد کرتی رہتی ہوں۔ بہت اداس اور بہت پریشان رہتی ہوں۔ میں نے میڈیا میں بہت اچھا وقت گزارا ہے۔''

''یعنی چڑھتے سورج کی پوجا تو سب ہی کرتے ہیں، مگر جب دور ہوئے تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات ہوگئی، ایسا ہی ہے؟''

''جی بالکل ایسا ہی ہوا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ یہی دنیا کی ریت ہے۔''

''کس نے ساتھ دیا؟ کس نے ساتھ چھوڑا؟''

''دنیا میں اچھے برے دونوں طرح کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ میں نے ان کے ساتھ کافی عرصہ کام کیا ہے اور اس دنیا میں کچھ اچھے لوگ بھی ہیں جو مجھے اکثر فون کرتے ہیں۔ میری طبیعت کا پوچھتے ہیں میری خیر خیریت معلوم کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے وہ مجھے پوچھتے بھی ہیں اور میری عزت بھی کرتے ہیں۔''

''ایک دم سے فارغ ہونے کے بعد ڈپریشن کا شکار تو ہوئی ہوں گی؟''

''جی..... میں بہت زیادہ مصروف رہتی تھی اور بہت زیادہ کام کرنے کی عادت تھی اور پورا دن میرا مصروف گزرتا تھا صبح جاتی تھی اور رات کو آتی تھی تو جب کام سے فراغت ہوئی تو طبیعت بہت بوجھل ہوئی۔ بہت ڈپریشن بھی ہوا۔ پھر حالات سے سمجھوتا کیا کہ ایسا نہ کرتی تو مزید پریشانیاں بڑھ جاتیں..... لیکن کچھ بھی کہہ لو..... مجھے پرانا وقت بہت یاد آتا ہے پرانے لوگ بہت یاد آتے ہیں بس اب تو یادیں ہی رہ گئی ہیں۔''

''صاحب فراش ہوئیں تو مالی طور پر کس نے ساتھ دیا؟''

''صرف اور صرف میرے بچوں نے بلکہ میری بچیوں نے کیونکہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ کیونکہ جب انسان مشکل میں ہوتا ہے تو ساتھ تو کوئی بھی نہیں دیتا نہ اپنے اور نہ ہی پرائے اور میرا ساتھ بھی کسی نے نہیں دیا۔ میں تقریباً بارہ تیرا سال سے مسلسل بستر پر ہوں تو

میری بیٹیاں ہی میرا خیال کرتی ہیں۔ اللہ انہیں اس خدمت کا اجر دے گا۔

''ان شاء اللہ۔ جب پریشانی آئی، آپ بیمار ہوئیں تو بیٹیاں شادی شدہ تھیں یا کسی کی ذمہ داری باقی تھی؟''

''جی..... جب پریشانی آئی اور میں بستر سے لگ گئی تو میری چاروں بیٹیاں شادی شدہ تھیں اور مجھ پر مزید کسی کی ذمہ داری نہیں تھی۔ الحمدللہ..... تو اللہ کا شکر ہے کہ گزر بسر میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اور جب میری بیٹیاں چھوٹی تھیں تو میرے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا تو اس کے بعد سے تو میں خود ہی کما رہی تھی۔''

''آپ کی بیٹیاں شوبز میں نہیں ہیں، کیوں؟''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ شوبز فل ٹائم جاب ہے اور صبح سے رات ہوجاتی ہے اور پھر میری بچیوں کا شوبز کی طرف رجحان بھی نہیں تھا۔ چنانچہ جیسے جیسے ان کے لیے اچھے رشتے آتے گئے۔ میں نے ان کی شادیاں کردیں۔ اور ماشاء اللہ چاروں بچیاں اپنے اپنے گھر میں خوش ہیں۔ اور اچھی خوش و خرم زندگی

گزار رہی ہیں۔

''آج کل کے نئے رائٹرز اور نئے فنکاروں کے بارے میں کچھ کہیں گی؟''

''میں تو گھر سے نکلتی نہیں لہٰذا جو نئے رائٹرز ہیں اور جو نئے فنکار ہیں ان سے تو ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ لوگ تو مجھ سے ملنے نہیں آتے۔ پتا نہیں، انہیں میرے بارے میں معلوم بھی ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ انہیں تھوڑا بہت میرے بارے میں ضرور علم ہوگا کیونکہ ان کے بڑوں نے تو مجھے دیکھا ہوا ہے۔ اس افراتفری کے دور میں کوئی اپنوں کو ہی پوچھ لے تو بڑی بات ہے۔''

''سارے دن کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں آپ کی؟''

''میں تو بہت مصروف زندگی گزارنے کی عادی تھی اور مصروفیت ایک دم ختم ہوجائے تو گھبراہٹ تو بہت ہوتی ہے مگر میں نے اپنے اللہ سے لو لگالی ہے پورا دن لیٹی رہتی ہوں، نماز پڑھ لیتی ہوں۔ تسبیحات پڑھ لیتی ہوں۔ اپنا پرانا وقت یاد کرلیتی ہوں یا ٹی وی دیکھ لیتی ہوں بس ایسے ہی زندگی کے دن گزر رہے ہیں۔''

''حکومت وقت سے کچھ کہنا چاہیں گی؟''

''کیا کہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ کیونکہ ہماری حکومتیں فنکاروں کی کبھی بھی قدر نہیں کرتیں کوئی ایسا ادارہ ہی نہیں ہے کہ جہاں صاحب فراش فنکاروں کی دادرسی کے لیے کچھ کیا جائے۔ اور موجودہ حکومت ہی بے حس ہوتی ہے۔ صرف میری ہی مثال کیا۔ میں تو بہت اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔ کتنے ہی فنکار ایسے گزر گئے ہیں، جن کو کوئی حکومت کا بندہ پوچھتا تک نہیں تھا..... بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ملک میں فنکاروں کی کوئی قدر نہیں ہے۔''

''قیصر نقوی صاحبہ اب تو میڈیکل بہت ایڈوانس ہوگئی ہے۔ علاج سے سب کچھ اچھا ہوجاتا ہے۔ کیا علاج میں کوتاہی ہوئی آپ سے؟''

''اس کا جواب میں دیتی ہوں آپ کو، قیصر نقوی صاحبہ کی بیٹی ''زہرہ'' نے کہا۔ ''آپ سوچ سکتی ہیں کہ ہم نے اپنی امی کا علاج نہیں کروایا ہوگا۔ بہت علاج کروایا، جس نے جہاں جہاں کہا ہم گئے۔ کسی نے کہا کہ نواب شاہ میں عرق النسا کا بہت اچھا علاج ہوتا ہے۔ (امی کے لیے کہا گیا کہ انہیں عرق النساء کی بیماری ہے) وہاں گئے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میری چھوٹی بہن امریکا میں رہتی ہے ہم نے امی کو امریکا بھی بھیجا۔ مگر کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا کیونکہ وہاں کے ڈاکٹر نے یہ بھی کہا کہ ان میں ول پاور (Will Power) کی کمی ہے۔ جب تک یہ خود ہمت نہیں کریں گی ان کا ٹھیک ہونا مشکل ہے۔ امی نے دراصل ذہن میں بٹھا لیا ہے کہ میں اب چل نہیں سکوں گی۔ ان کی ہمت بندھانے کے لیے ہم نے

سانحہ ارتحال

ابن حسن پریس والے محمد حسن تقوی صاحب اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے

انا اللہ وانا الیہ راجعون

محمد حسن صاحب بہت خوش اخلاق مرنجان مرنج انسان تھے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے ان کی دیرینہ وابستگی تھی۔ ان کی وفات ایک بڑا نقصان ہے ہم ان کے اہل خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں سے درگزر فرما کر انہیں اپنی رحمتوں سے نوازے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

اکر دیا۔ اسٹک دی۔ مگر نہیں۔ بس بیڈ ہے اور یہ ہیں۔ اور انہیں پارکنسن کی بیماری بھی ہوگئی ہے۔''

''ہر وقت بیڈ پر رہنے سے تو ''بیڈ سول'' بھی ہو جاتا ہے؟''

''جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ان کی ٹانگیں بالکل سوکھ گئی ہیں۔ بڑی مشکل سے ان کو واش روم تک لے جاتے ہیں، بیڈ پر ہی بٹھا کر انہیں کھانا کھلاتے ہیں۔ کیونکہ مجھے خود بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں انہیں بیڈ سول نہ ہو جائے۔ امی کو ایکسرسائز کرانے اور دیگر ان کی ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے دو میڈز رکھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ مجھ پر پورے گھر کا لوڈ ہے۔ یہ تو شکر ہے کہ میں خود ڈرائیو کر لیتی ہوں۔ بچوں کو سنبھالنا، میاں صاحب کا خیال رکھنا، گھر کی دیکھ بھال کرنا۔ بس اللہ ہمت دیے رکھے۔''

''آپ کی ایک بہن امریکا میں دو یہاں کراچی میں ایک دوسرے کا سہارا تو ہوگا کہ امی کبھی آپ کے پاس تو کبھی دوسری بیٹیوں کے پاس؟''

''امریکا والی بہن تو بہت کہتی ہے کہ امی کو میرے پاس بھیج دو۔ مگر امی سفر کے قابل نہیں ہیں۔ اور میں اگر بھیج بھی دوں تو پریشان ہی رہوں گی اور جہاں تک دوسری بہنوں کی بات ہے تو امی کافی بزرگ بھی ہوگئی ہیں اور کمزور بھی۔ میں نہیں چاہتی کہ ادھر سے ادھر ہونے میں ان کو کوئی نقصان ہو۔ کوئی پرابلم ہو، اس لیے میں انہیں کہیں نہیں جانے دیتی۔ گیارہ سال ہوگئے ہیں امی کو بیڈ پر آئے ہوئے۔ بس اللہ ان کو صحت والی زندگی دے۔''

''(آمین) آپ کے میاں صاحب تو نہیں گھبراتے کہ ''ماں'' کی خدمت میں لگی رہتی ہیں؟''

''ارے نہیں، میرے میاں صاحب بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ مجھے اکثر کہتے رہتے ہیں کہ ''ماں'' کی خدمت میں کوتاہی نہیں کرنا۔ ہمیشہ ان کی دعائیں لیتی رہنا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے دعائیں دینے والی میری ماں موجود ہے۔''

''بڑی بات ہے۔ اللہ آپ کو اس خدمت کا صلہ دے۔ (آمین)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

اس کے بعد موسٹ فیورٹ ''وہ نازنین'' کی بات کرتے ہیں۔ واہ واہ..... کیا زبردست اینڈ کیا ہے۔ اس کی ہر قسط دل کو موہ لینے والی تھی مگر جو مزا اس آخری قسط نے دیا، کسی نے بھی نہ دیا۔ ہر بری روایت کو ختم کر دیا گیا۔

ویسے فرح جی! آپ نے زمرد کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ نیلم پر بے حد دکھ ہوا۔ آہ یہ خاموش محبتیں۔ ذکی نے جتنا برا کیا تھا، اتنا برا اس کے ساتھ ہوا نہیں۔

تنزیلہ ریاض کو پہلی بار پڑھوں گی، مگر آپیوں نے یہ نام دیکھ کر جس خوشی کا اظہار کیا، اس اظہار نے بتا دیا کہ یہ کچھ خاص ہیں۔ پڑھا نہیں۔ تبصرہ ادھار رہا۔

''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' کچھ بھی واضح نہیں بتایا گیا۔ پیاری آپی! یہ سلسلہ اسی لیے ہے کہ آپ اپنے دکھ سکھ کہہ سکیں مگر آپ نے ''طویل نہ ہو جائے'' کہہ کر ہر بات پس پشت ڈال دی۔ جوابات میں کسی دکھ کا ذکر نہیں، ساس بھی اتنی اچھی..... پھر بھی زندگی دکھوں میں گزری؟ یہ سارا صدقہ یقیناً اتنی ساری نندوں کا ہی ہوگا۔

''خط آپ کے'' ہر کسی کا خط پسند آیا۔ ثمینہ اکرم ویلکم بیک۔ کوثر خالد کا خط پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں جو بات تھی، وہی بات آگے جواب میں کہہ دی گئی۔ ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے'' اسی حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے تمام گاؤں اور خاندان کے لوگ مجھے عزت بھی دیتے ہیں اور میرے اس کام سے بے حد خوش بھی ہیں۔

☆ پیاری زینب! آپ کی آپی نے بہت اچھا کہ وہ اس بار جلدی آ گئیں اور اپنے ساتھ خواتین ا شعاع بھی لائیں اور آپ نے صرف دو دن میں شعا پڑھا اور ہمیں اتنا اچھا خط لکھا۔ ہماری طرف سے اپنی آ کا شکریہ ادا کر دیں۔

''شہر تمنا'' میں نائلہ کو سزا تو مل گئی، جیتے جی مرا۔ دوبارہ زندگی تو اسے اپنے نیک باپ کی دعاؤں ملی ہے۔ والدین کی دعاؤں سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں بڑی سے بڑی مصیبت ٹل جاتی ہے، بہت بدنصیب ہوتے ہیں جو والدین کی خدمت کر کے ان کی دعا نہیں لیتے ہیں۔

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

پہلا خط جہانیاں سے زینب نور کا ہے، لکھتی ہیں ''شہر تمنا'' کی آخری قسط تھی، زبردست۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پہ گئی۔ نائلہ نے جو قدم اٹھایا تھا، اس کے لیے کچھ سزا تو بنتی ہے مگر خیر..... تائب کے بعد کیسی سزا؟ ماریہ اور شاہ میر کا کردار سپرہٹ لگا۔ ماریہ درحقیقت ''انوکھی'' نہیں ''بے خبر'' ہے۔ جھمکا جان پر پہلی دفعہ مگر بے حد ترس آیا۔ نعیمہ ناز! آپ کا بے حد شکریہ۔ ہمارے شعاع کو اپنی ایک خوب صورت تحریر کا تحفہ دینے کے لیے۔ ''شام کی حویلی'' رخسانہ جی! کشف آخر ہے کس کی اولاد..... باخدا اب تو بتا دیں۔ اور اس کہانی کا سب سے بڑا واقعہ..... ردا کی موت..... بہت رلایا اس حادثے نے۔ بلال نے ایمان کو ''ہاں'' کر دی۔ حق بنتا ہے کہ اپنی مرضی کا فیصلہ کرے مگر پھر بھی اس ''ہاں'' نے نہ جانے کیوں، مگر دکھ پہنچایا ہے۔

بلال کی ''ہاں'' نے آپ کو دکھ پہنچایا مگر کیوں؟ کشف کا تو موحد کے ساتھ نکاح ہوگیا ہے۔ پھر کشف اسے پسند بھی نہیں کرتی تو اب بلال کو بھی تو شادی کرنا ہی تھی۔

بلاشبہ قرآن سیکھنے اور سکھانے والے بہترین لوگ ہیں اور آپ بہت اچھا کام کررہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے، آمین۔

ڈاکٹر فریال خان ڈی جی خان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

اچھا ایک بات تو بتائیں، کسی کا خط آپ کو اچھا لگ رہا ہو یا کوئی تحریر اچھی لگ رہی ہو۔ کیا آپ ایسے نہیں کرتیں کہ اس بے چاری کو ایک دو فون کردیں۔ میں آپ کی کال کا انتظار کروں؟ میرا دل چاہتا ہے آپ سے بہت ساری اور خوب میٹھی میٹھی باتیں کروں کیونکہ میں بولتی زیادہ ہوں۔ ابو کہتے ہیں جہاں میرا یہ بچہ ہو، وہاں اداسی ختم، ہاہاہا۔ بڑے بھائی کہیں گے، فری بہت مکھن لگاتی ہو۔ میں کہتی ہوں۔ بھائی آج کل مکھن بھی کوئی کوئی لگاتا ہے ورنہ زیادہ لوگ تو چونا لگاتے ہیں چونا، ہاہاہا۔ اب آجائیں رسالے کی طرف۔ سب سے پہلے ''شہر تمنا'' نعیمہ ناز کے لیے کھڑے ہوکے تالیاں۔ یہ لیں کھڑے ہوکے۔ آپ کے لیے ایک عدد گلاب کی کلی کا گلدستہ نہیں پورا باغ۔ بہت اچھا لکھا اور بہت مزا آیا پڑھ کے۔ صحیح کہا ناں میں نے۔ تنزیلہ ریاض بہت اچھا لکھنے والی ہیں لیکن پڑھا نہیں ابھی۔ ''شام کی حویلی'' اب لگ رہا ہے، صبح کی حویلی میں تبدیلی ہونے والی ہے۔ خوش رہیں رخسانہ جی۔ صدف ریحان نے ''عناد'' بہت اچھا لکھا۔ مزاح سے پُر۔ کیا کہنے زبردست۔ فرح بخاری نے چھلانگ لگوائی۔ ''وہ نازنین'' کی طرف۔ سارے رشتے سمجھ میں آگئے، سب بہترین ہوگیا۔ ہائے رے، وہی بات کہ پیٹ بھی نہیں بھرا اور روٹی ختم، ہاہاہا۔ ''قوام'' بہت اچھا لکھا لیکن میمونہ جی ارسلان کو بالکل غائب کردیا۔ ہاں یاد آیا جن لوگوں نے یاد کیا، ان کا بہت شکریہ۔ ایک فرمائش کروں راحت فتح علی خان کا انٹرویو پلیز۔ کوئی کام جو میرے لائق ہو تو بتائیں، آپ کو پتا ہے یہ روایت ہے ہماری اس طرح آخری جملہ بولنا۔

☆ پیاری فریال! ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ آپ کے لائق خدمت بتائیں آپ نے روایت کہہ کر بات ہی ختم کردی۔

اتنی ساری ہی ہی ہی..... ہاہاہا..... آپ کے ابا صحیح کہتے ہیں جہاں آپ ہوں، وہاں اداسی کا کیا کام۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسی طرح ہنستا بولتا رکھے۔

خط اچھا لگے تو ہم فون ضرور کرتے ہیں، بشرطیکہ خط لکھنے والی نے فون نمبر لکھا ہو۔ کوثر خالد، ثمینہ اکرم سے ایک دوبار بات کی بھی ہے۔

''وہ نازنین'' کے لیے روٹی ختم ہونے اور پیٹ نہ بھرنے والی بات درست نہیں۔ ساری بری روایتیں ختم ہوگئیں۔ حق داروں کو ان کا حق مل گیا۔ اب کہانی کو بلاوجہ طول دینا مناسب نہیں تو!

اقراء الیاس نے لاہور سے لکھا ہے

ٹائٹل پر ماڈل پہناوے سمیت خوب صورت لگی۔ اس بار قلم اٹھا کر متحرک کرنے والا ناول ''شہر تمنا'' ٹھہرا۔ ناول کی آخری قسط دیکھ کر کافی دیر بے یقین رہی۔ اکتوبر کا شمارہ پھر سے کھولا تو ناول کے پچھلی قسط کے اختتام پر آخری قسط کی نشان دہی تک نہ تھی۔

قسط ناول کے اینڈ کے مطابق ہی لگی۔ شاہ میر نے اپنی چونکا دینے والی شخصیت کے مطابق فیصلہ لیا۔ طلال چوہدری کا انجام حسب معمول اور مانی اور عائشہ کا اینڈ بھی حیرت انگیز لگا۔ ''نور القلوب'' تنزیلہ ریاض کا نام شعاع میں اتنے عرصے بعد دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پوری دلچسپی سے پہلی قسط کو پڑھنا شروع کیا تو آخر تک دلچسپی برقرار رہی۔ صندل بی کے پاس آنے والی لڑکی لاریب ہی تھی۔ گلے اور خوشحال خان کی جملہ بازی، اس کے تو کیا ہی کہنے۔ ''عہد الست'' کے بعد تنزیلہ ریاض کا ناول پڑھنے کو ملا۔ نور محمد کا کردار آج تک نہیں بھولا۔ امید ہے ان کا یہ ناول بھی ایسا ہی تاثر قائم رکھے گا۔ ایک بات تو رہ ہی جاتی ''عکس ادب'' میری نظر میں یہ کام آپ نے بڑا تسلی بخش کیا ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے گا۔ ''جب تجھ سے ناتا جوڑا'' مجھے سمجھ میں نہیں آیا بہن ف۔ ج کے ساتھ ناروا سلوک کس نے کیا۔ ساس کی یہ تعریف کرچکی ہیں پھر آٹھ

نندیں ہی کافی ہوں گی۔ انہیں کھل کر سارے واقعات کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ ''قوام'' سارے رشتوں میں بے حسی دیکھ کر نزہت کا ایسا کرنا ہی بنتا تھا۔ آخر میں میرا بھی بس سانس اٹک گیا۔ ''خط آپ کے'' پرانی قارئین بہنوں کو محفل میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس بار دلچسپ سے بھی زیادہ جو دلچسپ تھے وہ سب افسانے تھے۔ ''واپسی'' عندلیب زہرا آپ نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا۔ اتنی کڑی آزمائش کے بعد واپسی پر جب ارسل جیسا نہ ملے تو ان کے لیے کیا صلہ ہے۔ جن کے لیے کوئی چور راستے کا خواب بھی بھیانک ہو ان کے لیے کیا؟ ''شکایت'' شازیہ جمال مجھے یاد آیا کہ آج سے نو یا دس سال پہلے جب میں نے سب سے پہلا ناول پڑھا تو ان رائٹر کے نام کے آگے بھی جمال ہی آتا ہے، شاید یہی ہو۔ ان کا ناول پڑھا۔ یہ افسانہ بھی بہت اچھا سبق آموز تھا۔

☆ پیاری اقراء! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ ہماری ان قارئین میں سے ہیں، جو باقاعدگی سے شعاع پڑھتی ہیں اور ہمیں خط لکھتی ہیں۔ شعاع آپ کو پسند آیا، یہ جان کر خوشی ہوئی۔

زرینہ خانم لغاری نے مظفر گڑھ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

خوب صورت، ہنستی ہوئی ماڈل پسند آئی۔ پہلی شعاع میں محترمہ رضیہ جمیل نے بہترین سبق دیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم پیدائش پر چراغ کرنا، ہلہ گلہ مچانا، لائٹنگ کرنا، جلسے جلوس نکالنا کافی نہیں۔ اصل مدعا ان کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ گھر میں بیٹھ کر درود پاک باکثرت پڑھیں، یہ اصل میلاد ہے کہ آپ ﷺ کی خوش نودی حاصل کریں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر درود شریف کے فضائل، افضل دن اور مزید مفید باتیں معلوم ہوئیں۔ ایمان تازہ ہوگیا۔ اذیکا سے ملاقات ہوئی۔ عمران اسلم سے ملے۔ بہنوں کے پیارے پیارے خط پڑھے۔ ''شہر تمنا'' ختم ہوگیا۔ شکر ہے مانی کو عائشہ مل گئی..... سب کا بیڑا پار لگا دیا گیا۔ طلال کا انجام برا ہوا۔ سچ ہے کہ برے کاموں کے برے نتیجے۔ سید صاحب نے اپنے آپ کو غلط سزا دی۔ بیٹوں، بہو اور بہن، بیٹی کے ساتھ رہتے ایک بار پھر اپنوں کو اکیلا کر گئے۔ پرانی غلطی پھر دہرا دی۔ ''وہ نازنین'' کی بارہ قسطیں اب اکٹھی پڑھنے کا ارادہ ہے۔ ''شاہ کی حویلی'' ابھی لڑھک رہی ہے۔ سونیا کی جرأت پسند آئی۔ ''گڑیا'' کے ساتھ سب گھر والوں نے کڑوا پیار کیا۔ مسکراہٹیں میں نہلے پہ دہلا میں بیوی نے خاوند کو خوب سبق دیا۔ نالائق بھی مزے کا تھا۔

☆ زرینہ جی! ہماری قارئین کو عائشہ اور مانی کے ملاپ سے جتنی خوشی ہوئی ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر ان دونوں کا ملاپ نہ ہوتا، قارئین کے ''معصوم'' دلوں پہ کیا گزرتی۔ شکر ہے کہ نعیمہ ناز نے ان دونوں کو ملا دیا کاش یہ جذبہ اصل زندگی میں بھی نظر آئے۔

''وہ نازنین'' کی بارہ قسطیں ایک ساتھ پڑھ لیں اپنی رائے ضرور لکھیں۔ ویسے ہمیں زیادہ اچھا یہ لگتا ہے کہ آپ ہر ماہ قسط پڑھ کر اپنی رائے دیں۔ اس سے مصنف کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

گڑیا راجپوت نے جاتری شریف سے لکھا ہے ٹائٹل ماڈل حسب معمول پسند نہ آئی۔ اس کی اتنی بار سرورق پر تصویر نظر آچکی ہے کہ اب دل کرتا ہے، اگلے پانچ سال کم از کم نظر نہ آئے۔ ''پہلی شعاع'' پڑھ کر ''دستک'' چھوڑ چھاڑ بیٹھ کر سیر دو جہاں۔ یہ آج کل پڑھ میرے لیے بہت ضروری ہے۔ پی پی ایس ای میں کا آسکتا ہے۔ تنزیلہ ریاض کا ''نور القلوب'' پڑھا۔ فی الحال تبصرہ سے خالی ہے۔ ایک قسط سے اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ''وہ نازنین'' کا اختتام ٹھیک ہوگیا۔ ذکی اپنے برے انجام کو پہنچا۔ ''قوام'' میں میمونہ صدف نے دل کو تسلی دینے والا پیغام چھوڑا۔ ''عناد'' صدف ریحان گیلانی آپ کو میں نے مصروفیت سے وقت نکال کر پڑھا اور رات ایک بجے تک ناول مکمل کر پائی۔ بہت مزے کا تھا لیکن کہیں کہیں گرفت کمزور پڑ جاتی تھی۔ پر خیر اس کمی کو آپ دیسی انداز ڈھانپ دیتا تھا۔ ''گڑیا'' بالکل پسند نہ آیا۔ نظر سوری۔ دراصل مجھے گڑیا لفظ ہی منحوس لگتا ہے۔ شازیہ جمال اب بس افسانوں کی جان چھوڑ دیں، مکمل ناول ناولٹ لکھیں بلکہ اگلا سلسلہ وار ناول شروع کروا دیں

''شکایت'' پڑھ کر تو مجھے آپ سے شکایت ہوگئی۔ اس انداز تحریر میں بہت کچھ پڑھ لیا۔ ساس، نند اور بھابھی کی جان چھوڑ دیں۔ ''خط آپ کے'' پڑھ کر دل ہی ٹوٹ گیا۔ میں نے اتنا لمبا خط لکھا تھا لیکن نکی سی ٹھہری۔ میرا منہ چڑا رہی تھی، حد ہے یعنی آپ کو میرے مشورے پسند نہیں آئے پر آپ نے تو میرا سارا خط ایڈٹ کر دیا۔ ہما اور تبسم آج کل نہیں لکھ رہیں، خیریت؟ آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ایک حرا قریشی تھی، بہت انوکھے انداز میں لکھتی تھی، آج کل کدھر غائب ہے؟ مجھے یہ پوچھنا تھا کہ اگر میں تینوں ڈائجسٹوں کے سالانہ واجبات سینڈ کروں تو ہر مہینے کیا مجھے میرے گھر بیٹھے ڈائجسٹ ملیں گے۔ میرا گھر گاؤں میں ہے۔

☆ پیاری گڑیا! ٹائیٹل پر جو ماڈل ہے، وہ شعاع میں پہلی بار لگی ہے۔ اس سے پہلے صرف ایک بار خواتین پر شائع ہوئی تھی۔ خط ایڈٹ کرتے ہوئے ہمیں بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ ہماری خوشی نہیں مجبوری ہے۔ ہماری قاری بہنیں اتنی دقتیں اٹھا کر، دشواریوں سے گزر کر ہمیں خط لکھتی ہیں، تو ہماری خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہنوں کے خط شامل ہوں۔ پرچے آپ کو گھر بیٹھے مل سکتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے اس نمبر پر فون یا واٹس ایپ کریں۔ 0317-2266944۔

ظل ہما نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو آپ سے لڑنا ہے کہ آپ نے اب تک میرے دو خط شائع کیے اور دونوں میں میرا اتنا پیارا میرے مرحوم دادا ابو کا اتنے پیار سے رکھا میرا نام ظل ہما بدل کر ظلم ہما کر دیا۔ اتنا ظلم ہمارے پیارے سے نام پر، اب بتائیں کہ ہماری آپ سے لڑائی بنتی ہے کہ نہیں۔

دوسری وجہ جس کی وجہ سے خاص طور پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ وہ آپ کی ہماری محنت سے لکھی اور گھر داری کے مشکل کاموں سے وقت نکال کر لکھی گئی پیاری پیاری تحریروں سے زیادتی ہے جنہیں آپ شرف قبولیت بخش ہی نہیں رہیں۔ ہم جو بدخواہوں کے طعنے کہ ''آپ لوگ صرف اپنی تحریریں چھاپتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی تحریریں ڈائریکٹ ردی کی ٹوکری کی نذر کرتے ہیں'' کا جواب ہمیشہ آپ کا دفاع کر کے دیتے ہیں۔ اب تو خود کش ویچ میں پڑ گئے ہیں کہ کہیں ''دشمنوں'' کے منہ میں خاک'' وہ سچ ہی تو نہیں کہتے۔

☆ پیاری ظل ہما! آپ کی خفگی جائز ہے۔ اتنے پیارے نام کو اگر بگاڑ کے ظلم کر دیا جائے تو یہ واقعی ظلم ہے۔ سہواً ایسا ہوا اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

دوسری معذرت کہانیوں کے لیے، آپ کی کہانیاں قابل اشاعت نہیں۔

فہمیدہ جاوید ملتان سے لکھتی ہیں

اس شمارے کا ٹائٹل خواتین اکتوبر 2019ء کے سرورق پر چھپ چکا ہے۔ اگرچہ اچھا تھا۔ ''شہر تمنا'' کی آخری قسط کا متوقع انجام رہا اور رخسانہ نگار صاحبہ کب کشف کی زندگی میں خوشیاں لائیں گی؟ تنزیلہ جی کا نام تو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ''نور القلوب'' نام کی طرح ناول بھی متاثر کن ہے۔ ''عناد'' ناول اچھا تھا۔ صدف ریحان کا ناول ''کونج'' ابھی تک یاد ہے۔ ''قوام'' میمونہ کافی ٹائم بعد اپنے الفاظ کا دیدار کروایا۔ ''وہ نازنین'' بھی اچھا رہا۔ منفرد تحریر فرح! آتی رہنا۔ فرح سے کہہ دینا۔ افسانے تینوں سبق آموز رہے۔ یہ ہی شعاع کی خوبی ہے۔ ازیکا ڈینیل سے ملاقات پسند نہیں آئی، ہاں آمنہ کا کتب پر تبصرہ دلچسپ ہے۔ شعاع میں نومبر 2020ء کے شمارے میں میرا سوالات و جوابات پر مبنی سلسلہ ''تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' شائع کرنے پر ممنون ہوں۔

☆ پیاری فہمیدہ! آپ کا طویل خط ملا، ہم نے پڑھا۔ آپ کہ محبت کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ معذرت کہ ہم اس خط کو شائع نہیں کر سکتے۔ اپنے پرچوں میں اپنی تعریفیں وہ بھی اتنی زیادہ تعریفیں کرنا یہ ہماری پالیسی نہیں ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ریحانہ چوہدری مدو کے اندھیر باگڑیاں سے شرکت محفل ہیں

اس مہینے 50% اشعار بہت کمال کے تھے۔ پیارے نبی کی پیاری باتوں نے تسخیر کیا۔ تو اس کے بعد

عکس ادب میں جو ڈاکٹر صبا نے کہانی کی کہانی بیان کی تو ہم جیسے الفاظ کے سحر میں جکڑے ہوئے لوگوں کو ذہنی تشنگی کی سیرابی کا بہانہ مل گیا۔ من موہنی اداکارہ اذیکا ڈینیل سے ملاقات بہت پسند آئی۔ بہن ف، ج کا ناتا، حقیقت کا عکاس تو تھا ہی ان کے بہترین انداز تحریر اور مثبت طرز فکر کا آئینہ بھی تھا۔

مختصر مختصر لکھتے ہیں داستان خطوط کی محفل لاجواب محفل، لاجواب خطوط اور جوابات کی تو کیا ہی بات (یہ سارہ کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں سارہ کی دوستیں خط لے کر آرہی ہیں)

ثمینہ اکرم کو بہت بہت مبارکیں تمام خوشیوں کی اور دوبارہ آمد پر خوش آمدید، کوثر خالد اللہ آپ کو صحت وتندرستی اور ہمت عطا کرے اتنے پیارے اور بابرکت کام کی تکمیل کے لیے، آپ کا خط جان محفل ہوتا ہے اس میں کوئی دورائے نہیں ہوسکتیں۔ ایسا ہی زینب نور کا معاملہ بھی ہے۔ ماہا اور تبسم کی کمی محسوس ہوئی۔

تنزیلہ ریاض کا ''نور القلوب'' بنیادیں بتا رہی ہیں کہ آنے والے مہینوں میں اس پلاٹ پر ایک شاندار تاج محفل تعمیر ہونے جارہا ہے۔

''وہ نازنین'' بالآخر ایک اچھے اختتام پر منتج ہوا۔ فرح بخاری ایک اچھا ناول لکھنے پر بہت بہت مبارک باد کی مستحق ہیں۔ نعیمہ ناز کا شہر تمنا بھی تکمیل کو پہنچا۔ معاشرتی ناہمواریوں کی بامحاورہ انداز میں بہترین تصویر کشی کا حاصل ایک اچھا ناول تھا مگر میرے خیال میں چاند بابو کا کردار ایک مرتبہ پھر سے غلط فیصلہ کرکے اپنے عزیزوں کو ذہنی اور جذباتی لحاظ سے ناآسودہ کرگیا ہے۔

شازیہ جمال طارق کا افسانہ ''شکایت'' معاشرے کا آئینہ تھا۔

پیاری ریحانہ! مختصر الفاظ میں کیا گیا آپ کا تبصرہ جان دار ہے۔ بہت شکریہ۔ کہانی موصول ہوگئی ہے۔ ان شاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

مدیحہ عارف نے سانگلہ ہل سے لکھا ہے

عرصے بعد دل سے خواہش ہوئی کہ خط لکھوں۔ نومبر 2020ء کا شمارہ ہاتھ آیا تو سرورق دیکھ کر تروتازہ سا احساس ہوا، ماڈل نے میرے پسندیدہ رنگ کا لباس جو پہن رکھا تھا۔ اس ماہ دو دو کہانی اپنا انجام کو پہنچیں وہ نازنین کا اختتام بہترین تھا۔ سب کو ان کے کیے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملی، ہر کردار بہترین تھا خاص کر نصیر اور واسع کا یہ بات اچھی لگی کہ سزا کا عمل قدرتی دکھایا نا کہ کسی انسان کے ہاتھوں ذکی اور اس کی فیملی انجام سے دوچار ہوتی۔ شام کی حویلی میں ردا کا بہت افسوس ہے امید ہے کشف کے ساتھ بہتر ہی ہوگا۔ میر منصور کا انجام ضرور بھیانک ہونا چاہیے عجیب سا کردار ہے نہ ادھر کا نہ ادھر، کشف نے نکاح جیسا پاک رشتہ ماں کے علم میں لائے بغیر جوڑ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ تنزیلہ ریاض آئیں اور چھا گئی۔ ''نور القلوب'' زبردست رہی پہلی ہی قسط نے بتا دیا کہ میرا دل کیا تعریف کردینے کو، خط لکھنے کی پہلی وجہ یہ ہی ہے۔

سب سے عمدہ قصہ گلے اور خوشحال خان کا لگا کیسا خوب صورت تعلق دکھایا ہے میں تو تصور کے پردے پر ان کی نوک جھونک کرتی تصاویر تک دیکھنے لگی تھی کہانی کا بہترین لمحہ یہ ہی ہوتا ہے کہ قاری اس میں خود کو محسوس کرنے لگے اور اس لمحے کو اپنے آس پاس محسوس کرے زبردست اے ون۔

اور دوسری وجہ ''قوام'' ایسا برجستہ بے ساختہ لکھا ہو ہے کہ میں ایک ہی نشست میں مکمل کرکے اٹھی۔ میمونہ صدف ویل ڈن، تحریر پڑھتے اپنی زندگی کا وہ حصہ ذہن کے پردے پر جگمگانے لگا جب اسکول و کالج اکیڈمی اکیلے جانا پڑتا تھا کبھی کبھار ورنہ تو سکھیاں ہمراہ ہوتیں ہمیشہ ہی 6 بجے بھی اکثر تو دھند میں جانا پڑتا پر صد شکر کہ کبھی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا کہ پتھر اٹھانے کی نوبت آئے۔ چھوٹے شہروں کے بڑے مزے، مجھے تو عشق ہے اپنے شہر سے۔ سانگلہ ہل کے لیے لکھنے بیٹھوں گی تو وقت کا پتہ نہ چلے اور صفحات بھرتے جائیں پر فی الوقت کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں یہ کام۔

افسانے تینوں اچھے تھے پر یہ کیا تعداد میں صرف تین بہت ناانصافی ہے، یہ مکمل ناول ابھی پڑھا نہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 241 پر

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ف۔الف

شعاع سے تعلق تو بہت پرانا ہے لیکن اس کے کسی بھی سلسلے میں شرکت کبھی نہیں کی۔ لیکن یہ نیا سلسلہ (جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے) کو دیکھ کر اپنے آپ کو روک نہیں سکی۔

س: ''شادی کب ہوئی؟''

ج: ''میری شادی 25 دسمبر 2006ء میں ہوئی۔''

س: ''شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں؟''

ج: ''میں اپنے گھر میں سب سے بڑی تھی۔ ہم چار بہنیں ہیں۔ بھائی کوئی نہیں، بس شادی سے پہلے پڑھائی، رسالے پڑھنا، کوکنگ کرنا۔ امی سے ڈانٹ کھانا۔''

س: ''رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے سامنے سر جھکا دیا؟''

ج: ''جی میرے شوہر ملک سے باہر کام کرتے تھے اور میرے ابو کے پرانے جاننے والے تھے۔ جب انہوں نے رشتے کی بات کی تو میرے ابو نے میری مرضی جاننا چاہی تو میں نے بہت شور مچایا کیونکہ میرے شوہر اور میری عمروں کا بہت فرق تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں سعید نے خود مجھ سے بات کی اور مجھے سمجھایا کہ ہماری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی تو پھر میں رضا مند ہوگئی۔''

س: ''چیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور؟''

ج: ''میری عمر ہی نہیں تھی یہ سب سوچنے کی۔ میں اس وقت صرف سترہ سال کی تھی۔ سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی۔ زیادہ اس بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔''

س: ''منگنی کتنا عرصہ رہی؟''

ج: ''چار ماہ اور کئی ملاقاتیں ہوئیں اور بہت دفعہ فون پر بات بھی ہوئی بلکہ روزانہ۔''

س: ''شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟''

ج: ''بڑے نیک خیالات تھے۔ میں کافی حد تک ان کو جانتی تھی لیکن چھوٹی ہونے کی وجہ سے رویوں کی پہچان نہیں تھی۔''

س: ''شادی کے لیے تعلیم کی قربانی دینی پڑی؟''

ج: ''جی بالکل۔ تعلیم کی قربانی دینی پڑی۔ میں سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی، ایف اے کے بعد شادی ہوگئی۔ جس کا مجھے کافی دکھ تھا۔ لیکن میرے شوہر اور سسرال والوں نے مجھے یقین دلایا کہ میں بعد میں اپنی تعلیم مکمل کر سکتی ہوں لیکن ایسا ہو نہ سکا۔''

س: ''رسموں کے لین دین میں کوئی جھگڑا ہوا؟''

ج: ''جی نہیں۔ جھگڑا نہیں ہوا بلکہ سب کچھ بہت اچھا ہوا۔ میری شادی میری امیدوں سے کافی زیادہ اچھی ہوئی تھی۔ میرے سسرال والوں نے ہر چیز میری مرضی سے خریدی تھی۔ مایوں، مہندی، بارات، ولیمہ سب کچھ بہت بہت اچھا ہوا تھا۔ ایک آئیڈیل شادی تھی۔ نظر لگ جانے کی حد تک اچھی شادی۔''

س: ''شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟''

ج: ''میری بارات کا فنکشن دن کے ٹائم پہ تھا اور شادی ہال سے سسرال والوں کا گھر صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا تو تقریباً چار بجے رخصتی ہوگئی اور بڑی جلدی ہی رسموں سے فارغ بھی ہوگئی تھی۔ کافی دیر تک تو لڑکیوں نے میرے اردگرد گھیرا ڈالے رکھا لیکن پھر میری بڑی نند آئیں اور انہوں نے سب لڑکیوں کو بھگا دیا اور میرے شوہر کو کمرے کے اندر بھیج دیا۔ تو جب میرے شوہر اندر آئے تو کافی حیران ہوئے کہ اتنی جلدی فارغ کر دیا اور باتھ روم کے اندر اور اردگرد دیکھنے لگے کہ کوئی چھپا ہوا تو نہیں ہے۔ ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہیں تھی، ہماری

پہلے سے ہی کافی دوستی تھی اور میرے شوہر نے کوئی روایتی باتیں بھی نہیں کی تھیں۔ باقی پھر بہت پرسنل ہو جاتا ہے۔''

س: ''شادی کے بعد خاص تبدیلی؟''

ج: ''میرے خیال سے تو شادی ہے ہی تبدیلی کا نام۔ کوئی تبدیلی نہ آئے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تو میری زندگی میں بہت تبدیلیاں آئیں۔''

س: ''شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟''

ج: ''تقریباً ایک ہفتہ کے بعد ہی، لیکن میرے سسرال میں صرف کھانا ہی خود بناتے تھے۔ باقی کام کے لیے ماسی آتی تھی۔''

س: ''کیا میکے اور سسرال میں فرق؟''

ج: ''اتنا فرق تو نہیں تھا لیکن بنا دیا گیا۔ دراصل ہماری شادی ہوئی تو اریج تھی لیکن میرے شوہر نے اپنے گھر والوں کو بڑی مشکل سے راضی کیا تھا۔ وہ ان کی شادی کہیں اور کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں اس بات کا پتا نہیں تھا۔ یہی غلطی جو کہ میری ہرگز نہیں تھی، میری بنا دی گئی اور چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہر وقت یہی سننے کو ملتا تھا کہ اس کو کیا کرنا آتا ہوگا حالانکہ مجھے سب کام آتے تھے۔ میری کوکنگ بھی بہت اچھی تھی۔ میری ساس کو کسی کا بھی پکا کھانا پسند نہیں آتا اور مجھے بھی کچن میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میری ساس ہی کھانا بناتی تھیں۔ بہت اچھا بناتی تھیں لیکن ظاہر ہے ایک بندہ ایک کام ساٹھ سالوں سے کر رہا ہو اور نئے آنے والے کو ابھی ایک ہفتہ تو فرق تو ہوتا ہے لیکن انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔ بس یہی کہا کہ ''اس کو کچھ نہیں آتا اس لیے میں کروں گی'' اور اوپر سے آنے والے لوگوں کو کہتیں کہ.....

''دیکھو اس عمر میں، میں ہی کچن سنبھال رہی ہوں۔ بہو تو پڑی سوتی رہتی ہے۔''

مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔ میں کسی کے ساتھ غلط کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتی۔ میری ساس تو میری نانی کی عمر کی ہیں۔ میرے سسرالی رشتہ دار مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ میرے شوہر اور میری عمر میں بیس سال کا فرق ہے لیکن انہوں نے مجھے اتنا پیار عزت احترام دیا کہ شاید کوئی اور نہیں دے سکتا تھا اور میرے۔ وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ میرے دل میں کے لیے عزت، محبت میں بدلی اور پھر عشق میں۔''

س: ''سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی کب تعریف؟''

ج: ''بڑا مشکل سوال ہے۔ سسرال میں تنقید تو عورت پر ہوتی ہے لیکن تعریف کروانے کے لیے بہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ بڑا صبر کرنا پڑتا ہے۔ خدم کرنی پڑتی پھر کہیں جا کر کہ تعریف سننے کو ملتی ہے اور وہ ہر ایک کو نہیں۔

میں نے بڑی تنقید کا سامنا کیا۔ مجھے ہر وقت سننے کو ملتا تھا کہ اس کو کیا پتا، کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ میں اور مخلوق ہوں اور غلطی سے کسی اور دنیا میں آ گئی ہوں مجھے اس لیے زیادہ تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ میر شوہر میرے ساتھ تھے اور میرے ساس سسر بیٹے کی ما بھی تھے۔

میرے سسرال میں زیادہ لوگ نہیں تھے، شادی شدہ تھے اور اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہمارے ساتھ میرے ساس سسر اور میرے دیور دیو جن کی ہمارے ساتھ ہی شادی ہوئی تھی، وہ رہتے مختصر یہ کہ تعریف کم ہی سننے کو ملی اور تنقید بہت زیادہ۔''

س: ''سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام د آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خا معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی ہے؟''

ج: ''شروع میں تو شاید نہیں بلکہ بالکل ہی نہ پھر شادی کے تین سال کے بعد ہی ہمیں الگ کر دیا سمجھیں گھر سے نکال دیا اور ہم سے رابطہ تعلق سب کر دیا۔ میرے شوہر مجھے میرے والدین کے گھر چھ خود بیرون ملک (امریکا) چلے گئے کیونکہ ان کی وہاں تھی پھر میں تقریباً دس ماہ اپنے والدین کے گھ اور اس کے بعد میرے شوہر نے اپنا الگ گھر بنا ایسا بنایا کے سب دیکھتے ہی رہ گئے اور مجھے الگ اور بڑی شان سے رکھا اور رائے کو تو آپ رہنے ہی د

میرے شوہر جنہوں نے اپنے والدین، بہن، بھائیوں کے لیے اتنا کیا کہ بتا نہیں سکتے۔ ان کو کبھی اہمیت نہیں دی، کبھی کسی معاملے میں مشورہ نہیں کیا تو میں کس کھاتے میں تھی۔''

س: ''سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟''

ج: ''اس میں شاید میرا اپنا قصور تھا، میں کسی کو سمجھ ہی نہیں سکی۔ بڑی کوشش کی، کبھی کسی کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی۔ ہر کسی کی خدمت کرنے کی کوشش کی لیکن پتا نہیں کیا مسئلہ تھا، کبھی کسی کو خوش نہیں رکھ سکی اور اب جبکہ میری شادی کو دس سال ہوگئے ہیں۔ میرے تین بچے ہیں۔ میرے سسر معذور ہوگئے ہیں۔ ساس بھی چل پھر نہیں سکتیں، ان کو فالج ہوگیا ہے تو ہم سے معافی مانگ کر دوبارہ سے رابطہ بحال کرلیا ہے۔ اب وہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ میرے کھانے کی، میرے سلیقے کی، خدمت کی ہر چیز کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی سب بہوؤں سے زیادہ میری رائے کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس سب کے لیے میں نے بڑا صبر کیا۔ اپنی زندگی کے پانچ سال میرے شوہر بلاوجہ کی ناراضی کے سبب اپنے والدین سے دور رہے۔ میرے بچے دادی دادا سے دور رہے، جس کا مجھے بے حد دکھ ہے لیکن اب سب ٹھیک ہے۔

لیکن اگر دیکھا جائے تو میری ہر توقع، ہر فرمائش میرے شوہر نے پوری کی۔ میری زندگی میں اللہ کا شکر ہے، کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں وہ کم ہے۔''

س: ''بچیوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بڑا امتحان بن کر آتی ہے خصوصاً پہلا بچہ.....؟''

ج: ''جی بالکل۔ میں کم عمر تھی، اتنی سمجھ نہیں تھی لیکن میرے شوہر اور میرے والدین نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ جب میں پہلے بچہ کی دفعہ حمل سے ہوئی تو میرے شوہر امریکا جاچکے تھے بعد میں مجھے پتا چلا اور آپ سوچ نہیں سکتیں جب میں نے ان کو بتایا تو وہ اتنے خوش ہوئے صرف تین ماہ بعد ہی واپس آگئے۔ جس کی وجہ سے ان کو زن مرید، فضول خرچ اور نہ جانے کیا کیا نہ کہا گیا لیکن انہوں نے کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ اللہ کا کرم رہا سب خیر و عافیت سے ہوا اور اللہ نے ہمیں چاندسی بیٹی سے نوازا۔''

س: ''شوہر سے تعلقات؟''

ج: ''یہ تو آپ کو میرے پچھلے جوابات سے اندازہ ہوگیا ہوگا۔ جی اللہ کا شکر ہے، بہت بہت زیادہ اچھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط۔ صرف ایک کمی ہے کہ میرے شوہر کو اپنے کام کی وجہ سے امریکا جانا پڑتا ہے اگرچہ وہ جلدی ہی واپس آجاتے ہیں۔ تین ماہ ادھر اور تین ماہ پاکستان میں لیکن پھر بھی اللہ ہمارے رزق کا پاکستان میں ہی کوئی وسیلہ بنادے۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ امریکہ گئی تھی۔ کچھ ماہ کا وقت گزارا لیکن پاکستان سے محبت نے واپس آنے پر مجبور کردیا اور شعاع، خواتین میں نے اُدھر بھی پڑھنا نہیں چھوڑا۔''

س: ''جوائنٹ فیملی سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا؟''

ج: ''مجھے تو جوائنٹ فیملی کی اشد ضرورت تھی کیونکہ میرے شوہر بیرون ملک رہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ایسا ہو نہ سکا اور میرے والدین کو ہی میرا خیال رکھنا پڑا اور رہی باقی بات تو شاید نہیں کیونکہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ پردے کے مسائل بہت ہوجاتے ہیں۔ جیٹھ، دیور کی موجودگی ٹھیک نہیں رہتی۔ اگر پردہ کریں تو برا لگتا ہے کہ یہ ہم سے پردہ کرتی ہے۔ میرے خیال میں صرف ساس سسر کو ساتھ رہنا چاہیے کیونکہ بزرگوں کا سایہ ضروری ہوتا ہے۔''

س: ''سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی، اگر کی تو کس حد تک کامیابی ہوئی؟''

ج: ''میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ میں ایسا کچھ کرسکوں اور نہ ہی موقع ملا۔ میرے ساس سسر کے چار بیٹے ہیں۔ ان کی اپنے کسی بیٹے کی فیملی کے ساتھ نہیں بنی حالانکہ اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بھی وہ ہمیشہ بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ میں سمجھانے کی کوشش تو بہت کرتی ہوں اور اب بیماری کی حالت میں ان کو کچھ سمجھ میں آبھی رہا ہے، باقی اللہ مالک ہے۔

تنزیلہ ریاض

نورالقلوب

نورالقلوب ایک ایسا ادارہ جہاں صندل بی لوگوں کے لیے دعا کرتی تھیں، لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پا آتے تھے۔ وہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔

بٹ گرام میں بنی ہری حویلی میں وہ اپنے باپ اور گلے جو اس کی سوتیلی ماں تھی سے ملنے چھٹیوں میں آتا ہے۔ اس کی خالہ تھی جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد انتہائی کم عمری میں اس کے باپ سے بیاہی گئی تھی۔

خوشل اپنے باپ کی نسبت گلے سے زیادہ قریب تھا۔

داؤد بروکن فیملی کا بچہ تھا جو انتہائی موٹا تھا اس کے وزن کی وجہ سے سب اسے تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ پڑھ میں بھی اچھا تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروالیا تھا وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں۔

گلے کی اداسی دیکھ کر اسے لگا اس کا باپ شادی کر رہا ہے۔ وہ ان سے سخت ناراض تھا۔

اس کا دوست اسے بتاتا ہے کہ لاریب نے خودکشی کر لی ہے۔

آدھی رات کو ہری حویلی میں گھٹر پٹر سن کر وہ باہر نکلتا ہے تو اپنے باپ کے ساتھ لاریب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

دوسری قسط

بٹگرام میں رات آدھی گزر چکی تھی اور آدھی باقی تھی۔

درس گاہ نورالقلوب میں صبح عین اسی وقت ہوا کرتی تھی۔

زہرہ صندل بی کے لیے تہجد کے وضو کا پانی گرم کرنے اٹھی تو اسے اندازہ ہوا کہ شاید دور پہاڑوں میں کہیں پہلی برف باری ہوگئی تھی اور اب اس کے اثرات ہر جگہ نظر آنے لگے تھے۔ ہوا میں اتنی کاٹ تھی کہ اس نے ناک تک منہ لپیٹ کر لکڑیاں جلانا شروع کی تھی۔

زہرہ کو ایسے کاہل موسم سے بہت چڑ ہوتی تھی۔ کوئی کام کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ پہلے پہل زہرہ کو برف باری اور سردیاں بہت دل فریب لگا کرتی تھیں۔ برف باری شروع ہوتے ہی وہ پُرجوش ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا تعلق ملتان سے تھا۔ اس نے کہاں دیکھے تھے یہ ٹھنڈے میٹھے دودھیا مست نظارے۔ لیکن پھر وقت گزرا۔ اور وہ سارا خمار جو ملتان کی گرمی سہہ سہہ کر سردی کے متعلق حواسوں پر چھایا رہتا تھا دھیرے دھیرے چھٹنے لگا۔ جسم کی وہ ہڈیاں بوٹیاں جنہوں نے پہل کبھی اُف تک نہ کی تھی۔ تکلیف سے وہ بھی کراہنے لگیں اور پھر ملتان کی گرم دوپہریں یاد آئیں اور ان کی قدر محسوس ہوئی۔ اب اس اسے بکرام کی طویل سردیاں ذرا اچھی نہ لگتی تھیں۔ سارا نظام زندگی ہی معطل ہو جایا کرتا تھا۔

اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں پانی گرم کرنے کے لیے بیس منٹ لگا کر لکڑیاں جلائی تھیں۔ اس کے بعد وہ کچن میں آ گئی۔

''پھر یاد آیا ملتان؟ تو پڑھو۔ فبأی آلائی ربکما تکذبن (تم اللہ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)۔''

نوشابہ جاگ چکی تھی۔ اس کا جلا بھنا چہرہ دیکھ کر ہنس کر بولی۔ نوشابہ بڑی ہنگامہ پرور لڑکی تھی لیکن بہت اچھی تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے یہ خدشہ نہیں ستاتا تھا کہ وہ ٹوک دے گی یا ڈانٹے گی بلکہ وہ خود سے چھوٹی سب لڑکیوں کی بات تحمل سے سنتی تھی جبکہ درس گاہ کی باقی باجیاں ذرا کرخت تھیں۔ کچن میں سحری کی تیاری ہو رہی تھی۔ چائے کا پانی رکھا جا چکا تھا۔ اس نے آٹا گوندھتی نوشابہ کو دیکھا۔

''آج پھر سب روزہ رکھیں گے۔ اس کا مطلب آج بھی پچیس تیس پراٹھے اتریں گے۔'' وہ واقعی اکتائی ہوئی تھی۔

''نہیں۔ اس سے بھی زیادہ۔ آج کچھ مہمان بھی آئے ہوئے ہیں؟'' نوشابہ کو پتا تھا، اب وہ مزید چڑ جائے گی۔

''ہائے اللہ تو وہ سب بھی روزہ رکھیں گے کیا۔ وہ بھی پراٹھا کھا کر؟'' اس نے ناک چڑھا کر پوچھا تھا۔

''امید تو یہی ہے۔'' نوشابہ چائے کا پانی بھی چڑھا چکی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ چائے پاپے کھا لیا کریں۔ اور نفلی روزے سب ہی کیوں رکھ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو چھوڑ دیا کریں۔ اور سردیوں میں تو خاص طور پر۔ کیا ان کو پتا نہیں ہے کہ سردیوں میں کام کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پراٹھا بیلتے بیلتے بازو شل ہو جاتے ہیں میرے۔'' اس نے جو سوچا، کہہ دیا۔ نوشابہ ہنسی۔

''تم کیوں ہنس رہی ہو نوشابہ۔ مجھے واقعی اتنی سردی میں کام کرتے سخت الجھن ہوتی ہے۔ اب بھی دل چاہ رہا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ بستر میں گھس جاؤں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ نوشابہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں اب ہر کام سے ہی الجھن ہونے لگی ہے۔ جب دیکھو، جلی بھنی بیٹھی رہتی ہو۔ کیا بات ہے۔ کچھ پریشان ہو کیا؟'' نوشابہ کے لہجے میں اس کے لیے پریشانی تھی اور آنکھوں میں سوالیہ نشان۔ زہرہ کو جھٹکا سا لگا۔

''نہیں۔ پریشانی کیا ہو سکتی ہے۔ میں تو سردی کی وجہ سے اکتائی ہوئی ہوں۔ ایسے ہی کہہ دیا تھا میں نے تو۔''

وہ گھبرا سی گئی۔ دل میں چور تھا۔ اس لیے مزید کچھ کہے بنا چائے میں دودھ ڈالنے کے لیے فریج سے دودھ لینے کو مڑ گئی۔ یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ وہ پریشان تو تھی۔
کتنے دن ہو گئے تھے "اس" کی شکل دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ اور دل تھا کہ بے چین ہوا جاتا تھا۔

☆☆☆

"ارباب۔ خبیث انسان! یہ سونے کا وقت ہے؟"
خان بابا اور لاریب ہال کمرے کی طرف چلے گئے تھے اور اس کے حواس بھی تب ہی بحال ہوئے تھے۔ ارباب نے بتایا تھا کہ لاریب نے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے کہا تھا، وہ مزید تفصیلات سے اسے جلدی آگاہ کرے گا کیونکہ بہت سی باتیں اسے بھی نہیں پتا تھیں اور اب لاریب یہاں زندہ سلامت ہری حویلی میں موجود تھی۔ خان بابا کیا کرنے والے تھے۔ اس نے گھڑی پر بجتے ہندسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ارباب کو کال کرنا شروع کر دی تھی۔

پانچویں بیل پر اس کے فون اٹھاتے ہی وہ غرایا تھا۔ ارباب کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے یا مزید کیا ہونے ہونے والا ہے۔ وہ رات کے اس پہر اس کی فون کال کو معمول کی کارروائی ہی سمجھا تھا۔ غنودگی سے پُر لہجے میں جوابی حملہ کیا گیا تھا۔
"نہیں۔ چاندی کا؟"
"بکومت اور ہوش میں آؤ۔ مجھے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ جلے ہوئے لہجے میں بولا۔
"میں پٹھان ہوں یا نسوار پر پالا پوسا گیا ہوں کہ ہوش میں آتے وقت لگے گا۔ ہوش میں ہی ہوں میں۔ اگل دو جو بھی اگلنا ہے۔" ارباب کی آواز میں نیند کا عنصر کم ہوا تھا لیکن بے تکلفی کا نہیں۔
"تمہیں کس نے بتایا تھا کہ لاریب نے خودکشی کی ہے؟"
اس کے آواز میں بے انتہا سرد مہری تھی۔ ارباب چند سیکنڈز خاموش ہی رہا پھر بولا۔
"خان۔ تم نے اس وقت لاریب کے متعلق بات کرنی ہے؟" اس نے خوامخواہ چونکنے کی بھرپور اداکاری کی اور ساتھ ہی سیٹی بھی بجا ڈالی۔
"ارباب۔ پلیز مجھے اس مت کرو۔ میں سیریس ہوں۔" وہ چڑ کر بولا۔
"تو ایسے سیریس لوگوں کو فون کرو نا؟ مجھے کیوں کیا؟ اتنی گہری نیند سو رہا تھا میں۔" اس کی بذلہ سنجی غلط وقت میں عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ اسے صورت حال کا اندازہ ہی نہیں تھا۔
"ارباب۔ قتل ہونا چاہتے ہو میرے ہاتھوں؟" دانت پیس کر سوال کیا گیا۔ تھا
"دوسرا کیا آپشن ہے؟ ہاتھوں کے علاوہ؟ پہلے چاروں آپشنز بتاؤ۔"
ارباب کی بات پر اس نے چڑ کر فون ہی بند کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ وہی کر رہا تھا جو اس کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ ان سب دوستوں میں ہی وقت پر معاملے کی سنگینی کو سمجھنے والا خمیر کم تھا۔ وہ سوچ کے جال میں الجھا بستر پر بیٹھ گیا۔ کسی دوسرے دوست سے کم از کم وہ اس موضوع پر بات نہیں کر سکتا تھا۔
"خان بابا لاریب کو یہاں کیوں لائے ہیں؟" یہی سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کی آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی مگر بیداری کے احساس کے ساتھ ہی ذہن پر حملہ آور ہونے والا دوسرا احساس رات والی صورتحال کا تھا۔ ہری حویلی میں بہت کچھ ایسا ہو رہا تھا یہ اسے چونکانے کا باعث ہی نہیں پریشان کن بھی تھا۔

رات بھر ٹھیک سے نیند ہی نہ آسکی تھی تب ہی آنکھ کھلتے ہی اس کا دل چاہا کہ مزید سو جائے مگر تجسس نے اسے یہ بھی نہ کرنے دیا تھا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھا کر چیک کیا۔ ارباب کی کافی کالز تھیں لیکن اسے دوبارہ کال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ اس سے ناراض ہو چکا تھا

اس نے ٹانگوں پر پڑا لحاف کھینچ کھانچ کر خود سے علیحدہ کیا۔ ایک جھٹکے سے بستر سے اترتے ہوئے دل میں خیریت کی دعا کی اور عادت کے برخلاف بنا منہ ہاتھ دھوئے گلے کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ گلے بستر پر کسی روتی بسورتی ہیروئن کی طرح آڑی ترچھی لیٹی ہوئی ملے گی اور اس کی ہچکیاں ہری حویلی کے در و دیوار میں گونج رہی ہوں گی۔ وہ اسے لاریب کی موجودگی کی اطلاع دینے کے لیے ہمت جمع کرتے ہوئے اس کے کمرے تک پہنچا تھا لیکن اسے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ زمین پر اپنے کپڑے بکھرائے بیٹھی تھی۔

''گلے یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ ہمیشہ کی طرح بنا دستک دیے تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تھا اور پھر جس انداز میں آیا تھا اسی انداز میں شرمندہ ہو کر باہر نکل گیا۔ گلے کے بستر پر ''وہ'' سو رہی تھی۔

''خاناں۔ لحاظ کرو۔ یہاں پردہ ہے۔'' گلے زمین پر بیٹھے بیٹھے چلائی تھی۔ اپنے تئیں وہ اسے متنبہ کر رہی تھی کہ اندر مت آؤ یہاں میرے علاوہ بھی خواتین موجود ہیں۔

اسے ایک برہنہ دودھیا بازو ہی نظر آیا تھا جس سے وہ جھٹکا کھا کر باہر نکل آیا تھا لیکن اسے بڑی شرمندگی ہوئی

''اونہہ۔ پردہ ہے۔ ان محترمہ سے پوچھ تو لو کہ یہ لفظ پہلے سنا بھی ہے کبھی۔؟ ان کے یہاں پردہ ان کپڑوں کو کہتے ہیں جو کھڑکیاں پہنتی ہیں۔''

اس نے با آواز بلند بڑبڑا کر اپنے اس احساس کو کم کرنا چاہا پھر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ وہ اسلام آباد میں ہوتا تو شاید اتنا شرمندہ نہ ہوتا لیکن ہری حویلی آتے ہی اس کو خاندانی روایات یاد آنے لگتی تھیں۔ بنگرام کے طور طریقے ایبٹ آباد یا اسلام آباد جیسے نہیں تھے اور یہی اطوار اس کے رویے میں بھی جھلکتے تھے۔ اسلام آباد میں وہ اپنی کئی ایک کلاس فیلوز سے بے تکلف ہونے کے باوجود بنگرام میں گلے کے علاوہ کسی سے بلا جھجک بات نہیں کر سکتا تھا۔ تھا کوٹ سے اگر کوئی بھولی بھٹکی رشتے دار خواتین آ ہی جاتی تھیں تو وہ گلے کے کمرے کی طرف جاتا ہی نہیں تھا اور ان سے بات کرنے یا انہیں مخاطب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''خوشحال خاناں! جیبہ ماسی باورچی خانے میں ہے۔ اسے بولو کہیں ناشتہ بنا دے۔''

گلے نے پھر اندر سے آواز دے کر کہا تھا۔ اسے اب کی بار برا بھی لگا۔ گلے نے باہر آ کر اس سے بات کرنے کے بجائے، اسے نئی صورتحال سے آگاہ کرنے کے بجائے وہیں سے بیٹھے بیٹھے حکم صادر کر دیا تھا۔ وہ بھی ''اس'' کے سامنے یہ گلے کی پہلی بے وفائی تھی اور بے وفائی تو ان کے یہاں ناقابلِ معافی جرم تھا۔

''میں واٹس ایپ ہوں؟ جو تمہارے سندیسے اہلِ محلہ تک پہنچاؤں۔ باہر آؤ اور خود آ کر ناشتہ بنا کر دو۔''

وہ ناراضی بھرے لہجے میں بولا پھر اس کا جواب سنے بغیر اپنے کمرے کی جانب چل دیا حالانکہ دل میں ہاہا کار مچی تھی۔ ہری حویلی یک دم شکوک کے کالے سیاہ رنگ میں رنگی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

''یہ بھی ہٹا دوں سر؟'' رفیق نے کمرے میں موجود تقریباً تمام اشیا اٹھا لینے کے بعد سوال کیا تھا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔ ذہنی طور پر وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ رفیق کا اس کے ساتھ سب سے زیادہ آمنا سامنا رہتا تھا مگر وہ بھی باقی ملازمین کی طرح اس بات سے باخبر تھا کہ

''صاحب'' گھر میں تو ہوتے ہیں لیکن حواسوں میں نہیں ہوتے۔

رفیق نے اس کی نگاہوں کے مرکز پر نظریں جمائیں۔ وہ جس دیوار کے پاس کھڑا تھا اس پر جا بجا فوٹو فریمز آویزاں تھے۔ مختلف سائز کے فریمز میں لاریب کی بچپن سے لے کر اب تک کی کئی تصاویر نمایاں نظر آرہی تھیں۔ اس کی کامیابیاں، اس کی ناکامیاں اس کی زندگی کے ہر خاص و عام مرحلے کی ایک آدھ جھلک ان تصاویر میں موجود ضرور تھی۔

یہ سب تصاویر شاید مس ٹینا نے لگائی تھیں کیونکہ رفیق سے پہلے گھر کے ایسے معاملات ان کے ذمہ تھے اور اس کے پاس تو فرصت تھی نہ خواہش کہ وہ ایسے کام کرتا۔ وہ تو اس کمرے میں بھی شاید دوسری یا تیسری مرتبہ آیا تھا جب کمرے کا مکین رخصت ہوگیا تھا۔ بہر حال یہ کسی کا بھی کام تھا لیکن تھا اچھا۔ اگر حالات اس نہج پر نہ پہنچے ہوتے تو یقیناً وہ ان تصاویر کو سراہتا مگر اب تو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ زندگی نے اس کی آخری متاع بھی چھین لی تھی۔ یہ تصاویر بُری تھیں نہ ہی انہیں بُرے طریقے سے دیوار پر سجایا گیا تھا۔ وہ تو بے حد نفاست سے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے فریمز میں سجی تھیں مگر یہ سجاوٹ اس کے زخموں کو کھینچ کھینچ کر اُدھیڑ رہی تھی۔

''ڈیڈی۔ میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

سفید لمبے فراک میں ملبوس گھنگریالے بالوں کو کمر تک پھیلائے وہ شاید اسکول کے کسی فن فیئر میں جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے آفس کے لیے نکلتا دیکھ کر بھاگ کر اس کے پاس آگئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جھک کر اس کے برابر آبیٹھا۔

''واؤ۔ آپ تو بہت پریٹی لگ رہی ہو۔'' اس نے سراہا۔ وہ دل کھول کر مسکرائی۔ اس کے چہرے پر سجی مسکراہٹ مزید دلنشین ہوگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا ذرا سی تعریف نے اسے بے پناہ خوشی دی ہے۔

''تھینک یو۔ ڈیڈی۔ مس ٹینا نے بھی یہی کہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں، آئی ایم جسٹ لائک مائی مدر۔''

وہ اسے بتا رہی تھی یہ محسوس کیے بنا کہ اس کے باپ کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا۔

''ازشی رائٹ ڈیڈی! میں ممی جیسی ہوں؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ اتنی سی بچی کو خبر نہیں تھی کہ جب ماں باپ میں علیحدگی ہو چکی ہو تو اس طرح کی باتیں تکلیف دیتی ہیں۔ وہ تو بس معصومیت میں کہہ گئی تھی لیکن وہ جو محبت سے اس کے پاس آبیٹھا تھا یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''دادو تو کہتی ہیں۔ میری ممی اسنو وائٹ کی ممی جیسی تھیں۔ پریٹی مگر روتھ لیس (ظالم)۔ ازشی رائٹ ڈیڈی؟'' وہ جو بھی سنتی تھی، کسی دوسرے سے اس کی تائید یا تردید کروانا ضروری سمجھتی تھی۔

''مس ٹینا۔ آپ کو دیر ہو رہی ہوگی۔ اسے لے جائیں اسکول۔'' اس نے اونچی آواز میں کہا تھا۔ لاریب خائف ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اتنی سی عمر میں اس کو چہرے پڑھنے تو نہیں آتے تھے لیکن لہجوں کے زیر و بم وہ پہچاننے لگی تھی۔

''یہ رہنے دیتا ہوں سر۔ یہ کافی اچھی ہیں۔'' وہ چونک کر ماضی کے چنگل سے آزاد ہوا۔ رفیق نے اس کا انہماک دیکھ کر مشورہ دیا تھا۔ اسے مالکوں کی آنکھوں سے ان کی منشا جان لینے کا دعوا تھا جو فی الوقت اس کے منہ پر چانٹے کی طرح رسید ہوا۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر انتہائی لاتعلقی بھرے انداز میں بولا۔

''مائنڈ یور اون بزنس۔'' اس کی سرد مہری سے خائف ہو کر رفیق سے اگلا جملہ بولا ہی نہ گیا۔

''ہٹاؤ ان سب کو۔ سب کچھ کچرے میں پھینک دو..... ہر چیز..... ایک ایک چیز..... مجھے یہاں کچھ بھی نظر نہیں آنا چاہیے۔''

اس کا لہجہ نہایت سخت تھا۔

''اس گھر میں لاریب نام کا چیپٹر کلوز ہو چکا ہے۔''

☆☆☆

''میں مہر ہوں۔ مہر افروز!'' میرون فراک کے اوپر سفید جیکٹ اور لانگ شوز پہنے، بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے وہ آگے آئی تھی اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے مصافحے کے لیے سب سے پہلے داؤد کے سامنے ہاتھ کیا تھا کیونکہ وہ جزوی دائرہ بنا کر کھڑے تھے اور ان میں پہلا نمبر داؤد کا ہی تھا مگر وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ باری باری سب سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک انتہائی خوب صورت لڑکی تھی لیکن وہ جس عمر میں تھے، اس میں تو سب لڑکیاں ہی خوب صورت ہوتی ہیں یا شاید لگتی ہیں، اس لیے داؤد سمجھ نہیں پایا کہ اسے کیا چیز وہاں موجود باقی لڑکیوں سے ممتاز کر رہی ہے مگر اس کی شخصیت میں کچھ ایسا ضرور تھا۔ جس نے داؤد کو چونکایا تھا۔

''مجھے ثوبیہ آنٹی نے تم سب لوگوں کے بارے میں بتایا۔ بائی دا وے وہ میری پھپھو ہیں۔ میں چند دن پہلے ہی اپنے پیرنٹس کے ساتھ یہاں آئی ہوں قطر سے۔'' وہ خود ہی وضاحت کر رہی تھی۔

''ہاں، زوہیب نے بتایا تھا کہ آج کمپیوٹر لیب میں کہ اس کی کزن آئی ہوئی ہے۔'' خلود نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

''تم زوہیب کی کزن ہو۔'' فرمان نے کہا تھا۔ یہ سوال نہیں بلکہ تبصرہ تھا۔ آنٹی ثوبیہ کے بیٹے زوہیب سے سب واقف تھے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ فرمان نے ہونٹ بھینچتے ہوئے مصنوعی استعجاب سے گردن ہلائی۔

''ہمت ہے تمہاری۔ ہم سے تو ایسا کزن تصویر میں برداشت نہیں ہوتا۔ اور تم رئیل میں کر رہی ہو۔''

خلود اور فروا کے علاوہ کوئی نہیں ہنسا تھا۔ زوہیب انتہائی کتابی کیڑا تھا۔ اسے کتابوں کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی اور اس کی ان میں سے کسی سے بھی دوستی نہیں تھی۔ فرمان کا اشارہ اسی بات کی طرف تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی جس سے فرمان کا حوصلہ بڑھا تھا۔

''اس کا مطلب اب ہمیں ''اس'' سے بھی دوستی کرنی پڑے گی۔ تم سے دوستی ہوگی تو تمہارے کزن کو بھی دوست بنانا پڑے گا۔ خیر سمو سے کے ساتھ چٹنی فری ملتی ہی ہے۔'' فرمان نے ''اس'' پر زور دیتے ہوئے بے تکلفی سے کہا تھا۔ لہجے میں شوخی در آئی تھی۔ داؤد کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ ایسی بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ فرمان کا یہ ہنر ہمیشہ اسے حیران کر دیتا تھا۔ وہ کبھی اس خدشے کا شکار نہیں ہوا تھا کہ اس کی بات کسی کو بری بھی لگ سکتی ہے اسی لیے اسے لڑکیوں سے بے تکلف ہونے میں کبھی جھجک نہیں ہوتی تھی۔

مہر افروز نے اس کو جملہ مکمل کرنے دیا پھر اپنی لمبی گردن ذرا سی موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور تیکھی ناک چڑھا کر بولی۔

''آئی ڈونٹ تھنک سو اٹ ول ورک (مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو پائے گا)۔ وہ ذرا میچور رہے۔ اور میں بھی۔''

وہ رکی، مسکرائی

''تم جیسے ایلیمنٹری اسکول کے اسٹوپڈ چھوٹے بچوں جیسی باتیں کرنے والے سے اس کی دوستی چل نہیں پائے گی۔'' وہ ایک بار پھر رکی، مزید مسکرائی اور پہلے سے زیادہ تپانے والے انداز میں بولی۔

''اور میری بھی۔'' فرمان کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔

اس نے بالکل پروا نہیں کی بلکہ وہ اسے مکمل نظر انداز کرتے ہوئے باقی سب کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ فرمان کو یقیناً سبکی کا احساس ہوا تھا لیکن داؤد کو بہت اچھا لگا۔ ان کے گینگ میں پہلی بار کسی ایسے شخص نے شمولیت اختیار کی تھی، جسے فرمان اچھا نہیں لگا تھا۔ دشمن کا دشمن خوامخواہ اچھا لگنے لگتا ہے۔ داؤد کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ و

بے حد توجہ سے اس کی باتیں سننے لگا تھا۔ وہ سب سے باری باری متعارف ہو رہی تھی اور داؤد صرف اس کے پُر اعتماد انداز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سب سے اچھے طریقے سے بات کر رہی تھی۔ اس نے کم از کم اپنے سرکل میں اتنی خوبصورت لڑکی کو اتنی بے تکلفی سے باتیں کرتے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے وہ پہلی ملاقات میں ہی اچھی لگی تھی اور باقی کسر دوسری ملاقات نے پوری کر دی تھی۔

☆☆☆

دوسری ملاقات غیر متوقع طور پر ایک کانسرٹ میں تھی اگرچہ وہ اسے اسکول میں دیکھ چکا تھا۔ ایک بار لائبریری میں اور دوسری بار ڈرامیٹک کلب کے پروگرام میں لیکن ان دونوں کے درمیان تب بھی براہِ راست کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

اس سے براہِ راست گفتگو کا موقع کانسرٹ پر ہی ملا تھا۔ موسیقی اس کا اور ممی کا مشترکہ شوق تھا اور یہ وہ واحد چیز تھی جس میں ان کا اختلاف کم سے کم ہوتا تھا۔ پاکستان ڈے پر ایک جی میوزک کمپنی نے شہزاد رائے کو مدعو کیا ہوا تھا۔ کمپنی نے زیادہ منافع کے چکر میں ٹکٹس زیادہ بیچ ڈالیں تو لوگ ضرورت سے زیادہ ہو گئے اور انتظام نہایت ناقص۔ جس کی وجہ سے سارا ایونٹ فلاپ ہو گیا۔ میوزک کمپنی نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے ایک متبادل موسیقی کا پروگرام منعقد کیا تھا ممی نے خصوصی طور پر دو پاس حاصل کیے تھے اور ساتھ ہی اس کے سامنے اس پروگرام کی اتنی ہائپ پیدا کر دی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ وہاں پہنچے گا تو کوئی بہت ہی شاہی قسم کے پروٹوکول والا پروگرام ہو گا اور بہت مزا آئے گا۔ شہزاد رائے ان کے فرمائشی گانے دو دو بار سنائے گا پھر وہ کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر ان سے میوزک کو ڈسکس کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اس کو اپنا فون نمبر بھی دے دے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

وہاں پہنچنے پر پتا چلا کہ شہزاد رائے نے تو آنا ہی نہیں تھا۔ ایک دو انڈین اور پاکستانی سنگرز کے علاوہ سب عربی گانے والے تھے۔ منتظمین نے علاقائی پبلک کے ذوق کے مطابق پروگرام رکھا تھا۔ داؤد کی دلچسپی وہیں ختم ہو گئی تھی لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ ممی نے عین وقت پر اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ وہ اسے وہاں چھوڑ کر اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی تھیں اور ڈیڑھ گھنٹے بعد اسے پک کرنے کے لیے آنے والی تھیں۔ سو وہ وہیں بیٹھنے پر مجبور تھا۔ اسی دوران اس کے ساتھ والی کرسی پر کوئی آ بیٹھا۔

''کیسے ہو داؤد؟'' دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ داؤد نے سامنے اسٹیج سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ وہ اسے فوراً پہچان گیا تھا لیکن یہ ہضم کرنے میں اسے چند لمحے لگے تھے کہ وہ لڑکی اس کا نام یاد رکھے ہوئے تھی۔ اسے اچھا لگا۔

''ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟'' وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

''اتنی بوریت میں کوئی کیسے ٹھیک رہ سکتا ہے۔ میں تو بالکل نہیں ہوں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔ داؤد مسکرایا پھر اس نے سوچا کہ اسے اگلا جملہ کیا بولنا چاہیے۔ اجنبی لوگوں سے جلدی بے تکلف ہو جانے والی عادت نہیں تھی۔ اور وہ ہمیشہ ہی گفتگو کے موضوعات میں کمی کا شکار رہتا تھا۔ اس نے اگلا جملہ کافی سوچ سمجھ کر ترتیب دیا تھا۔ ''تمہیں میوزک نہیں پسند؟''

''پسند ہے۔ لیکن ڈیڑھ سو صدی پرانا میوزک نہیں۔ میں تو شہزاد رائے یا جواد احمد کا سوچ کر آئی تھی۔ یہاں جبار بن سلمان مل گئے۔ انہیں حبیبی حیاتی کے علاوہ کوئی گانا ہی نہیں آتا۔ مجھے تو اکتاہٹ کی وجہ سے بھوک ہی لگ گئی ہے۔'' وہ سادگی سے بتا رہی تھی۔

''مجھے بھی۔'' وہ چونکہ اتنی بے تکلفی سے بات کر رہی تھی تو داؤد بھی کسی قدر پُر سکون ہو کر اس سے بات

کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی طرف مڑی۔
''تو پھر تم یہاں بیٹھ کر وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ پزا آرڈر کرتے ہیں۔''
داؤد نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''پزا؟ لیکن کیسے؟'' پزا کا خوش کن خیال کافی سحر انگیز تھا۔
''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' اس نے کچھ دیر سوچا پھر کندھے اُچکا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔
باہر آ کر اس نے کندھے سے لٹکے چھوٹے سے بیگ کی زِپ کو کھولی اور موبائل باہر نکال لیا۔ داؤد تو حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔
''تمہارے پاس موبائل ہے؟'' وہ واقعی حیران تھا۔ اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
''اس میں کیا بڑی بات ہے۔''
''بڑی تو پتا نہیں۔ لیکن امپریسو ضرور ہے۔ میری ممی تو یونیورسٹی سے پہنے فون لے کر دینے کو تیار نہیں ہیں۔'' داؤد نے بتایا۔
''کسی کی ممی بھی نہیں ہوتیں۔ انہیں تیار کرنا پڑتا ہے۔ محنت لگتی ہے اس کام میں۔ میں نے لاسٹ ائیر میں نے ایک مال میں کیش کاؤنٹر پر جاب کی تھی۔ ویکلی ویجز پر۔ اسی کے پیسوں سے خریدا تھا یہ۔'' وہ اپنا نوکیا کا موبائل سیٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہی تھی پھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے پزا ہٹ کال کر دی تھی۔ پندرہ منٹ بعد لان میں لگے سنگِ مرمر کے بینچ پر بیٹھے وہ دونوں پزا کھا رہے تھے۔ داؤد درمیان میں کن انکھیوں سے اس کا جائزہ بھی لیتا رہا۔
آج جینز میں سیاہ ٹی شرٹ پہنے بالوں کی اونچی سی پونی بنائے وہ اس دن سے زیادہ پُراعتماد اور حسین لگ رہی تھی اور چونکہ آج اس سے بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی تو اس دن سے اچھی بھی زیادہ ہی لگی۔
''شکر ہے، تم یہاں مل گئے ورنہ میں تو بوریت سے فوت ہونے والی تھی۔'' وہ اس کی شکر گزار ہو رہی تھی حالانکہ یہ کہنا داؤد کو چاہیے تھا۔ اس کے کسی دوست نے بھی اس کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد اتنے خلوص سے شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔
''مجھے اندازہ تھا کہ ہم بہت بور ہونے والے ہیں اور میں نے ماما سے کہا بھی تھا کہ مجھے نہیں جانا۔ لیکن وہ مجھے گھسیٹ لائیں۔ دراصل انہیں میوزک کا جنون ہے اور میرے ڈیڈی ابو ظہبی گئے ہوئے ہیں۔ ان کی کوئی ٹریننگ ہے تو میں اور میرا بھائی گھر پر اکیلے تھے اور ماما کو پتا تھا ہمیں اکیلا چھوڑنے کا مطلب ہے ورلڈ وار تھری، سو وہ ہمیں زبردستی ساتھ لے آئیں اور اب وہاں بیٹھی اپنے زمانے کے گانے سن رہی ہیں جبکہ بھائی ان کی ساتھ والی کرسی پر سویا پڑا ہے۔''
وہ اسے بتانے لگی۔ اس کے انداز میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ وہ اس کی کلاس فیلوز سے مختلف تھی۔ داؤد کو اس کی موجودگی، اس کی گفتگو سب اچھا لگ رہا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی کوئی لڑکی دوست نہیں تھی اور کلاس فیلوز کے علاوہ اسے کسی دوسری لڑکی سے بات کرنے کا تجربہ نہیں تھا اس لیے ہر کی یہ ادا اسے حوصلہ دے رہی تھی۔
''آئی ایم شیور۔ تمہیں بھی تمہارے پیرنٹس میں سے کوئی کھینچ لایا ہوگا؟'' وہ پزا کا بائٹ لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ لفظ پیرنٹس پر وہ خاموش رہا۔ آج تک اس کے دوست وہی رہے تھے جو پہلے سے اس کی ممی کو جانتے تھے۔ ان سب کو پتا تھا وہ سنگل مدر کا بیٹا ہے۔ داؤد کو آج تک کسی کو اپنے منہ سے بتانا نہیں پڑا تھا۔
''مجھے کوئی کھینچ ونچ کر نہیں لایا۔ میں تو اپنی مرضی سے ہی آیا تھا۔ مجھے میوزک میں کافی انٹرسٹ ہے۔ میں بہت اچھا پیانو بجا لیتا ہوں۔''

وہ بتا رہا تھا۔ یہ بات خواہش کے باوجود اس نے کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ کسی کو بھی بتائے گا تو پھر کمی والا جملہ ہی سننے کو ملے گا کہ تمہارے شوق ہی تمہارے موٹاپے کی وجہ ہیں۔ اب وہ کیا کرتا اسے بیٹھ کر کرنے والے کام بھاتے تھے۔

''رئیلی۔ دیٹس گریٹ۔ تم تو بہت ٹیلنٹڈ ہو۔'' وہ سراہ رہی تھی۔ داؤد جھینپ گیا۔

''پہلے مجھے بجاتا دیکھ تو لو۔ کیا پتا، میں جو کہہ رہا ہوں۔ وہ سچ نہ ہو۔'' اس نے خوامخواہ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے یقین ہے، تم سچ کہہ رہے ہو۔ تمہیں جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں ہوگا۔'' وہ بے پروا سے انداز میں بولی پھر مزید کہنے لگی۔

''کیوٹ لڑکوں کو جھوٹ ووٹ بولنا نہیں آتا۔ مجھے پتا ہے۔'' اب کی بار تو داؤد بالکل ہی شرما گیا جبکہ وہ بے پروائی سے بولی تھی۔

''تم مجھ سے دوستی کرو گے۔ مجھے ٹیلنٹڈ لڑکوں سے دوستی کرنے کا بہت شوق ہے۔'' داؤد کو اپنی سماعت پر یقین نہیں ہوا۔ اسے تو آج تک کسی نے ایسے دوستی کی پیشکش کی ہی نہیں تھی۔

''اور میں تو کیوٹ بھی ہوں۔'' وہ ہنسا تھا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔

فرینڈز۔؟'' استفہامیہ انداز میں ہاتھ اس کے آگے کرتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی۔

''فرینڈز۔'' داؤد نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنا ہاتھ آگے کر دیا تھا۔

اسکول کا اگلا دن بہت پُرجوش تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے پاس موجود چیزوں میں سے کوئی اچھی سی چیز بطور تحفہ مہر کو دے گا۔ اس کے پاس ہمیشہ ہی رنگین ڈائریز کی ایک بڑی کلیکشن موجود رہتی تھی۔ اس نے اس میں سے ایک بہترین ڈائری نکال کر بیگ میں رکھ لی تھی پھر اسے یہ تحفہ کچھ ادھورا سا لگا تو اس نے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ بھی ساتھ رکھ لیا۔ سونے سے پہلے چھوٹا سا کارڈ بنایا اور پھر اس پر فرینڈز فور ایور لکھا لیکن کچھ دیر بعد ہی اسے وہ کارڈ چھچھورے پن کی انتہا لگا تو اس نے اسے دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ صبح اٹھا تو وہ چاکلیٹ بھی نامناسب لگی تو وہ بھی رہنے دی۔

''اس نے پہلے ہی کہا تھا اسے ایلیمنٹری اسکول کے لڑکوں جیسی حرکتیں کرنے والے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔'' یہ خیال آتے ہی وہ ڈائری جو بہت سوچ بچار کے بعد منتخب کی تھی، وہ بھی واپس دراز میں رکھ دی۔

وہ اسکول پہنچا تو گیٹ سے لے کر کلاس روم تک اس سے ملنے کا خیال ہی ذہن پر چھایا رہا۔ اپنی عادت کے برخلاف اس نے راستے میں ملنے والے سب کلاس فیلوز سے مسکرا مسکرا کر علیک سلیک کی، کلاس روم میں بھی اس کا موڈ اچھا ہی رہا۔ وہ ذرا لیٹ آئی تھی لیکن آتے ہی اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ہیلو بولا تھا۔ ساری کلاس نے یہ منظر دیکھا اور یوں وہ باقاعدہ دوست بھی ڈکلیئر ہو گئے۔

یہ نوجوانی کا وہ دور تھا جب دوستیاں زندگی موت سے بھی زیادہ قیمتی لگا کرتی ہیں۔ دوست ماں باپ سے زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے چلے گئے۔ چند دن بعد زوہیب اور مہر کے بھائی عمر نے بھی ان کے گروپ میں شمولیت اختیار کر لی اور یوں اس دوستی میں مزید استحکام پیدا ہو گیا۔ داؤد کی ممی اس ساری صورتحال سے کافی خوش تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں، داؤد کی کاہلی دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایکٹو رہنے لگا تھا۔ کسی پارٹی اور گیدرنگ میں جاتے ہوئے پہلے کی طرح اعتراض نہیں کرتا تھا۔ اس کے نئے دوستوں کے پیرنٹس کو وہ پہلے سے جانتی تھیں اس لیے وہ مطمئن تھیں اور کم تو داؤد بھی نہیں تھا۔ اب اسے فرمان کے گینگ کی پروا نہ رہی تھی۔ اس کے پاس فرمان، خلود اور فروا کی نسبت زیادہ اچھے دوست تھے۔ زندگی

میں موٹاپا تو کم نہیں ہوا تھا لیکن موٹاپے کی وجہ سے اس کا مذاق اڑانے والے لوگ کافی کم ہو گئے تھے۔ یہ سب ایسے ہی چلتا رہتا اگر وہ واقعہ نہ ہو جاتا۔

ممی ایک ریفریشر کورس کے لیے قطر جا رہی تھیں۔ یہ ایک دن کا ٹرپ تھا۔ انہوں نے صبح جانا تھا اور شام کو واپس آجانا تھا۔ ان سے اجازت لے کر اس روز داؤد نے اپنے دوستوں کو گھر پر انوائٹ کر لیا۔ وہ لوگ کام وغیرہ کے سلسلے میں پہلے بھی آتے رہتے تھے۔ ذوہیب اس سے کتابوں کا تبادلہ کرتا رہتا تھا جبکہ مہر کو کبھی کسی پروجیکٹ کے لیے کچھ ڈسکس کرنا ہوتا یا پھر عمر کو کمپیوٹر میں مدد کی ضرورت پڑتی تو وہ داؤد کے پاس آجاتے تھے لیکن اس طرح باقاعدہ کسی نے کسی کو انوائٹ نہیں کیا تھا۔ ممی نے جو وقتی ملازمہ کو کچھ ایکسٹرا درہم دے کر شام تک رُکنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ اسنیکس اور کولڈ ڈرنک باہر سے منگوانے کا ارادہ تھا۔ داؤد نے مہر کے پسندیدہ گانے کے نوٹس اور بیٹس کی پریکٹس کی تھی تاکہ وہ انہیں پیانو پر بجا کر سنا سکے۔ سب کچھ بہت اچھے طریقے سے پلان کر لیا گیا تھا لیکن عین وقت پر سب کچھ اندازوں کے برعکس ہو گیا۔

☆☆☆

ماسی حبیبہ پندرہ منٹ بعد اس کے ناشتے کی ٹرے سجا کر کمرے میں ہی دے گئی تھی اور نصف گھنٹے بعد چراغ کے جن کی طرح برتن اٹھا کر بھی لے گئی تھی۔ اس سے کچھ پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اسے کچھ بتانا ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ اونچا سنتی تھی اور اس سے بھی زیادہ اونچا بولتی تھی۔ اس سے کچھ اگلوانے کا مطلب تھا کہ ساری حویلی کو اس جاسوسی کی خبر ہو جاتی جو وہ چاہتا نہیں تھا جبکہ گلے نے احسان فراموشی کی حد کرتے ہوئے اس کے کمرے میں جھانکنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ جبکہ بے چینی اور تجسس سے اس کا برا حال تھا۔ اسی لیے گلے کے رویہ سے مایوس ہو کر اس نے دل ہی دل میں حویلی کے دوسرے مخبرین سے رابطہ کرنا شروع کیا تھا۔ زنان خانے کی طرف جانے کا اس کا ارادہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنے کمرے سے نکل کر دائیں جانب والے حصے کی طرف آگیا۔

یہ حویلی کا صحن تھا۔ یہاں پہلے پہل پنچایت کا پنڈال بھی سجا کرتا تھا پھر کسی بات پر ناراض ہو کر خان بابا نے اس حصے کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دینا بند کر دی تھی۔ اب یہاں وراثت اپنے تیرہ سالہ بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے خاندان کے باقی افراد تو افغانستان میں کہیں رہتے تھے لیکن وہ اپنے بھائی کے ہمراہ روزگار کی وجہ سے یہاں مقیم تھا۔

وراثت خان بابا کا دستِ راست تھا اور وہ کبھی بھی ایسی کوئی بات اسے نہیں بتاتا تھا جو خان بابا چھپا کر رکھنا چاہتے تھے لیکن رحمت بچہ تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ باتوں باتوں میں ضرور کچھ اگل سکتا ہے۔ رحمت اپنے کمروں ہی کے اگلے والا چھوٹا سا برآمدہ دھو رہا تھا اور دونوں کمروں کا سامان باہر رکھا تھا۔ چارپائیوں اور ٹرنک کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے وہ اس کے قریب آگیا۔ چھوٹے سے باورچی خانے کو بھی فارغ کر دیا گیا تھا۔ وہاں کچھ نیا سامان بھی رکھا نظر آرہا تھا۔

''کیا کر رہے ہو رحمت۔ یہ صبح صبح کس خوشی میں اپنی کچھار کو غسل دیا جا رہا ہے؟'' رحمت اس کی بات سُن کر ہنسا۔ خوشحال خان اسے شیر اور اس کے کمرے کو کچھار کہا کرتا تھا۔

''ام کو کیا معلوم لالا۔ بڑا خان بولا، کمرے فارغ کر دو اور فرش کو چمکا دو۔ یہاں اب مہمان رہے گا۔''

''مہمان۔ کون مہمان؟'' رحمت کی بات نے اس کا پارہ مزید چڑھا دیا تھا لیکن اس نے ناگواری کا اظہار کیے بنا پوچھا۔ اسے ''مہمان'' کا پتا تو تھا لیکن رحمت سے مزید رپورٹ لینے کی خاطر اداکاری کر رہا تھا۔

''ام کو کیا معلوم لالا۔ کوئی لڑکی لوگ اے۔ خان بولا۔ شہر سے آیا ہے۔ اس کو شکایت نہ ہو کہ ہری حویلی کے لوگ مہمان کو گندے کمرے میں رکھتا ہے۔ آپ دیکھو۔ ہم نے بہت اچھے سے صاف صفائی کیا ہے۔'' وہ

معصومیت سے بتاتے ہوئے اسے پیشکش کررہا تھا۔اسے احساس نہیں تھا کہ چھوٹے خان کو یہ سب بہت بُرا لگا ہے۔

''میں کیوں دیکھوں۔جس نے رہنا ہے،خود ہی آکر دیکھ لے۔اور بتادینا خان بابا کو۔اس کے مہمان کو زمین پر رینگتی چیونٹیوں اور ہوا میں اڑتی تتلیوں سے بھی شکایت رہتی ہے۔اور یہ بھی کہہ دینا کہ بٹگرام کے خان اس نے لیے چیونٹیوں اور تتلیوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔''

وہ ناک چڑھا کر بولا اور پھر مزید کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔رحمت نے ہنسنے پر اکتفا کیا۔چھوٹے خان کی طبیعت سے وہ بخوبی واقف تھا۔وہ انگریزی اردو میں ایسی ہی ہنسنے والی باتیں کیا کرتا تھا جس میں سے زیادہ تر اس کے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔

☆☆☆

''ام کو معاف کردو۔ام ذرا مصروف تھی۔لاریب کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔اس کے پاس بیٹھی رہی۔تم کو تو پتا اے،وہ پہلی بار حویلی آئی اے۔'' گلے دوپہر کے بعد اس کے لیے کھانا لائی تھی تو اس کا ناراض چہرہ دیکھ کر بولی۔

''اچھا کیا۔جاؤ وہیں جا کر بیٹھو۔کوئی ضرورت نہیں مجھ سے بات کرنے کی۔'' وہ ناراض لہجے میں بولا تھا۔گلے ہنسی۔

''خوشل خان!تم ناراض بہت جلدی ہوتے ہو۔ابھی مہمان کو دیکھنا بھی تو ضروری ہے۔''

وہ کافی مطمئن اور مسرور لگ رہی تھی اور گزشتہ روز والی پریشانی اس کے چہرے سے غائب ہوچکی تھی۔وہ اس بات سے چونکا ضرور مگر فی الحال گلے سے نخرے اٹھوانا چاہ رہا تھا،اس لیے کچھ نہیں بولا بلکہ ہاتھ میں پکڑا موبائل چہرے کے بالکل سامنے کرلیا۔

وہ یونیورسٹی کے پیجز چیک کررہا تھا کہ شاید کوئی خیر خبر مل جائے مگر وہاں سناٹا چھایا تھا۔

''لاریب کو سخت بخار اے۔ڈاکٹر نے بولا اس کا بہت خیال رکھو۔خان بھی کافی پریشان رہا رات بھر۔اس لیے ام نے اسے اپنے کمرے میں سلالیا۔'' وہ خود ہی وضاحت دے رہی تھی۔اس نے منہ پھلا کر اسے دیکھا۔

''مجھے کیوں سنا رہی ہو یہ راگ درباری۔خان آج پریشان ہے۔کل تم پریشان تھیں اور وہ محترمہ تو خود ہی سب سے بڑی پریشانی ہیں۔میرا کیا واسطہ تم لوگوں سے۔جاؤ سنبھالو اپنی سلطنت اور شہزادی لاریب کو۔'' وہ پوچھنا تو یہ چاہتا تھا کہ وہ محترمہ یہاں لائی کیوں گئی ہیں لیکن براہِ راست پوچھنا نہیں چاہتا تھا

''ام کل پریشان نئیں تھا۔ڈر گیا تھا۔ام کو تمارا باپ سے بہت محبت اے۔ہم اسے کسی کے ساتھ بانٹ نئیں سکتا خوشل خاناں!''

اسے اگر پتا ہوتا کہ اس کے سامنے بیٹھے شخص کو اس کی باتیں بالکل اچھی نہیں لگ رہیں تو وہ چپ رہتی لیکن اس معصوم کو سمجھ کب تھی۔

''تم کو نئیں پتا۔تم مرد ہے لیکن سوکن بہت بھاری چیز ہوتی اے خوشل خان۔ہم نے اپنی پھوپھی کو دیکھا تھا۔اور دادی کو بھی۔آنکھوں سے آنسو کی جگہ خون ٹپکاتی تھیں دونوں۔دونوں کو سوکن کا دکھ کھا گیا تھا۔'' وہ لہجے میں زمانے بھر کی لاچاری سمو کر بول رہی تھی۔اس نے موبائل کو چہرے سے ذرا سا پرے کیا اور اسے گھورا۔

''ہاں تب ہی وہ نوے نوے سال کی عمر میں اوپر تشریف لے گئی تھیں۔جن کو دکھ کھاتے ہیں نا۔وہ زمین پر اتنا لمبا قیام نہیں کرتے گلے جان۔مجھے اچھی طرح پتا ہے،تمہاری دادی کو کتنا دکھ تھا۔تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دادی اپنی چچازاد کو اس لیے بیاہ کر لائی تھیں کہ ان سے تمہارے دادا کی روٹی نہیں پکتی تھی۔اور تمہاری پھوپھی نے خود اپنے شوہر کی دوسری شادی ایک امیر لڑکی سے کروائی تھی تاکہ آنے والی سوکن کی جائیداد پر قبضہ

کر سکے۔"
اتنا کہہ کر اس نے پھر موبائل چہرے کے سامنے کر لیا۔ گلے کو ہمیشہ کی طرح اس کی بات کو مکمل طور پر سمجھنے میں ذرا وقت لگا اور پھر جب بات سمجھ میں آ گئی تو بدکنا لگا۔
"دئی وئی۔ تم کتنا ظالم اے۔ اور مکار بھی۔ جھوٹی کہانیاں گھڑتا اے۔ ام تمارے ساتھ اپنا غم بانٹنے کے لیے آئی تھی۔ لیکن تم کو احساس ہی نئیں اے۔"
"مکار تو تم خود ہو۔ میرے نیک برگزیدہ باپ پر الٹے سیدھے الزامات لگاتی ہو۔" وہ جتا کر بولا۔ گلے ہنسی پھر بولی۔
"میں کیا کرتی۔ میں نے شادی کی بات سنا تو یہی سمجھا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔" اب کی بار اس نے موبائل چہرے کے سامنے سے بالکل ہٹا لیا۔
"تو کیا اب وہ شادی نہیں کر رہا؟" اس کے منہ سے یہ جملہ خود بخود پھسلا تھا۔
"نئیں۔ ام کو غلط فہمی ہوا تھا۔" گلے شرما کر بولی تھی۔ اس نے ناک چڑھا کر اسے گھورا۔
"گلے! تم ماسی حبیبہ بنتی جا رہی ہو۔ سنتی کچھ ہو، سمجھتی کچھ ہو۔ اور بولتی کچھ اور ہو۔ میرا مشورہ مانو تو خان بابا کے ساتھ شہر جا کر کانوں کی دوائی لے آؤ۔"
وہ گلے کی بات سن کر کسی حد تک مطمئن ہو گیا اس لیے اپنی جون میں لوٹنے لگا۔ اب تجسس کی دوسری وجہ اکسانے لگی تھی۔ گلے کو اس کی بات کا جواب ہنستے ہوئے دینے کی عادت تھی لیکن اس بات نے اسے ذرا ڈرا دیا۔ وہ دوائی کھانے سے بہت گھبراتی تھی۔ اس نے فوراً انکار میں گردن ہلائی تھی۔
"نئیں نئیں۔ ام بیمار نئیں اے۔ کان ٹھیک ہے ہمارا۔" وہ وضاحت دے رہی تھی۔
"اچھا بھئی، مان لیا۔ اب یہ تو بتا دو۔ وہ محترمہ کیوں تشریف لائی ہیں۔" یہ وہ سوال تھا جو وہ گلے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھنا چاہتا تھا۔
"یہ تو نئیں بتایا خان نے۔ بس اتنا بولا کہ ابھی وہ یہاں حویلی میں رہے گا۔" وہ سادہ سے لہجے میں بتا رہی تھی اور اس کا صبر جیسے ختم ہوا جا رہا تھا۔
"کیوں گلے۔ یہاں کیوں..... اور پھر..... یہاں کیسے رہ سکتی ہے وہ..... یہاں تو.....؟" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ گلے کو بہت سی باتیں پتا نہیں تھیں اور پتا تو شاید اسے بھی نہیں تھیں بس مفروضے قائم کر رکھے تھے اس نے۔
"ام نئیں جانتا خاناں۔ بس تمارا ابا نے اتنا ای بتایا کہ وہ یہاں رہے گی۔"
"یہ نہیں ہونا چاہیے گلے۔ اسے نکالو یہاں سے۔ یہ مار ڈالے گی مجھے۔" وہ کہہ نہیں پایا۔ اسے لگا وہ اسی چوٹی پر بیٹھا ہے جہاں سے خواب میں لاریب نے اسے دھکا دیا تھا۔

☆☆☆

"خوش الحان خان۔" ہری حویلی میں اس کو اس کے صحیح نام سے پکارنے والا ایک ہی شخص تھا اور یہ وہ آواز تھی جو شاذ و نادر ہی وہ سن پاتا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھا۔ دروازے پر دستک دس منٹ پہلے بھی دی گئی تھی جو اس نے نظر انداز کر دی تھی۔
"خان۔ آپ جاگ رہے ہیں؟"
انگلی سے دستک دینے کے ساتھ اس کا نام پکار کر پوچھا گیا تھا۔ یہ رحمت کی آواز تھی۔ اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اپنی طرف سے وہ سب سے ناراض تھا۔ اس نے پورا دن نفتیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن

اسے کچھ پتا نہ چل سکا تھا اور جب پتا چل گیا تھا تب بھی بیزاری ہونے لگی تھی۔ تھک ہار کر اس نے ہر چیز اللہ کے حوالے کر کے اپنا پسندیدہ "منی پائنٹ" کا حالیہ سیزن ڈاؤن لوڈ کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے خوب ساری چینی اور کریم ڈال کر عمدہ قسم کی کافی تیار کی تھی، چپس کا بڑا والا پیکٹ کھولا تھا اور لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ رحمت نے دو بار دروازے کے باہر سے ہی اپنا سوال دہرایا تھا لیکن جواب نہ پا کر وہ واپس چلا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد دوبارہ دستک دی گئی تھی اور اس نے اب بھی پروانہ کی تھی کہ شاید رحمت ہی ہوگا مگر جب اس کی مکمل اور صحیح نام پکارا گیا تو سب سے پہلے لیپ ٹاپ بند کیا۔ کافی کے کپ کو بیڈ کے نیچے کر دیا اور ابھی چپس کا پیکٹ دراز میں رکھ ہی رہا تھا کہ خان بابا اندر آ گئے۔

"السلام علیکم بابا۔ آپ مجھے بلا لیتے۔" اس نے مؤدب انداز میں کہا اور فٹافٹ بستر سے اتر آیا۔

"تم جاگ رہے تھے؟" وہ تصدیق کرنا چاہ رہے تھے۔

"جی بابا۔" اس نے اتنا ہی کہا۔ اور کہتا بھی کیا۔ بابا سے کہنے سننے کے لیے اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہمیشہ ناکافی رہتا تھا۔ ساری دنیا کو زبان سے چت کر دینے والا خوش الحان خان اپنے باپ کے سامنے گونگوں جیسا ہو جایا کرتا تھا۔

وہ چند قدم چل کر عین کمرے کے وسط میں اس کے بالمقابل آ گئے۔ وہ سرخ و سفید رنگت اور مضبوط تن و توش کے مالک تھے۔ سارے بنگرام میں خوش الحان کو اتنا ہینڈسم آدمی کوئی اور نہیں لگتا تھا جتنا کہ خان بابا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ بہت خوش قسمت ہے جو اس کے بابا خان بابا ہیں۔ اور اسے خان بابا سے محبت بھی بڑی تھی لیکن اس کے اظہار کا کبھی موقع نہ مل سکا تھا کیونکہ ان کے درمیان میں شروع سے "وہ" موجود تھی۔

ان کے وجود سے وہی اطمینان جھلکتا تھا جو ان کا خاصا تھا لیکن ان کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح مضطرب تھیں۔ خوش الحان کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا کیونکہ بابا کا اس طرح اس کے کمرے تک چل کر آنا کسی غیر معمولی صورتحال کی نشان دہی کر رہا تھا لیکن اس نے پوچھا نہیں۔ وہ بس سر جھکائے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

"خیریت عافیت سے ہو؟" انہوں نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"جی بابا۔" اس نے کہنے کے ساتھ اثبات میں گردن بھی ہلائی تھی۔

"پڑھائی اچھی جا رہی ہے؟"

"جی بابا۔" ان کے سامنے ہمیشہ یہی انداز رہا تھا اس کا۔

"تم آنرز کر لو۔ تو تمہیں یو ایس بھجوا دوں گا۔ باہر سے لی گئی ڈگری انسان کا قد و قامت بڑھا دیتی ہے۔"

وہ مڑے اور بیڈ کے سامنے دھرے دیوان پر جا بیٹھے۔ خوش الحان کو تو سکتہ ہونے والا ہو گیا۔ وہ کبھی اس کے کمرے میں اس طرح بیٹھنے کی غرض سے نہیں آئے تھے۔ بیٹھنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

سال دو سال بعد وہ چار جملے جو انہوں نے ابھی بولے تھے یہی جملے کھڑے کھڑے ادا ہو جایا کرتے تھے۔

"یہاں آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔" وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کو کہہ رہے تھے۔

"جی بابا۔" اس نے حیرانی سے چور لہجے میں کہا، گزشتہ بار جب انہوں نے اس طرح اسے اپنے قریب بٹھایا تھا تو چند کاغذات پر دستخط لیے تھے۔ اس کی مری ہوئی ماں کے حصے میں آنے والی جائیداد کو اس کے نام منتقل کیا گیا تھا اور یہ بھی تقریباً دو سال پرانی بات تھی۔ وہ ان کے قریب جا بیٹھا۔

"جی بابا۔" اس کے تیسری بار اس طرح انتہائی فرماں برداری سے کہنے پر ان کی آنکھوں میں چمک سی آئی لیکن وہ چھپا گئے۔ وہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتے رہے پھر انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''کل تمہارا اور لاریب کا نکاح ہے۔'' ان کا لہجہ اس قدر نرم تھا لیکن اسے تو جیسے پتھر کی طرح لگا۔ وہ جو بہت محبت سے ان کے قریب آ بیٹھا تھا بدک کر پیچھے ہٹا۔

''جی بابا؟'' اس کی آنکھیں پھٹنے والی ہوگئی تھیں۔ یہ فرماں برداری والا ''جی بابا'' نہیں تھا۔ یہ تحیر تھا۔

وہ جو کہہ رہے تھے، وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے تھے۔

کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ لاریب کون ہے۔ کیا ہے؟

وہ یقیناً جانتے تھے اور خوش الحان بھی۔

☆☆☆

یہ ابھی چھٹیوں سے ہفتہ بھر پہلے کی بات تھی۔

''یہ لاریب تمہاری کون ہے؟ دوست ہے؟''

وہ کلاس کے بعد آڈیٹوریم سے نکل کر سرروف کے آفس کی طرف جا رہے تھے جب شاکر نے پوچھا تھا۔ لاریب یونیورسٹی میں مقبول تھی لیکن خوش الحان سے ایسا سوال پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس نے چونک کر شاکر کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایسے کیوں پوچھ رہا تھا۔ شاکر کی مدھم آواز میں تجسس نہیں حیرانی تھی اور ناپسندیدگی بھی، جیسے وہ لاریب کے ساتھ اس کے تعلق پر ناخوش ہو۔ لاریب نے اگرچہ اپنی حرکتوں سے کسی کو بھی خوش ہونے کا موقع دیا بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی خوش الحان کو یہ سوال اچھا نہ لگا۔

یونیورسٹی میں ایک لڑکی کے ساتھ اس قدر مشکوک انداز میں اس کا نام لیا جا رہا تھا۔ دوست اس کی کئی ایک تھیں لیکن افیئر اس کا کسی کے ساتھ نہیں تھا یہ بات اس کے سب دوست جانتے تھے۔ شاکر کا اس انداز میں یہ سوال اسے سلگانے کو کافی تھا۔

''میں تمہیں دس سال سے جانتا ہوں خوش۔'' دوست بے تکلفی میں اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔

''میں نے آج تک کبھی تمہارے بارے میں ایسی بات نہیں سنی۔ جیسی اب سن رہا ہوں۔ اس لڑکی سے دور رہو۔ تم کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤ، یہ منظور نہیں ہے مجھے۔''

آڈیٹوریم کی سیڑھیاں اترتے ہوئے خوش الحان نے اپنی کھوپڑی کو گھومتا ہوا محسوس کیا تھا۔

''تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اچھی لڑکی ہے وہ۔''

''اچھی لڑکیاں ڈرگز نہیں لیتیں۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

''ڈرگز؟ وہ ڈرگز لیتی ہے؟'' اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ اسے تو پتا ہی نہ چل سکا تھا۔

''میں نے دیکھا نہیں ہے۔ لیکن سنا ہے کہ لیتی ہے۔ یہ بات بہت سے لوگوں کے منہ سے سنی ہے میں نے۔ اور فرض کرو نہیں بھی کرتی۔ اس کے باوجود وہ لڑکی ایسی نہیں ہے کہ اسے اپنے سرکل میں شامل کیا جائے۔ دور رہو اس سے۔'' وہ پہلے بھی اسے اسی طرح نصیحتیں کیا کرتا تھا لیکن اب جو نصیحت کر رہا تھا، اس پر عمل پیرا ہونا ناممکن تھا۔ اس نے اسی روز لاریب کو کال کی تھی۔

''تم ڈرگز لیتی ہو؟'' اس کے فون ریسیو کرتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

''تم میرے باپ ہو جو یہ سوال کر رہے ہو۔'' اس کی آواز میں ناگواری تھی اور انداز ہمیشہ کی طرح رعونت بھرا۔ خوش الحان کو بے حد غصہ آیا تھا لیکن وہ پی گیا۔ وہ تو ہمیشہ اسی انداز میں بات کرتی تھی۔

''میں خان بابا سے تمہاری شکایت کر دوں گا۔ میں تمہارا باپ نہیں ہوں لیکن ان کا دعوا ہے کہ وہ تمہارے باپ کے جیسے ہیں۔'' اس نے سمجھانا ضروری سمجھا تھا۔

''گو ٹو ہیل۔'' اس نے اتنا کہہ فون بند کر دیا تھا اور خوش الحان نے خان بابا کو یہی ساری بات بتا دی تھی۔

یہ معاملہ اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا کہ وہ اکیلے ہینڈل کر لیتا، سو نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ساری بات انہیں بتا دی تھی۔ اگلے دن وہ اپنی کلاس سے نکل کر لائبریری کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ اچانک اس کے سامنے آ گئی تھی اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کے تین چار دوست بھی تھے۔ اس کا راستہ روک کر اسے مخاطب لاریب نے کیا تھا۔

''تم ہماری دوست کو تنگ کرتے ہو۔ ہم تمہاری کمپلین کر دیں گے۔'' اس کے ایک دوست نے کہا جس کی آنکھ کے نیچے ایک ٹیٹو بنا ہوا تھا۔

''کر دو۔ آئی ڈونٹ کیئر۔'' داؤد نے سائیڈ سے ہو کر گزر جانا چاہا لیکن اسی لڑکے نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

''سالے ہیرو۔ یہ دادا گیری اپنے گاؤں میں دکھانا۔ یہاں مہذب لوگ پڑھنے آتے ہیں۔ یہاں رہنا ہے تو تمیز سے رہنا پڑے گا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ خوش الحان نے اس کے الفاظ پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی ساری توجہ اس لڑکے کے ہاتھوں پر تھی جن سے اس نے اس کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ خوش الحان نے اسے جملہ مکمل کرنے کا وقت دیا اور پھر اس کے ہاتھ کو کھینچ کر اپنے گریبان سے علیحدہ کیا اور زور سے ایک مکا اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ نازک سا لڑکا تھا۔ ہل کر رہ گیا۔ خوش الحان خان نے نہایت تحمل سے پہلے اسے ٹھیک سے کھڑا ہونے میں مدد دی پھر کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''تم نے گریبان پکڑا تھا۔ مجھ پر بدلہ لازم ہو گیا تھا۔ اور میرا مشورہ ہے کہ عزت پیاری ہے تو آئندہ کسی پٹھان کے گریبان کو ہاتھ نہ لگاتا۔ ہم کم بخت ایسی جرأت کرنے والے کے ہاتھ کاٹ دیا کرتے ہیں۔ میں نے مکا مار نے پر بات ختم کر دی۔ ہماری تمہاری دشمنی ختم۔ اب پیچھے ہٹ جاؤ اور مجھے اس سے بات کرنے دو جس سے عمر بھر کی دشمنی ہے۔''

وہ اب لاریب کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ان کے ارد گرد اب مجمع اکٹھا ہونے لگا تھا۔ وہ دو قدم چل کر آگے آئی۔

''تم نے اچھا نہیں کیا خوش الحان! لیکن اب تم دیکھنا۔ میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ میں تمہیں برباد کر دوں گی۔ یاد رکھنا۔''

وہ انگلی اس کے سینے کی طرف تان کر اسے متنبہ کر رہی تھی۔ ان دونوں کے تعلقات میں اس طرح دوبدو ہونے کا یہ موڑ پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی کبھی خوش الحان کی اس طرح کسی نے بے عزتی کی تھی۔ اس کے سب دوست بھی وہاں آ گئے تھے۔ یہ بظاہر دو گروپس کی لڑائی لگ رہی تھی جسے دوستوں نے مل جل کر سلجھا لیا تھا لیکن لاریب کے الفاظ وہ کبھی بھول نہ سکے تھے۔

اور اب اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھے شکستہ دل خوش الحان کو یہ واقعہ یاد آئے جا رہا تھا۔

''میں تمہیں برباد کر دوں گی خوش الحان۔ یاد رکھنا۔'' اس نے کہا نہیں تھا۔ اس نے کر دکھایا تھا۔

☆☆☆

''قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے۔'' لاریب نے مندی مندی آنکھوں کے ساتھ خان بابا کے بتائے ہوئے الفاظ دہرا دیے تھے۔ اس کے سامنے ایک قاری صاحب بیٹھے تھے، انہوں نے کاغذات کے ایک پلندے پر اس سے کچھ دستخط لیے، پھر دعا ہونے لگی۔

اس کے سر پر گلِ لالہ کا دیا ہوا سرخ دوپٹہ تھا جس میں سے عجیب سی مہک آ رہی تھی۔ اسے یہ مہک اچھی نہیں

لگ رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دوپٹہ کھینچ کر اتارے اور خود سے دور پھینک دے مگر کمرے میں دو تین مرد حضرات موجود تھے اور ان میں سب سے آگے خان بابا تھے۔ ان سے بھی وہ ڈرتی تو نہیں تھی مگر ان کی بات کا لحاظ تھا اسے۔ اس نے دیکھا، دعا کے مکمل ہوتے ہی خان بابا نے خوش الحان کو گلے لگایا تھا۔

''مبارک شاہ الکا تا سواوس وادہ کری۔ (مبارک ہو لڑکے! اب تم نکاح یافتہ ہو گئے ہو)'' اس کے کانوں نے یہ جملہ سنا مگر سمجھ نہیں پائی۔

''جی بابا۔'' خوش الحان نے سعادت مندی سے کہا تھا اور تب ہی لاریب نے سرخ ڈوپٹے کی اوٹ سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر جو رنگ تھے اور وجود پر جو کیفیت محسوس ہو رہی تھی، لاریب کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ وہ بھی اس سے محبت تو نہیں کرتی تھی اور اس نے تو یہ عندیہ نہیں دیا تھا کہ اس کا نکاح اس لڑکے سے کیا جائے۔ یہ تو اس کے باپ اور خان بابا کا مشترکہ فیصلہ تھا۔ کسی کے فیصلوں کی ذمہ داری وہ تو نہیں لے سکتی تھی۔ وہ فی الوقت تنہائی چاہتی تھی۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور بے چینی سے رگیں کھنچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے ڈوز چاہیے تھی اور فی الحال اس کے پاس سگریٹ تک نہیں تھا۔ اسے صرف یہ بے چینی تھی کہ اور کچھ نہ سہی مگر کہیں سے ایک سگریٹ ہی مل جائے۔

''تم پہلے بھی میری بیٹی تھیں اور ہمیشہ رہو گی۔ میں اس لڑکے کا باپ بعد میں ہوں پہلے تمہارا خان بابا ہوں۔''

خان بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ رکھا تھا۔ اس نے دیکھا، خوش الحان کا چہرہ بالکل مرجھا گیا تھا اور یہی اس کی خواہش تھی۔

☆☆☆

''خوش الحان! میری زندگی میں جب کبھی اثاثے ڈکلیئر کرنے کا وقت آئے گا تو میں سب سے اوپر تمہارا نام لکھوں گا۔''

خان بابا نے مسکراتے ہوئے اسے کہا تھا۔ وہ ان کے کمرے میں موجود تھا۔ نکاح اس کمرے میں پڑھایا گیا تھا جو صبح رحمت نے صاف کیے تھے۔ ایک کمرہ برآمدہ اور چھوٹا سا وہ کچن انہوں نے اپنی ''چہیتی'' کے لیے مختص کر دیا تھا۔ اپنی سگی اولاد کو ایک کمرہ دے رکھا تھا جبکہ اس کو پورا ایک پورشن دے دیا گیا۔ خوش الحان کے سب اثاثے اپنے نام کروا کے اب وہ اسے اپنا اثاثہ قرار دے رہے تھے۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

''تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔ مرد کی زندگی میں لاتعداد ایسے مقام آتے ہیں جہاں آنکھ بند کر کے چال چلنی پڑتی ہے۔ جہاں دل راضی ہوتا ہے نہ دماغ۔ لیکن ایسی چالیں ہمیشہ منافع بخش ثابت ہوتی ہیں۔ مجھے امید ہے یہ نکاح تمہارے لیے بے حد نفع بخش ثابت ہوگا اور مرد کا نفع صرف مال و دولت نہیں ہوتا۔ اچھے حسب نسب والی بہترین بیوی مرد کے لیے بہترین منافع ہوتی ہے۔''

''جی بابا۔'' وہ بولا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور اسے دکھ تھا۔ بے حد دکھ۔ اس کے باپ کو اس کے منافع سے غرض تھی۔ اس کا جو نقصان ہو چکا تھا، اس کا اندازہ نہیں تھا اور نہ وہ لگانا چاہتے تھے۔

''ایک بات یاد رکھنا۔ یہ شادی نہیں تھی۔ یہ صرف نکاح تھا۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''اور ان شاء اللہ۔ یہ صرف نکاح ہی رہے گا۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا تھا جبکہ وہ کہہ رہے تھے۔

''ابھی اس نکاح کے متعلق ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔ یہ خبر ہری حویلی سے باہر نہیں جائے گی۔ اور تم یونیورسٹی میں بھی اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ میں جب مناسب سمجھوں گا۔ سارے خاندان کو ولیمے کی دعوت

دے کر اس بات کی اطلاع دے دوں گا۔"

"جی بابا۔" اس نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتے رہے پھر مسکرائے تو نہیں لیکن آواز میں شگفتگی ڈھلی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ بے حد خوش ہیں۔

"تم اگر اس سے ملنا چاہتے ہو۔ تو مل سکتے ہو۔ یہ اجازت میں نہیں دے رہا۔ اللہ کی دی ہوئی ہے۔"

"جی بابا۔" اس نے پژمردگی سے کہا۔ آنکھیں جیسے بھر آئی تھیں۔ اسے اس شخص سے بہت محبت تھی۔ اتنی محبت کہ اگر وہ کہتا تو وہ اپنی کھال کے جوتے بنوالیتا۔ لیکن اس شخص نے اس کی کھال کے جوتے بنوانے کے بجائے اسے ہی جوتا بنا کر کسی اور کے پاؤں میں ڈال دیا تھا۔

"یہ ناقدری ہے بابا۔ اولاد کی اتنی بے حرمتی بھی جائز نہیں ہوتی۔" اس نے سوچا مگر کچھ نہیں کہا۔ وہ الفاظ جو ادا نہیں ہو پاتے ان کی کاٹ بے حد اذیت ناک ہوتی ہے۔ وہ خاموش تھا اور ایسی خاموشی قاتل ہوتی ہے۔

بعض اوقات فرماں برداری نظر آنے والی چیز فرماں برداری نہیں ہوتی۔ سعادت مندی بعض اوقات انتقام بھی ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆

وہ دھیرے سے دستک دے کر اذن کا انتظار کیے بنا کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ کمرے میں گلاب کے پھولوں کی مہک تھی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ دونوں ٹانگیں صوفے پر چڑھائے سر گھٹنوں میں دیے وہ پہلی نظر میں ہی مضطرب نظر آتی تھی۔ دستک کی آواز پر شاید اس نے سر بھی نہیں اٹھایا تھا۔ خوش الحان چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے اس قدر آگ نکل رہی تھی کہ لاریب نے بنا مخاطب کیے ہی سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھنا شروع کر دیا۔

"کیسی ہو لاریب؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ لہجے میں ملائمت تھی اور پروا بھی۔

"مجھے امید ہے کہ اب تم خوش ہو گی۔ تم نے جو کہا تھا..... کر دکھایا۔ ہو گیا میں تباہ۔" لاریب نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ گھٹنوں میں سر دے لیا۔ خوش الحان نے سامنے پڑی کرسی گھسیٹی اور اس کے بالکل سامنے رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔

"سر مت جھکاؤ کیونکہ جو بساط تم نے بچھائی ہے، اس پر جھکے ہوئے سر کے ساتھ چال نہیں چلی جا سکتی۔ سر اٹھا کر چال چلو۔ کیونکہ اب کھیل میں مزا آنے والا ہے۔ تمہارا مقابلہ اب ایک ایسے شخص کے ساتھ ہے جس نے سب کچھ ہار دیا ہے۔ اب تم ایک ہارے ہوئے شخص کی چال دیکھو گی اس لیے سر اٹھانا ہی پڑے گا۔ ورنہ تم ہار جاؤ گی۔

"اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لاریب نے سر اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ وہ چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔

"سر اٹھاؤ اور منہ دکھائی لے لو۔ امید ہے تمہیں پسند آئے گی۔" لاریب نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا پھر اسے ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اس کے گھٹنوں کے گرد بندھے ہاتھ نرمی سے کھول کر ایک ہاتھ پر وہ چیز رکھ دی جو جیب سے نکالی تھی۔ لاریب کے چہرے پر چمک آ گئی تھی۔

وہ ایک سگریٹ تھی۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

شازیہ الطاف ہاشمی

روزی

''ٹھاہ'' کی آواز کے ساتھ ہی میڈم روزی کا دماغ کھول اٹھا اور وہ لاؤنج سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے چہرے پر تناؤ تھا، سرخ رنگ کی ڈیزائنر ساڑھی میں ملبوس وہ غصے سے بے قابو ہو رہی تھیں۔ سرخ لپ اسٹک سے سجے ہونٹ، نفیس گالیاں بک رہے تھے۔ پچیس ہزار کا سیٹ، جس کا آج تیسرا

گلاس جان سے گیا تھا۔ان کی تو آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔

آصفہ دوپٹے کے پلّو سے ہاتھ صاف کررہی تھی اور ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔میڈم روزی جن کے بچے فرانس اور امریکہ میں سیٹلڈ تھے۔ فرفر انگریزی بولا کرتی تھیں مگر کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہ اس طرح کی گندی زبان بھی استعمال کرتی ہوں گی مگر وہ سن رہی تھی اور حیران بھی نہ تھی۔ان کا معمول تھا پچھلے ہفتے ان کے اپنے ہاتھ سے پہلا گلاس زمین بوس ہوا تھا۔ تو آصفہ کو گھورتے ہوئے بولیں۔

"جلدی سے فرش سے کانچ سمیٹ لے۔" اپنے ہاتھ سے ٹوٹے تو خاموشی اور ایسا اگر کسی دوسرے انسان سے ہوتو اس کی تنخواہ میں سے پیسے کٹیں گے۔روزی بیگم گلاسوں کی مالک ہیں اور وہ صرف گلاس دھودھو کر رکھنے والی ملازمہ،فرق ہے بڑا فرق ہے۔

آصفہ نے اپنے آنسو پونچھے اور کانچ اٹھانے لگی۔دور دور تک اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔روز اس کے لیے ایک جیسا ہی سورج طلوع ہوتا تھا اور اسی کی طرح تھکا تھکا غروب ہو جاتا تھا۔اوپر تلے چار بیٹیوں کی ماں تھی،خود اس نے پانچویں تک پڑھا تھا۔کتابیں چاہے خود وہ تھوڑی سی ہی پڑھ سکی تھی

مگر اتنا ضرور سیکھ گئی تھی کہ تعلیم سانس لینے جیسی ضروری،انسان کو انسان سمجھنا ہے۔بیٹی ہو یا بیٹا ہے تو اولاد ناں۔شوہر کراچی بھاگ گیا تھا۔جنگل جیسے شہر میں وہ اسے کہاں کہاں ڈھونڈتی پھرتی اور وہ بھاگ کر جاتی کہاں۔بیٹیوں کو چھوڑنا اسے منظور نہ تھا پھر کالونی ہی میں کام کرنے والی سکینہ خالہ نے اسے روزی میڈم کے بنگلے کی راہ دکھائی۔چوڑی کشادہ سڑک سایوں سے بھری پر اس کے لیے کہیں جائے امان نہ تھی۔چاروں بیٹیوں کو سرکاری اسکول میں داخل کروا کر جو پہلے ہولے ہولے سوچتی ہوئی چلا کرتی تھی۔زندگی کے پرخار راستے پر سرپٹ دوڑنے لگی۔

پرانے کپڑے، ہوائی چپل اٹھائیس سال کی آصفہ زندگی کو سمجھنے لگی تھی۔

میڈم روزی کی طبیعت میں غصہ بہت تھا۔کبھی خوش ہوئیں تو ہزار پانچ سو تھما دیتیں ورنہ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ، برا بھلا۔ایک وہ ہی نہیں سارے ملازم ہی ان سے خائف رہا کرتے۔تنخواہ وقت پر دے دیتی تھیں۔

آصفہ کا گھر چلنے لگا تھا پر تھک کر چور ہو جاتی تھی۔

چھٹی کے بعد اس کی بیٹیاں نانی کے ہاں چلی جاتیں اور واپسی پر وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر گھر آجاتی۔چھوٹا بھائی ممتاز علی رات ان کے ساتھ ہی سو جاتا۔ممتاز علی خود مزدور آدمی تھا۔ہر کوئی اپنا بوجھ اٹھا رہا تھا۔وہ کیوں کسی پر بوجھ بنتی۔کوئی بھی راستہ کبھی سیدھا نہیں ہوتا اس میں ٹیڑھ، کھائیاں اور سراب چھپے رہتے ہیں۔اس کا دکھ میڈم روزی تھیں۔

کیا انہیں احساس نہیں ہونا چاہیے کہ روزی روٹی کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر نکلنے والیوں پر چلو احسان نہ کرے احساس تو کرلیں مگر ان کے وسیع لان کی طرح ان کا دل کسی بھی ملازم کے لیے وسیع نہیں تھا۔جب ایک دن اس نے مالی بابا علی بخش سے کہا کہ "میڈم اتنی عصیلی کیوں ہیں تو وہ بھی آصفہ نکلی تھیں۔شوہر نے کسی امریکن گوری سے بیاہ رچالیا تھا۔بچے گھر چھوڑ کر باہر کی دنیاؤں میں کھو گئے تب ہی میڈم کا دل کہیں بھی نہیں لگتا۔

آصفہ کا دل کہتا کہ میڈم روزی ناشکری ہوگئی ہیں۔جن کے پاس روٹیاں ہوتی ہیں بھلا وہ بھی کبھی اکیلے ہوئے ہیں، ان کی موٹی انگلیوں میں پہنی ڈائمنڈ رنگز، قیمتی کپڑے ملازمین کی فوج، ہر دوسرے دن ان کی بہنوں، دوستوں کے چکر، کیا زندگی صرف ایک انسان تک محدود ہو جاتی ہے۔زندگی تو چلتی رہتی ہے تو وہ کیوں نہیں چلتی جاتیں،خوش اسلوبی سے صلح

جوئی سے۔

آصفہ کے ہاتھ کام کرتے جاتے بنار کے اور دماغ سوچتا رہتا۔ کتنا فرق تھا ان دونوں میں ایک تنہائی سے لڑ رہی تھی اور دوسری روٹی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بہت سا پڑھائے گی، بہت سارے کام کرے گی اسے کبھی تھکنا نہیں تھا مگر ایک شام اپنے دل پر لات مارنے والی کا دل بھر آیا تھا۔ میڈم روزی نے اسے بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، ہمت نہ ہارنے والی ہمت ہار گئی۔

''وہ روزی کمانے کے لیے آتی ہے، بے عزت ہونے کے لیے نہیں۔''

بابا علی بخش نے بڑا سمجھایا تھا ''نوکری کی تے نخرہ کی''

''پر بابا نوکر نخرہ نہیں کر رہا عزت مانگ رہا ہے جو کہ اس کا حق ہے۔'' اور وہ اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔

وسیع و عریض بنگلے سے اس کے چلے جانے کا کسی کو کیا غم۔ نوکر بہت، نوکرانیاں بہت، یہاں روز پختہ چہرے والی نوکرانیاں غول در غول سفر کرتی ہیں۔ ان کی آواز کسی نے کبھی نہیں سنی تھی۔ کسی سے سوٹ کی قمیص جلے تو مالکن کی آواز آتی ہے پر نوکرانی، انہیں بولنے کا کیا حق مگر وہ یہ حق رکھتی ہے۔ اس نے کبھی چوری نہیں کی، کام میں کوئی نقص نہیں چھوڑا، صاف ستھرے کام کے باوجود کوئی اس پر اپنا غصہ کیوں نکالے آخر! کتنے سارے پتھروں کو اس نے اڑا ڈالا تھا سڑک خالی تھی۔

حساب کے دو ہزار مٹھی میں دبائے وہ زمانے سے لڑ کر نکلی تھی۔ میڈم اس کے کام کو اکثر سراہتی تھیں مگر اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکی تھیں۔ کچے دار پیاز اس نے میڈم کے گھر سے کاٹنا سیکھی تھی ایک طرح کا مزیدار پلاؤ اور کچھ روٹیوں کی قسموں میں وہ خود کو ماہر سمجھا کرتی تھی موٹی پیاز بریانی کے لیے کاٹا کرتی۔ ٹماٹر لمبی کچھے دار پیاز سلاد کے لیے اس نے بہت ساری بریانی دل لگا کر تیار کی اور اسے بھٹے پر رکھ دیا۔ اب وہ روٹی سالن اور بریانی بیچنا چاہتی تھی۔

کون کھائے گا روٹی چاول یہاں لوگ روٹی کھانے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں اور اسی کی تلاش میں مر جاتے ہیں۔

جب سارے جذبے مار ڈالے تھے تو کھانا بیچنے میں شرم کیسی، اس جھوٹی انا کو بھی جھوٹا ہو کر مرنا چاہیے۔

پہلے پہل عورتوں نے بریانی اور اس کے مسالوں کو سراہا پھر خریدنے لگیں۔ اس طرح کی ہنر مند پیاز جو اتنے سلیقے صفائی سے کٹی تھی لوگوں کے دلوں میں اترنے لگی تھی۔ اسے روٹیاں، سالن، بریانی بیچنا تھی ہر صورت، چاہے کہیں کسی گھٹے درخت تلے کھڑی ہو سکے۔ ہمت ہو تو گھر کی دیواروں کے درمیان راستے نکل آتے ہیں اس نے تو خود اپنے ہاتھ سے اپنی خواہشوں تک کا گلا گھونٹا تھا یہ تو روٹی تھی تھوڑے سے پیسے تھے جو بہت ضروری تھے۔

آصفہ کا دل پہاڑوں کی طرح مضبوط اور جما رہنے والا تھا۔ وہ بھگوڑی نہیں تھی۔ شوہر بزدلوں کی طرح بھاگ گیا تھا مگر وہ عورت ہو کر مرد کی طرح جی رہی تھی۔ کون کہتا ہے کہ عورت کمزور ہے، کم تر وہ ہے جو خود کو سمجھ کر بیٹھ جائے بھلے وہ کوئی عورت ہو یا مرد۔

خود کو اگر اس نے اچھا پکانے والی سمجھا تھا تو یہ بات سچ نکلی تھی۔ انتہائی لگن سے پکا کر بڑا لگن ہو کر بڑی امید سے بیچا تھا۔ بیچنے کو تو سب کچھ بک جاتا ہے سستے مہنگے بھاؤ۔ اس نے اپنی ہمت کی قیمت لگانا شروع کی تھی وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی وہ ہار بھی کیسے سکتی تھی پورے پندرہ سو روپے پہلا منافع۔

آصفہ کی آنکھیں خوشی سے بھر گئیں گورنمنٹ کالج کی کینٹین اس کی اگلی منزل تھی۔ اپنا چھوٹا سا کاروبار پلاؤ، زردہ، حلوہ پوری۔ اس نے دیکھا کہ وہ

چاٹ بھی اچھی بنانے لگی ہے۔ گلے سڑے پھل بھی استعمال نہ کیے۔ ایسی صاف ستھری چائے اور کھانا بنایا جسے وہ اور اس کی بچیاں بھی بے دھڑک کھا سکیں۔ اس کی آنکھوں میں جھجک کے بجائے عزم جا بیٹھا۔ اس نے بند دروازہ پیٹنے کے بجائے کئی اور دروازے دریافت کر لیے تھے دریافت کی دنیا ہے ناں!

میڈم روزی مالی بابا ڈرائیور سے ایک دوبار پوچھنے کے بعد بھولی نہیں بلکہ اور بھڑک اٹھیں ایک سر پھری قلاش عورت جو دانے دانے کی محتاج تھی اسے ہر بات سہہ جانا چاہیے تھی مگر وہ ایک ایسی جرات کر گئی جو ان کے سامنے نوکروں کی تاریخ میں کبھی کسی نے نہیں کی۔ بڑے دن انہوں نے انتظار کیا۔

وہ بریانی اچھی بنایا کرتی تھی، ذائقہ کک کے مقابلے میں اس کے ہاتھ میں زیادہ تھا مگر وہ تھی کہاں۔ صبح لان کے خوش گوار موسم اور تازگی کو محسوس کرتے ان کے سامنے آصفہ کھڑی تھی مالی اسے بلا کر لایا تھا۔

''کیا کرتی ہو آج کل اور تم آئیں کیوں نہیں پھر۔'' میڈم روزی طنزاً اس کی مصروفیات دریافت کرنے لگیں۔

''اپنا کام شروع کیا ہے۔''

''کیسا کام؟ تم عورت ہو اور جانتی ہو ناں معاشرے کو کیسا اندھیر مچا رکھا ہے لوگوں نے۔'' میڈم روزی نے اسے واپس لانے کے لیے ساری دنیا کو یک دم تاریکی میں ڈبو کر سیاہ کر دکھایا تھا۔

''مجھ میں اتنا دم ہے کہ میں دنیا کا مقابلہ کر سکوں۔''

''کیسی پڑھے لکھوں والی باتیں کرتی ہو کتنا پڑھ رکھا ہے تم نے؟'' وہ اس کی نئی چپل اور لان کے ٹوپیس پر نظر جما کر بولیں۔

''کتابیں تو اتنی نہیں پڑھیں مگر دنیا کو ضرور پڑھا اور یہ جان لیا ہے کہ روزی روٹی کسی بھی میڈم کے اختیار میں نہیں صرف میرا رب اختیار رکھتا ہے اس پہ۔'' پہلی بار آصفہ نے اپنی بات پوری کی تھی۔

''چھ ہزار دیتی تھی ناں تجھے اب آٹھ ہزار دوں گی، تمہارے ہاتھ میں صفائی تھی۔'' وہ کچھ نرم پڑیں بہرحال وہ آصفہ کی واپسی چاہتی تھیں۔

مگر آصفہ صرف اب تھی ہی رہ جانا چاہتی تھی۔

''کوئی ڈھنگ کی ملازمہ ڈھونڈنا ہو تو بتائیں۔'' وہ ٹھکرا کر نکلی تھی ٹھکرا کر ہی لوٹ آئی، عزت سے کوئی شے قیمتی نہیں ہو سکتی۔

''امی! آج تو بڑا گھاٹا ہوا ہے۔''

''ہاں تو گھاٹے تو زندگی کا حصہ ہیں ناں ان سے بھلا کیا ڈرنا لڑ کیو!''

آصفہ ایک ایک پتیلے کو چیک کرنے لگی تھی جن میں سے کسی کے بھی پیندے میں مایوسی نہیں جمی پڑی تھی۔

''کل کا سامان تو آجائے گا ناں اور کل سے ہر سو روپے کے پیچھے پانچ روپے روزی دینے والے کے، جس طرح اس رب نے میڈم روزی کو ہمارے لیے وسیلہ بنا کر زمین پر اتارا تھا اسی طرح وہ ہمارے لیے روزی بھی اتارے گا۔ کیوں میں سچ کہتی ہوں اناں۔''

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

مُونا شاہ قریشی

تبسم

سیاہ بادل افق پر چھائے سفید بادلوں کو جگہ دینے سے انکاری تھے۔ سفید دھواں ناراضی کے عالم میں سیاہ بادلوں کے اوپر سے گزر کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ خنک ہواؤں نے معتدل موسم کو سرد بنا ڈالا تھا۔

تارکول کی شفاف سڑک پر ٹریفک کا اژدھام تھا جو لوگوں کے جلد از جلد گھر لوٹنے کی کوشش کو ظاہر کر رہا تھا چونکہ شام ڈھلنے کے قریب تھی، اس لیے موسم کے باعث قدرے جلدی تاریک ہوتا دن ماحول میں افراتفری کا سماں بپا کر گیا تھا۔ کلینک میں آتی اکثر خواتین کو اذیت سے دوہرا ہوتا دیکھ کر اس نے بے ساختہ جھرجھری لی۔ سفید بے داغ چادر کا پلو

بار بار سلیقے سے سمیٹتے ہوئے وہ ہلکی سی پریشانی کے عالم میں تھی۔

معراج نے پیچھے سے آ کر اسے دھیرے سے اپنے دائیں بازو کے حصار میں لیا تو وہ یکلخت چونک کر اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکنے لگی، جو ہلکی سی مسکراہٹ لیے اسے نرمی سے سمیٹے ہوئے تھا سبک روی سے قدم اٹھاتی وہ اس کے حصار میں کلینک سے باہر آئی تو گاڑی کے پاس سڑک کنارے کھڑے وجود کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

ہلکی گھنی پلکوں کی جنبش اک لمحے کو ساکت ہوئی تھی۔ دائیں بائیں دیکھتی وہ خاصی عجلت میں دکھائی دے رہی تھی۔ اسی عجلت میں بائیں طرف ڈالی گئی نظر تھم سی گئی۔ خوب صورت لباس زیب تن کیے وہ روز اول کی طرح پروقار دکھائی دے رہی تھی۔

محبت بھرے مضبوط حصار کا احساس تفاخر اس کے پرسکون چہرے سے چھلک رہا تھا۔

اس نے ذرا سی گردن موڑ کر پیچھے کلینک پر لگا سائن بورڈ پڑھا اور پھر جھٹکے سے میکانکی انداز میں اس کی جانب بڑھی ہی تھی کہ اچانک آندھی کا تیز جھونکا آیا اور عرش سے گرتی بارش کی صحت مند بوندیں نارکول کی سڑک اور گاڑیوں کی چھتوں سے ٹکرا کر ٹپ ٹپ کی بھاری آواز پیدا کرنے لگیں۔

معراج نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا تاکہ وہ اندر بیٹھ جائے۔ معراج سے بات کر کے وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی شیشہ ذرا سا نیچے سرکا کر اس نے گاڑی سے باہر جھانکا۔ فٹ پاتھ پر کھڑا وجود مکمل بھیگ چکا تھا۔

ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے

ناولٹ

اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ بھیگا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹتی وہ خاموشی سے آ کر اندر بیٹھ گئی۔

"یشفہ گڑیا! آپ آگے چلی جائیں بابا کے پاس۔" پاس بیٹھی یشفہ کے بالوں پر بوسہ دے کر اس نے پیار سے کہا۔

معراج نے پیچھے مڑ کر چار سالہ یشفہ کو اٹھا کر آگے اپنے پاس بٹھا لیا ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے وہ چپکے چپکے اس کے باوقار اور پرسکون چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

اس کے چوری چوری دیکھنے پر اک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی تھی۔ ہیٹر کی گرمائش کے باوجود گاڑی میں برف سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بارش کی بوندیں پوری قوت سے شیشوں سے ٹکرا کر چنگھاڑ رہی تھیں۔ دور تک گیلی سڑک کے سوا کچھ نہ تھا۔

گھبرا کر شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بھیگے وجود نے گیلے چہرے پر ہاتھ پر پھیرتے ہوئے اسے خشک کرنا چاہا تھا کہ اچانک ٹشو والا ہاتھ سامنے آ گیا۔ شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے ٹشو تھاما اور نظریں جھکا کر چہرے کا پانی صاف کرنے لگا۔

☆☆☆

شادی کی تیسری سالگرہ کا کیک منہ میں رکھتے ہوئے وہ یکلخت رک گئی تھی۔ آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے پلیٹ واپس میز پر رکھ کر صوفہ کی پشت سے سر لگا لیا تھا۔ احسن نے اس کی بدلتی کیفیت دیکھ کر دھیرے سے اسے دائیں بازو کے حصار میں لیا تھا۔ تسلی بھرا سہارا ملتے ہی وہ سسک پڑی تھی۔

اس کا سر تھپکتے ہوئے وہ خود بھی لب بھینچ کر اس کرب کو محسوس کر رہا تھا۔

تازہ چاکلیٹ کیک ایکدم ہی باسی اور پھیکا پڑ گیا تھا۔ سرخ گالوں کی مہک پر اداسی اور بے کسی حاوی ہو۔ چکی تھی۔ سیاہ گھڑی کی بڑی سوئی نے بارہ بجنے کا عندیہ دیا تو احسن نے چونک کر سسکتے ہوئے وجود کو اٹھا کر بستر پر لٹا کر نرم کمبل اڑھا دیا تھا اور خود ٹھنڈی افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے میز پر بکھری باقیات سمیٹنے لگ گیا تھا۔

اگلی صبح رات کی اداسی بھری سیاہی کا شائبہ تک نہ تھا۔ چمکتے چہرہ اور کھلکھلاتے لبوں کے ساتھ مستعدی سے باورچی خانہ میں کھڑی ناشتہ بنا رہی تھی۔

"زارا بیگم! ناشتہ لے آؤ۔"

احسن کی پکار پر تیزی سے تمام چیزیں ٹرے میں رکھتے ہوئے وہ باورچی خانہ سے باہر آ گئی تھی۔

"مجھے وقت پر اٹھایا کیوں نہیں آج آپ نے۔ وہ تو شکر ہے میری کچھ دیر پہلے آنکھ کھل گئی۔"

اس کے شکوہ بھرے انداز کو احسن نے مسکرا کر دیکھا تھا

"رات کو دیر سے سوئی تھیں تم اور تھکی بھی ہوئی تھیں اس لیے۔"

احسن کی بات پر زارا نے نوالہ بنا کر اس کے منہ ڈالتے ہوئے خفگی سے ابرو اچکائی تھی۔

"آپ جانتے ہیں کہ آپ بھوکے آفس جائیں مجھے یہ گوارا نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں۔" چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے احسن نے سر ہلا کر اس کی تائید کی تھی۔

کمرے کے دروازے پر کھڑے وجود نے تلملا کر اس محبت بھرے منظر کو حسد سے دیکھا تھا اور جلتا ہوا دل لے کر واپس پلٹ گیا تھا۔

ناشتہ کے بعد احسن کو دروازے تک چھوڑ کر جوں ہی واپس پلٹی سیڑھیوں سے اترتی۔ رضوانہ بھابھی کو دیکھ کر مسکرا اٹھی۔

"السلام علیکم بھابھی!"

"وعلیکم السلام! آج احسن کو دیر نہیں ہو

ہے؟'' سرسری سے لہجے میں انہوں نے پوچھا۔

''جی بھابھی! آج میری دیر سے آنکھ کھلی تھی۔''

انہیں جواب دے کر وہ وہیں گیراج میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''وظیفہ کررہی ہو تم۔''

بھابھی کے پوچھنے پر اس نے ضبط سے لب بھینچے تھے، یہ وہ موضوع تھا جو اس کے لبوں کو سی ڈالتا تھا۔

''جی! کررہی ہوں۔'' وہ دھیمے لہجہ میں بولی۔

''بس اب تو دعا کا ہی راستہ بچا ہے دوائیں تو مایوس کرگئی ہیں۔ میں نے کئی لوگوں سے بھی دعا کروائی تھی تمہارے لیے۔ اللہ جلد تمہاری گود ہری کرے۔ تم سے بڑا دکھ ہے اولاد کے بغیر رہنا۔ اللہ کسی دشمن کو بھی اس کرب سے نہ گزارے۔''

بھابھی کے تاسف بھرے لہجہ پر اس کی آنکھوں میں نمکین پانی کا ذخیرہ چھلکنے لگا تھا، جسے پلکیں جھپک جھپک کر اندر اتارتی وہ مسکرادی تھی۔

''امی اٹھ گئیں؟'' بات کا رخ موڑتے ہوئے زارا نے پوچھا تھا۔

''نہیں! ابھی تو سوئی ہوئی ہیں۔ رات کو بی پی ہائی ہوگیا تھا۔ دوا دے کر سلایا تھا۔''

''میں تھوڑی دیر تک آؤں گی اوپر امی کے پاس۔''

کرسی سے اٹھ کر اس نے اندر کی طرف قدم بڑھایا تو پیچھے کھڑی رضوانہ نے چبھتی آنکھوں کے ساتھ اس کی پشت کو گھورا تھا۔ تین سال سے اس کا وجود کنکر بن کر ان کی آنکھ میں کھٹک رہا تھا۔ قابل دیور کے لیے بہن کو بیاہ کر لانے کا ارمان اس وقت اپنی موت آپ مرگیا تھا۔ جب احسن نے زارا سے پسند کی شادی کی۔ اولاد کی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود دونوں کی باہمی محبت ان کے سلگتے دل کو تندور بنادیتی تھی بظاہر رشتے نبھاتی پرخلوص جیٹھانی بنے وہ اچھائی کا پرچار کرتی تھیں مگر دل میں جلنے والی بھٹی سے ہمہ وقت دھواں نکلتا رہتا تھا۔

گھڑی کی سوئیوں نے دو کا ہندسہ عبور کیا وہ ایک دم چونک گئی۔ صفائی اور کھانا بنانے کے چکر میں وہ ساس کی عیادت بھول گئی تھی۔ گیلے بالوں کو الٹا سیدھا لپیٹ کر اوپر کی جانب دوڑ لگائی تھی۔ اوپر آتے ہی رضوانہ بھابھی سے سامنا ہوا تھا۔

''دودھ والا نہیں آیا ابھی۔'' انہوں نے استفسار کیا

''نہیں بھابھی! ابھی تو نہیں آیا۔''

انہیں جواب دے کر وہ اندر کی طرف بڑھ گئی رضوانہ بھابھی نے اسے جاتے چبھتی نظروں سے دیکھا تھا پاس کھڑی عمرانہ نے بھی اسے دیکھ کر چہرہ کا زاویہ بگاڑا تھا۔

عمرانہ رضوانہ کی چھوٹی بہن اور احسن کی فرسٹ کزن تھی جو شادی کے دو ماہ بعد ہی گز بھر کی لمبی زبان اور اپنی عادت واطوار کے باعث طلاق لے کر گھر بیٹھ گئی تھی اور اب رضوانہ کے بلاوے پر ہی ادھر قیام پذیر تھی۔

طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر رضوانہ نے کام کے بکھیڑے سمیٹنے کے لیے اسے بلایا تھا پس پردہ احسن کو رجھا کر اپنی جانب مائل کرنا تھا۔ ان کے خیال میں بے اولادی کا مسئلہ احسن اور زارا کے رشتے کو کمزور کرنے کی واحد کڑی تھی۔ اسی لیے وہ وقتاً فوقتاً اس بات کا تذکرہ کرکے اپنی ساس کے دل میں زارا

کے لیے بے زاری پیدا کر رہی تھیں۔
''السلام علیکم! امی کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''
ساس کے پاس بیٹھتے ہوئے زارا مسکراتے ہوئے بولی۔
اس کی ساس شروع ہی سے بڑے بیٹے کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ احسن نے بہتیرا کہا کہ ہمارے ساتھ رہ لیں مگر وہ نہ مانیں۔ رضوانہ ان کی بھانجی اور من پسند بہو تھی پھر ساس کی خدمت بھی وہ جی جان سے کرتی تھی۔ سسر حیات نہ تھے۔ تین نندیں اپنے گھر بار کی تھیں سو لمبے چوڑے سسرال کا بکھیڑا نہ تھا۔
''وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں اب تو۔ بی پی کا مسئلہ رہتا ہے عمر کا تقاضا ہے۔ کیا کریں بھئی۔ طبیعت تو اب بس یوں ہی رہے گی۔'' ایسے جواب دے کر وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز ہوئی تھیں۔
''تم سناؤ۔ وظیفہ کر رہی ہو ڈھنگ سے۔ ناغہ نہیں ہونا چاہیے اور خشوع وخضوع بھی ہونا چاہیے۔'' اس ذکر پہ وہ یکلخت پھیکی پڑ گئی تھی۔ بمشکل سر ہلا کر اس نے خود پہ ضبط کیا تھا۔
''یہ تعویذ لے لو۔ اسے پانی میں گھول کر پینا ہے۔'' موڑھا کھسکا کر زارا کے قریب بیٹھتے ہوئے رضوانہ نے تعویذ اس کی مٹھی میں دبایا تھا۔
''اللہ جلدی سے میرے احسن کو اولاد سے نواز دے۔ مجھے تو لگتا ہے میں یہ حسرت لیے قبر میں اتر جاؤں گی۔''
ساس کی بات پر رضوانہ نے زارا کے تاثرات جانچے تھے اور پھر جھٹ سے اس کا ہاتھ دبا کر تسلی دی تھی۔
''امی! اللہ نہ کرے آپ کی خواہش حسرت بنے۔ اچھی امید رکھیں بر آئے گی۔''
بھابی کے جواب پر زارا نے تشکر سے انہیں دیکھا تھا، ہر جگہ ایک ہی بات کی گردان نے اسے ذہنی طور پر بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ ہر آنے جانے والے کی زبان پر اولاد کا تذکرہ اور باتیں اسے ہمہ وقت اذیت میں مبتلا رکھتی تھیں۔ اس کے اولاد نہ ہونے کے کرب کو کوئی سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ احسن لاکھ دلجوئی اور تشفی کے باوجود وہ لوگوں کے اس رو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔
نیچے آ کر چولہا جلا کر اس نے مٹھی میں دبا تع اطمینان سے نذر آتش کیا تھا۔
ضبط کے باعث آنکھوں میں حزن بھری ٹھہری تھی جسے انگلی کی پور سے صاف کرتی۔ مسکراتے ہوئے اندر بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ہاتھ میں لیپ ٹاپ اور فائلز تھامے تھکے قدم اٹھاتے وہ گھر میں داخل ہوا تو پہلا سامنا عم سے ہوا جو مسکراتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ کمر جانب بڑھ گیا۔
کمرے میں زارا ہینڈ فری لگائے ویڈیو کا محو گفتگو تھی۔ اس کی آمد پر زارا نے چونک کر کھڑ جانب دیکھا تھا۔
''احد میں بعد میں کال کرلوں گی جب تا نماز ادا کرلیں گی۔'' اپنے کزن احد کو اللہ حافظ وہ احسن کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔
''ایم سوری آج تو مجھے اندازہ ہی نہیں وقت کا۔'' زارا نے اٹھتے ہوئے معذرت کی ج وہ محض سر ہی ہلا سکا تھا۔
''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔'' تشویش اس نے پیشانی پر ہاتھ دھرا تو احسن نے دھ سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا مگر زبان سے کچ کہا۔ سر جھٹکتے ہوئے وہ پانی کا گلاس اور چا کپ لے آئی۔ خاموشی سے چائے پیتے ہ احسن سوچوں میں گم تھا زارا نے تشویش سے اس گم صم انداز کو دیکھا۔ جو چائے پینے کے بعد ک لیے واش روم میں بند ہو گیا تھا۔
بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے اس نے لیپ اور فائل اٹھا کر میز پر رکھی۔ صبح سے وہ احسن انتظار میں تھی۔ باتھ روم سے باہر آ کر سست رو

جاتے ہوئے احسن نے آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر۔ گیلے بالوں میں برش پھیرا تھا۔

''رپورٹس لایا ہوں ڈاکٹر نمرہ سے۔ نیلی فائل میں ہوں گی۔ پڑھ لو۔ سب کچھ نارمل ہے۔''

بوجھل لہجے میں بتاتے ہوئے اس نے آئینہ میں زارا کے عکس کو دیکھا، جو رپورٹس لینے کے لیے اٹھی تھی۔ تین سال میں پہلی مرتبہ انہوں نے اپنا مکمل چیک اپ کروایا تھا۔

''ہمم..... میرے رب کی مرضی ہے جو نوازنا چاہے تو اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے بس آزمائش ہے یہ ہماری۔'' کھوئے ہوئے لہجے میں زارا کے لب ہلے۔

''میں ذرا اوپر امی سے مل آؤں۔'' پلٹ کر باہر نکلتے ہوئے احسن نے اطلاع دی تو زارا چونک کر بے خیالی میں اس کی پشت کو دیکھنے لگی۔ کافی دیر بعد بھی وہ نیچے نہ آیا تو مجبوراً زارا کو اوپر جانا پڑا اور اوپر جاتے ہی جو بحث اسے سننے کو ملی اس نے اس کے حواس سلب کردیے۔ احسن کی دوسری شادی زیر بحث تھی۔ عام عورتوں کی طرح اس کی ساس بھی اولاد کے لیے احسن کو دوسری شادی کا مشورہ دے رہی تھیں۔ وہ الٹے قدموں لوٹ آئی۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولتے ہوئے اس کا بے جان وجود بیڈ پر ڈھے گیا تھا۔ کنپٹی میں جذب ہوتے آنسو اس کی اذیت کے گواہ تھے۔ چند لمحوں بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور احسن اندر داخل ہوا تھا مگر اس کی حالت کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا۔

احسن کو دیکھتے ہی زارا نے بھیگی آنکھوں کو رگڑا تھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''آپ دوسری شادی کریں جا کر۔ میری کیا فکر ہے آپ کو۔'' اس کے نروٹھے پن پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''جن سے محبت ہوتی ہے، انہی کی فکر بھی ہوتی ہے۔'' اس کی ناک کو کھینچ کر وہ شگفتگی سے بولا۔ زارا نے ناک پکڑ کر اسے زبردست طریقے سے گھورا تھا۔

''گھورو مت ورنہ گالوں کی شامت بھی آجائے گی۔'' وہ اب ماحول کا تناؤ کم کررہا تھا۔

''اچھا! میں دوست کی طرف جارہا ہوں۔ کچھ کام ہے، رات میں دیر سے آؤں گا۔'' شرارت سے اس کے بالوں میں سے کیچر نکال دیا اور ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد زارا کے لب بھی ایک دم مسکرا اٹھے تھے۔ دل پر پڑا بوجھ ہٹ چکا تھا۔

رات کو جب وہ دیر سے آیا تو زارا سو چکی تھی۔ بظاہر وہ نارمل تھا مگر اندر سے عجیب سی بے چینی اور پریشانی نے گھیرا ہوا تھا۔ ذہن میں رضوانہ بھابھی اور امی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ تھک کر آنکھیں موندتے ہوئے اس نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

صبح سویرے نماز ادا کرنے کے بعد وہ دوبارہ سے بستر پر گر گئی تھی۔ بخار کی کیفیت نے پورا وجود نڈھال کردیا تھا۔ احسن نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر چیک کیا تو وہ ناراض نظروں سے اسے دیکھنے لگی جبکہ وہ اس کی خفگی پر مسکرا اٹھا۔

''زہر لگ رہی ہے مجھے آپ کی یہ مسکراہٹ۔'' منہ پر لحاف ڈالتے ہوئے اس نے کروٹ بدل کر کہا

''اور مجھے شہد لگ رہی ہے یہ بیمار شکل۔'' لحاف کھسکا کر اس نے جھک کر شرارت کی تو زارا جلدی سے کھسک کر دور ہوگئی۔

''خبردار۔''

اس کا تنبیہی انداز دیکھ کر اک قہقہہ احسن کے حلق سے برآمد ہوا تھا۔

''ناشتہ لا رہا ہوں ساتھ دوا بھی۔ کھا کر دوبارہ سو جانا مسز احسن!''

با آواز بلند اسے مطلع کرتا وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہلکا پھلکا سا ناشتہ کروا کر دوا دے کر وہ دفتر جانے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ تیار ہو کر اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ عمرانہ۔ نہ سیڑھیوں سے

اترتے ہوئے اسے اس وقت اکیلا بیٹھا دیکھا تو فٹا فٹ نیچے پہنچ گئی۔

"اکیلے چائے پی جارہی ہے۔"

اس کی آواز پر چونک کر احسن نے اسے دیکھا تھا۔

"ہاں! دراصل آج زارا کو بخار ہے تو اس لیے....." بات ادھوری چھوڑ کر اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

"اس کا مطلب تم نے ناشتہ نہیں کیا۔" وہ فوراً چوکنی ہوئی۔

"آفس میں کرلوں گا۔" بے نیازی سے کہتے وہ پھر چائے پینے لگا۔

"اوہو! یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ اگر زارا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو باقی گھر والے تو ہیں ناں۔ میں ابھی ناشتہ بنا کر لاتی ہوں۔ یہیں باورچی خانے میں بنا دیتی ہوں۔" تیزی سے کہتے ہوئے وہ باورچی خانہ کی سمت چلی گئی۔ احسن نے اسے روکنا چاہا مگر تب تک وہ جا چکی تھی۔ دس منٹ میں آملیٹ پراٹھے کا ناشتہ لیے وہ لاؤنج میں حاضر تھی

"آج اکٹھے ناشتہ کرلیتے ہیں۔ بچپن کے قصے تازہ ہوجائیں گے۔" اس کے سامنے ٹرے رکھ کر وہ دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گئی اور پھر جانے کون کون سے قصے یاد کرتے ہوئے انہوں نے ناشتہ کیا۔ احسن کا موڈ اچھا خاصا خوش گوار ہوگیا تھا اک لمبے عرصے بعد کسی کزن کے ساتھ مل بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ملا تھا ورنہ تو مخصوص تقریبات میں ہی رسمی سی بات چیت ہوتی تھی۔

جب وہ سو کر اٹھی تو دس بجے تھے اور رضوانہ بھابھی نیچے ہی موجود تھیں۔ طبیعت کچھ حد تک بہتر محسوس ہورہی تھی مگر پھر بھی وہ بصد اصرار قریبی کلینک میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں، نارمل بخار سے شروع ہونے والی بات خالی گود پر آرکی تو وہ مجرموں کی طرح سر جھکا گئی۔ رضوانہ نے تفصیل سے ڈاکٹر سے بات کی تو انہوں نے چیک اپ کروانے کو کہا۔

زارا نے انہیں بتایا کہ وہ چیک اپ کروا چکی ہے مگر رضوانہ بھابھی نے زبردستی کر کے دوبارہ سے چیک اپ کروا دیا۔ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت کلینک میں گزار کر جب وہ لوگ واپس آئے تو بارہ بجنے والے تھے۔

اسے پھر سے تھکاوٹ ہورہی تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی رضوانہ نے اس کے لیے کھچڑی بنائی اور دوا دی تو وہ بھابھی کے سلوک پر ممنون ہوتی پھر سو گئی۔

شام کو احسن آیا تو وہ اس وقت چائے بنا رہی تھی۔

"مزاج کیسے ہیں مسز۔"

"طبیعت سیٹ ہے لیکن مزاج برہم ہیں۔" چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔

"ہم درست کردیں گے۔" اسے اپنے حصہ میں لیتے ہوئے احسن نے دلکشی سے کہا تو وہ پرسکون ہوکر شانے پر سر ٹکا گئی۔

"بھابھی نے میرا بہت خیال رکھا ہے، ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئی تھیں۔" وہ خوشی سے بتا رہی تھی جبکہ احسن کا سرد جوابی انداز میں بدل رہا تھا کئی لمحے یونہی گزرے اور ان لمحوں کا فسوں موبائل میں بجنے والی بیل نے توڑا۔ زارا نے خالی کپ اٹھائے اور باورچی خانے میں چلی گئی مگر وہ دیکھنے کے بعد فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

کئی لمحے تو یقین ہی نہ آیا پھر تیزی سے باہر جانب بھاگا، دروازے سے داخل ہوتی زارا تیزی پر پوچھتی رہ گئی مگر وہ کمرے سے نکل کر منٹ میں اوجھل ہوگیا۔ اوپر بھابھی کے کمرے میں آ بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ ٹھہر گیا تھا رپورٹس ہاتھ میں لیے اسی کا انتظار کررہی تھیں۔

"اندر آجاؤ۔"

اسے ایک جگہ جمے دیکھ کر انہوں نے سر اشارے سے آگے آنے کا کہا۔ وہ بمشکل چند چل کر آگے آیا تھا۔

''میں تمہیں نہ بتاتی یہ سب اگر پوری زندگی کا معاملہ نہ ہوتا۔ مجھے تو خود یقین نہیں آرہا۔ سارے تعویذ بے اثر گئے کیونکہ بنجر زمین پر فصل اگنے کی امید معجزہ ہوتی ہے اور معجزے سب کے ساتھ نہیں ہوتے۔''

نہایت دکھ سے بولتے ہوئے انہوں نے زارا کی جھولی رپورٹ احسن کے ہاتھ میں تھمائی، جو انہوں نے خود ڈاکٹر سے بنوائی تھی۔

''آج بخار تھا زارا کو تو میں قریبی کلینک لے گئی تھی وہاں میں نے ڈاکٹر نوشابہ سے مکمل چیک اپ بھی کروالیا مگر مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ ہوگا۔''

لرزتے ہاتھوں سے رپورٹ تھامتے ہوئے اس نے کھول کر دیکھی اور پھر کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

''ڈاکٹر نمرہ نے ہم دونوں کا چیک اپ کیا تھا، سب کچھ نارمل تھا پھر یہ سب کیا ہے۔'' وہ دکھ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بھابھی سے پوچھ رہا تھا۔

''احسن! میں تمہاری کزن ہوں۔ تمہاری بھابھی ہوں۔ دو دو رشتے ہیں میرے تم سے۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ ہمیشہ تمہاری خیر خواہی چاہی ہے۔ برا مت ماننا لیکن جو میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سننا۔ دیکھو! ڈاکٹر نمرہ زارا کو اچھے سے جانتی ہے تو رپورٹس تبدیل کروانا کوئی مشکل بات نہیں ہے اور یہی زارا نے کیا ہے، وہ اپنی یہ خامی تم سے چھپانا چاہتی ہے۔''

وہ بڑے طریقے سے اپنے اندر کا زہر شہد میں لپیٹ کر احسن کے وجود میں اتار چکی تھیں۔ اس نے بے یقینی سے بھابھی کو دیکھا۔

''احسن! تم مجھ سے وعدہ کرو، تم زارا کو یہ بات نہیں بتاؤ گے۔ تم اسے ظاہر نہیں کرو گے کہ تمہیں سب پتا ہے ورنہ وہ مجھے غلط سمجھے گی جبکہ مجھے تم لوگوں سے کچھ نہیں چاہیے میں تو صرف تمہیں آگاہ کررہی ہوں۔'' بڑے سلیقے سے وہ احسن کا اعتبار متزلزل کرچکی تھیں۔

''آپ بے فکر رہیں، میں نہیں بتاؤں گا۔''

لہو رنگ آنکھیں اور ٹوٹا یقین لیے وہ رپورٹس وہیں رکھ کر کمرے سے باہر آگیا تھا۔ زارا کے جھوٹ سے اس کا دل کرلا رہا تھا۔ وہ اس سے اتنا بڑا جھوٹ کیسے بول سکتی تھی۔ یہ بات اسے بری طرح چبھ رہی تھی۔ اندر ہوتی توڑ پھوڑ نے اسے اجازت ہی نہیں دی کہ وہ زارا کا سامنا کرسکے تب ہی خود کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

رات کا بیشتر حصہ باہر کی فضا میں گزار کر دو بجے احسن نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ شکستگی اس کے ہر انداز سے واضح تھی۔ چابیاں اچھال کر صوفے پر ڈالتے وہ خود بھی وہیں ترچھا ہوکر لیٹ ہوگیا تھا۔ زندگی گویا زندگی کے سب سے بدترین دہانے پر کھڑی تھی۔ چھت کو گھورتے ہوئے اس نے تھکی ہوئی آنکھوں کو بند کیا تھا مگر آنکھیں بند کرلینے سے حقیقت نہیں بدلتی۔

اگلے روز نیچے لاؤنج میں سب احسن کی طرف شام کی چائے پی رہے تھے۔ رضوانہ اور شہناز ٹی وی دیکھ رہی تھیں جبکہ عمرانہ موبائل میں مگن تھی۔ زارا کچن میں کام کررہی تھی۔ آج شام کا کھانا سب نے یہیں کھانا تھا۔ ذرا فاصلے پر بیٹھے احسن کو عمرانہ نے نظر بھر کر دیکھا تھا اور پھر اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی تھی۔

''میرے موبائل میں کچھ مسئلہ ہوگیا ہے، ٹھیک سے کام نہیں کررہا۔ ایک بار چیک کرلیں۔'' عمرانہ کی آواز پر وہ چونک اٹھا تھا۔ خیالات کے تسلسل سے باہر آتے اس نے الجھے ذہن کے ساتھ موبائل تھاما اور فنکشنز چیک کرنے لگا۔

''السلام علیکم!'' بھاری آواز پر سب نے چونک کر دیکھا تھا۔ ذیشان ہاتھ میں لیپ ٹاپ لیے کھڑا تھا۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو۔ کیسے آنا ہوا۔ امی ٹھیک ہیں تمہاری۔'' اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شہناز خوش دلی سے بولیں۔ ان کی لاڈلی

چھوٹی بہن کا سپوت انہیں بہت عزیز تھا۔ جو دو گلی چھوڑ کر ہی قیام پذیر تھیں۔

''جی ٹھیک ہیں۔'' وہ وہیں ان کے قریب بیٹھ گیا۔

''پڑھائی وڑھائی کیسی جارہی ہے۔''

''جی ٹھیک جارہی ہے خالہ! دراصل فائنل چل رہے ہیں بہت اہم پراجیکٹ ملا ہوا ہے تو اسی سلسلے میں زارا بھابھی کی کچھ مدد چاہیے تھی۔ انہوں نے بھی کمپیوٹر میں ہی ماسٹرز کیا ہوا ہے انہیں زیادہ علم ہوگا۔'' اپنے آنے کا مدعا بیان کرتے ہوئے وہ ذرا جھجکا تھا۔

''ارے اس میں ایسی کیا بات ہے۔ زارا مدد کروے گی تمہاری۔ فکر نہ کرو۔'' انہوں نے پورے یقین سے کہا۔ احسن کی پیشانی پر چند لکیریں ابھری تھیں جنہیں رضوانہ اور عمرانہ نے بیک وقت محسوس کرلیا تھا۔

''زارا تو کام کررہی ہے کچن میں۔'' احسن نے دبا سا اعتراض کرنا چاہا۔

''تو کیا ہوا۔ ابھی تو بڑا وقت ہے رات کے کھانے میں۔ ذرا دیر کے لیے اسے سمجھا دے گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' انہوں نے بیٹے کا اعتراض بڑی سہولت سے رد کردیا۔

''زارا!'' شہناز نے باآواز بلند اسے پکارا تو وہ فوراً باورچی خانہ سے باہر نکل آئی۔

''یہ ذیشان کو کچھ سمجھنا ہے۔ تم پہلے اسے سمجھا دو پھر کھانا بنالینا۔''

زارا کے لب ایک دم کھلے تھے، اس نے مدد طلب نظروں سے احسن کی جانب دیکھا جو بے نیازی سے موبائل میں مصروف تھا پاس ہی عمرانہ بے پروا سے انداز میں بیٹھی تھی۔

''جاؤ ذیشان۔'' ساس کے حکم پر زارا خاموشی سے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔ احسن نے لب بھینچ کر غصہ ضبط کیا۔

پاس بیٹھی عمرانہ نے بغور اس کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔ ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کے کناروں پر رقص کیا تھا۔ غائب دماغی سے موبائل صوفے پر تقریباً پھینکتے ہوئے وہ کمرے میں آ گیا۔ جانے کیوں اسے شدید غصہ آرہا تھا۔ یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے وہ اب زارا کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔

پون گھنٹے بعد فارغ ہوکر وہ سیدھی باورچی خانے میں آئی تو بری طرح جھنجھلائی ہوئی تھی۔ کھانا بنانے کے بعد کھانا کھاتے اور چائے پیتے کافی وقت بیت گیا تھا اور اس سارے وقت میں احسن اسے برے طرح گھورتا رہا تھا۔ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے ہوئے وہ بھی اس کی گھوریوں پر برافروختہ ہوئی بیٹھی تھی۔ کمرے میں آتے ہی دونوں کی تکرار شروع ہوگئی تھی۔

''تم ذیشان کو منع کرسکتی تھیں۔ کیوں نہیں کیا۔ احسن نے قدم بڑھا کر فاصلہ کم کیا۔

''جبکہ یہ کام آپ کو کرنا چاہیے تھا۔'' وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر دوبدو بولی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میں نے نہیں کیا ہوگا۔''

''تو جب بیٹا ہوکر آپ کے انکار کو اہمیت نہ دے تو میں بہو ہوکر کس منہ سے انکار کرکے اپنی بے عزتی کرواتی جبکہ آپ اچھے طریقے سے جانتے ہیں کہ مجھے آپ کی امی کتنا اچھا سمجھتی ہیں۔''

غصے سے بول کر وہ بیڈ پر جا ٹکی ابھی تو اس عمرانہ کے ساتھ بیٹھنے کا غصہ بھی باقی تھا۔ کئی دنوں سے وہ اس کے رنگ ڈھنگ پر غور کررہی تھی جو احسن کو دیکھتے ہی بدل جاتے تھے۔ اتنی بے وقوف تو ہرگز نہ تھی جو اپنے شوہر پر کسی اور عورت کی اٹھتی نظروں کو محسوس نہ کرپاتی مگر فی الحال وہ ماحول کشیدگی کے پیش نظر خاموش ہوگئی تھی۔

شادی کے تین سال کے عرصے میں پہلی بار یوں لڑے تھے۔ اس لیے دونوں طرف سے بے مثل سی خاموشی تھی۔ اگلے روز زارا نے خاموشی کا قفل توڑتے ہوئے تناؤ کو ختم کرنا چاہا۔ مگر احسن کی پیشا

پر سجے بلوں میں کمی نہ آئی۔ مختصر سی بات کر کے وہ آفس جا چکا تھا۔ پیچھے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے زارا نے ہمیشہ کی طرح دعاؤں کا حصار باندھا اور روزمرہ کے کاموں میں لگ گئی۔

رضوانہ اور عمرانہ صبح سے خریداری کے لیے نکلی ہوئی تھیں۔ ایان اور مشعل اسکول سے آئے تو اس نے دونوں کو اپنے پاس ہی روک لیا۔ شہناز کے لیے کھانا وہ اوپر ہی لے گئی تھی۔ عمر کے تقاضے کے باعث سیڑھیاں اترنا چڑھنا مشکل تھا۔

''ایان اور مشعل آ گئے ہیں اسکول سے۔ میں کھانا کھلا کر اوپر بھیج دوں گی آپ کے پاس۔''

کھانا رکھ کر وہ پانی لینے کے لیے مڑتے ہوئے انہیں مطلع کر رہی تھی۔

''فون کر کے پوچھو کب تک آئیں گی وہ دونوں۔'' ساس کے حکم پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اسی اثنا میں رضوانہ ہانپتی ہوئی سامنے سے آتی دکھائی دیں۔

''ہائے اللہ! اتنی ساری سیڑھیاں ہیں میری تو آدھی زندگی انہیں ناپتے گزر گئی۔'' کوفت سے بڑبڑاتے ہوئے وہ آتے ہی بستر پر ڈھے گئیں۔

''عمرانہ کہاں ہے اور یہ تم خالی ہاتھ جھلاتی ہوئی آ گئی ہو۔ بازار لینے کیا گئی تھیں۔''

شہناز نے ٹھٹک کر رضوانہ کے خالی ہاتھوں کو دیکھا جہاں بازار سے واپسی کے اثرات ناپید تھے۔

''مجھے تو عمرانہ گھسیٹ کر لے گئی تھی۔ کوئی چیز اس کی ناک تلے آئے تو بات ہے، کھپ کھپ کر تھک گئے۔ میری تو بس ہو گئی۔ اللہ بھلا کرے احسن کا۔ وہ مل گیا ہمیں وہاں۔ اب اس کے ساتھ ہی آئے گی۔'' رضوانہ کے جواب پر زارا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات در آئے جبکہ شہناز سر ہلا کر رہ گئیں۔ نیچے آتے ہی اس نے احسن کے نمبر پر کال کی مگر جواب ندارد۔

''آفس سے اتنی جلدی چھٹی کیسے ملی اور بازار کیا کرنے گئے ہیں یہ۔'' خود کلامی کرتے ہوئے وہ مسلسل ٹہل رہی تھی۔ دل پہلے ہی احسن کے عجیب و غریب رویہ پر پریشان تھا۔ اب اور تفکرات کی لپیٹ میں آ گیا۔ تھک کر وہ بستر پر پیر سکیڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ فون پر بجتی مدھر سی دھن نے کمرے کا جمود توڑا۔

بے دلی سے کال اٹینڈ کرتے اس نے سلام کیا تو آگے سے احد کی آواز سنائی دی۔ احد اس کا تایا زاد تھا۔ زارا اور علینہ دو ہی بہنیں تھیں۔ احد اس سے دو سال چھوٹا تھا اور اسے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ سلام دعا حال احوال کے بعد اس نے فون زارا کی امی کو تھما دیا۔ ان سے بات کرتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا اور ایک گھنٹہ گزر گیا اس نے امی سے کہہ کر علینہ (بہن) سے بات کی۔

''فون کدھر ہے تمہارا۔ نمبر بند جا رہا ہے۔'' اس کی آواز سنتے ہی زارا نے پوچھا۔

''آپی! فون گر گیا تھا تو اسکرین بیمار ہو گئی ہے، طبیعت کی بحالی کے لیے طبیب انکل مطلب دکان دار کے ہاں پڑا ہے۔ شام تک آ جائے گا۔'' مزاحیہ پیرائے میں بتاتے ہوئے اس کی ہنسی نکل گئی۔ زارا نے فہمائشی نظروں سے فون کو گھورا تھا پھر چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ فون رکھ کر بستر سے اتر کر وہ باہر آئی تو سامنے سے آتے احسن اور عمرانہ کو دیکھ کر پیشانی کی رگیں تن گئیں۔

عمرانہ کا انداز لیے ہوئے تھا جسے بری طرح نظر انداز کرتی وہ احسن کی جانب بڑھی۔ بھرپور طریقے سے مسکراتے ہوئے عمرانہ اتر اکر سیڑھیاں چڑھی تھی۔ کمرے میں آ کر احسن نے ٹائی ڈھیلی کر کے صوفے پر اچھالی اور جوتوں سمیت بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

زارا نے اس کا تھکا سا انداز دیکھ کر آگے بڑھ کر جوتے اتارنے چاہے مگر وہ فوراً سیدھا ہو گیا۔

''کیا کر رہی ہو یہ۔ مجھے نہیں پسند۔'' اسے اپنے جوتوں کو ہاتھ لگاتا دیکھ کر وہ بولا۔

''اور مجھے بھی یہ نہیں پسند۔'' زارا کا اشارہ جوتوں سمیت لیٹنے پر تھا۔ اس کا اشارہ جان کر اس

نے دھیرے سے پیر جوتوں کی قید سے آزاد کیے اور پھر سے نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ زارا چائے بنانے چلی گئی۔ جب وہ چائے بنا کر واپس آئی تب بھی احسن اسی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔

''چائے لے لیں احسن!'' اس کی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا پانی کا گلاس۔ سر درد کی گولیاں اور چائے ٹرے میں سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ یونہی اس کا خاموش خیال رکھتی تھی۔ خاموشی سے دوا کھا کر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے وہ کھڑا ہوا اور صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

''آج آفس سے جلدی چھٹی کیسے مل گئی؟'' اس کے برابر بیٹھتے ہوئے زارا نے سوال داغا۔

''ایک دوست نے شادی کی ٹریٹ دی تھی ریسٹورنٹ میں اس لیے آدھی چھٹی لی تھی آفس سے۔''

''اور بھابھی کہاں ملیں آپ کو۔'' اس نے جان بوجھ کر عمرانہ کا نام نہیں لیا تھا۔

''وہیں ہوٹل کے قریب ہی شاپنگ مال ہے چھوٹا سا۔ واپسی پر راستے میں مل گئی تھیں۔'' احسن کا انداز نپا تلا تھا۔

''میں کب سے انتظار کر رہی تھی آپ کا۔'' ہلکے پھلکے انداز میں زارا نے شکوہ کیا۔

''تم سے انتظار نہیں ہو رہا تھا تو اپنے کزن احد سے بات کر لیتیں۔'' اس کے منہ سے نکلے غیر متوقع طنز پر وہ ششدر رہ گئی تھی۔

''کیا مطلب..... کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ۔'' اندر اٹھتے اشتعال کو بمشکل دبا کر وہ متوازن لہجے میں بولی۔

''اس میں مطلب کہاں سے آ گیا۔ کیا تم اپنے کزن سے بات نہیں کرتی ہو۔'' اس نے الٹا سوال کر دیا۔ زارا نے لب بھینچ کر نفی میں سر ہلایا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ احسن کے اس عجیب سے رویے نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ غصہ۔ شک۔ جرح اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھے مگر اب ہو گئے تھے۔

زندگی کی اتنی بڑی کمی کا کرب تھا۔ کیسے ممکن تھا نہ رُلاتا..... لاؤنج میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھوں کو برسنے کا اذن دیا تھا۔ اور ہر رات کی طرح آج بھی چھما چھم برسات شروع ہو گئی تھی جو یقیناً جلد تھمنے والی نہیں تھی۔

میز پر پڑی ٹھنڈی ہوتی چائے پر بالائی کی تہ جم چکی تھی۔ کچھ دیر بعد احسن نے باہر آ کر دیکھا تو وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے غالباً سو رہی تھی۔ جانے کس خیال کے تحت اس نے زارا کا موبائل اٹھا کر چیک کیا تو دوپہر میں آئی۔ ایک گھنٹہ دس منٹ کی کال منہ چڑا رہی تھی۔ احد کے نمبر سے آئی کال دیکھ کر اس کے لبوں پر اک تلخ مسکراہٹ ابھری تھی۔ ہتھیلی کے وسط میں دھرے موبائل کو زور سے بھینچ کر اس نے فرسٹریشن نکالنی چاہی تھی۔

مگر رضوانہ بھابھی کی آمد کے سبب ایسا نہ کر پایا۔ ان کی آنکھ کے اشارے پر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا تھا جہاں شہناز اس کی منتظر تھیں۔ خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑا تھا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے تھے۔

''اب کیا سوچا ہے تم نے؟'' شہناز نے لب کشائی کی۔

''کس بارے میں؟'' اس کے سوالیہ انداز انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

''مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ تمہاری بیوی بانجھ ہے، اب اسے ساتھ رکھنے کا کیا جواز بنتا ہے۔'' تیز لہجے میں بولیں۔

''محبت سے بنے تعلق بے جواز ہوتے ہیں اماں۔'' وہ ہنوز سر جھکائے ہوئے تھا۔ شہناز کو تپ چڑھ گئی۔

''سوکھے دھانوں پر پانی پڑنے کی امید۔ وقوفی ہے میاں! تم چاہتے ہو کہ تم اس عورت کی وجہ سے ساری زندگی بے اولاد رہو اور میں چپ چاپ تماشہ دیکھ کر دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ ہرگز نہیں

اسے فارغ کر کے دوسری شادی کرو۔ تمہارے بچے دیکھنے کے ارمان کو میں حسرت نہیں بننے دوں گی۔'' قطعی لہجہ میں بات کر کے انہوں نے ہنکارا بھرا۔

احسن نے جھکا سر اٹھا کر بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں احسن! تم لاکھ انکار کرو مگر اولاد کی خواہش عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ شدید ہوتی جاتی ہے۔ یہ میٹھا میوہ سب کو چاہیے ہوتا ہے محض محبت کی خاطر تم ساری زندگی اس نعمت کے لیے ترس کر گزارو گے کیا۔'' بڑے پیار سے رضوانہ نے اسے سمجھایا۔

''جو عورت اپنے میاں سے وفا نہ کر سکے۔ جھوٹ بولے کیا، وہ اس لائق ہوتی ہے کہ اس پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ پوری زندگی گزاری جائے۔'' شہناز نے نیا پتا پھینکا۔

''جھوٹا شخص کبھی اپنا نہیں ہوتا۔ اپنی زندگی ضائع مت کرو احسن!'' رضوانہ نے اس کے شانے کو ہلکا سا دبایا۔ ایک نظر انہیں دیکھ کر اس نے اپنی ماں کو دیکھا، جو جواب طلب نظروں سے اسی کی جانب دیکھ رہی تھیں اور پھر کسی کی بات کا کوئی بھی جواب دیے بنا اٹھ کر نیچے چلا آیا۔

''احسن! کھانے میں کیا بنا.....'' زارا کی بات منہ میں رہ گئی وہ داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تھا

''کیا ہو گیا ہے انہیں۔'' شدید پریشانی کے عالم میں جھک کر نیچے بیٹھتے ہوئے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور پھر چند لمحوں بعد اس کیفیت سے باہر نکل کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ احسن کی پسند کا کھانا بنا کر وہ اس کی واپسی کی منتظر تھی، جب فون بجا۔ دوسری جانب امی تھیں۔

''امی! خیریت ہے۔'' عروہ کے نمبر سے آتی کال دیکھ کر وہ تشویش سے بولی۔

ابھی دوپہر میں اس نے بات کی تھی سب سے.....

''ہاں..... ہاں! سب خیریت ہے۔'' ان کی چہکتی آواز سن کر وہ ایک دم پرسکون ہو گئی۔ ورنہ اس اچانک آنے والی کال نے اس کے دل کو خدشات میں دھکیل دیا تھا۔

''بہت بڑی خوشی کی خبر ہے۔ عروہ نے بہت منع کیا کہ ابھی نہ بتاؤں مگر مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' ان کی آواز میں ڈھیروں خوشیاں پنہاں تھیں۔ زارا بے تاب ہوئی تھی۔

''تمہاری تائی امی نے احد کے لیے عروہ کو مانگ لیا ہے۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے اللہ کا شکر ادا کروں۔ میری بہت بڑی خواہش تھی یہ مگر خود سے کہتے ہوئے شرم آتی تھی۔ تمہارے ابو کی وفات کے بعد تم دونوں پر آنے والی ہر مشکل کو تمہارے تایا ابو نے آسان کیا اور آج میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل حل کر کے اپنا احسان مند کر دیا ہے۔'' کہتے کہتے ان کی آواز میں نمی گھل گئی۔

''امی! بہت بہت مبارک ہو۔ مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ فون دیجیے گا ذرا عروہ کو۔'' خبر سن کر وہ پرجوش ہو گئی تھی۔

''بھئی! یہ فون نہیں لے رہی شرما رہی ہے۔'' امی کی ہنستی آواز سن کر وہ بے حد پرسکون ہو گئی تھی۔

''دلہن کو تو میں بعد میں دیکھ لوں گی، پہلے ذرا دولہے میاں کی خبر لے لوں۔'' شرارت سے کہتے ہوئے اس نے جلدی سے فون بند کر کے احد کا نمبر ملایا۔

''ہاں بھئی! مبارک باد نہیں لینی میاں۔'' آخری بیل پر کال ریسیو ہوتا دیکھ کر وہ خالصتاً بزرگوں والے انداز میں بولی۔ آواز سے شرارت صاف ظاہر تھی۔

''خیر مبارررک! خیر مبارررک بڑی اماں۔'' مبارک پر زور دیتے ہوئے وہ بھی شریر ہوا۔

''کب آ رہی ہیں آپی آپ یہاں۔'' احد نے سوال کیا۔

''ابھی تو نہیں آ سکتی بچے!'' احسن کا رویہ سوچ کر وہ یکلخت سنجیدہ ہوئی۔

''کیوں اب احسن بھائی اتنے مجنوں ہوگئے ہیں کہ ہمیں آپ کی شکل دیکھنے کو بھی ترسائیں گے۔'' وہ جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا۔ زارا کے دل میں سے اداسی اتر آئی۔

''میرے میاں کے بارے میں کیسے الفاظ استعمال کررہے ہولڑکے!'' اس نے مصنوعی پن سے لتاڑا۔

''اوہ! اتنی محبت۔'' وہ پھر سے شریر ہوا۔

''تم نہیں سمجھو گے اس محبت کو ابھی۔'' ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے رخ موڑا تو احسن کمرے میں قدم رکھ رہا تھا۔

''میں بعد میں بات کرتی ہوں۔'' فون رکھ کر وہ تیزی سے اس کی جانب آئی۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ!'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر استفسار کرنے لگی مگر اگلے ہی پل اس کی لہو رنگ آنکھیں دیکھ کر دہل گئی۔ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے وہ بستر پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔

''آخر مسئلہ کیا ہے۔ کیوں کررہے ہیں میرے ساتھ ایسا۔ قصور کیا ہے میرا'' اس کے تیور دیکھ کر زارا نے اپنا لہجہ حتی المقدور نرم ہی رکھا تھا۔

''احسن! جواب دیں مجھے۔'' وہ اب ذرا سختی سے بضد ہوئی۔

''احسن! شہناز چاچی پوچھ.....'' بے پروائی سے اندر داخل ہوتی عمرانہ کی زبان کو یکلخت بریک لگا۔ زارا نے ناگوار نظروں سے اس کا دھڑلے سے کمرے میں داخل ہونا دیکھا تھا۔

''اتنی اخلاقیات تو ہونی چاہیے انسان میں کہ کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دستک دے دے۔'' وہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی اس لیے ذرا تلخی سے بولی۔

شرمندہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے وہ معذرت کرتے ہوئے واپس مڑ گئی تھی۔ بری طرح بل کھاتے ہوئے عمرانہ نے باہر آکر پیر زور سے زمین پر پٹخا تھا۔

''یہ کس طرح بات کی ہے تم نے عمرانہ سے۔'' احسن نے کڑے انداز میں پوچھا۔ زارا کے تو سر پہ لگی اور تلووں میں جا بجھی۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں آپ سے کچھ پوچھ رہی تھی تب آپ کے پاس جواب نہیں تھا۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔

''میں اس بات کی تمہیں قطعی اجازت نہیں دوں گا کہ تم میرے کسی بھی فیملی ممبر سے بدتمیزی کرو۔'' انگلی اٹھا کر قطعیت بھری وارننگ دی گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''میں نے آج تک کبھی کسی سے کوئی بدتمیزی نہیں کی احسن!'' اس نے دکھ سے کہا۔

''آپ مجھے نظرانداز کریں۔ مجھ سے حقارت سے بات کریں یا مجھ سے بے رخی برتیں۔ بنا جرم میں بھی آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گی احسن!'' بھرائے ہوئے لہجے میں کہتی وہ وہاں سے چلی گئی۔ احسن نے تھک کر بیڈ کی پشت سے سر ٹکا تھا۔

سرخ آنکھوں میں جونہی اس کا جھوٹ لہرایا وہ سختی سے آنکھیں میچ گیا۔ اس کے آنکھیں بند کرنے سے اک ننھا سا آنسو پلکوں کی جڑوں میں ہی گم ہو کر رہ گیا تھا۔ زارا ابھی دوسرے کمرے میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اسے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس کا قصور کیا ہے۔ کبھی ذہن عمرانہ کی طرف جاتا تو کبھی دفتر کے بکھیڑوں کی طرف۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ روتے روتے وہ وہیں تھک کر سو گئی۔

اگلے روز پھر شہناز نے اسے بلایا تھا۔ مگر ان کے بلاوے پر اوپر نہیں گیا تھا۔ ذہنی دباؤ نے اس کا سکون برباد کردیا تھا۔ کنپٹی سہلاتے ہوئے آنکھیں موندے پڑا تھا جب عمرانہ نیچے اسے بلا آئی۔

''آپ کو شہناز چاچی بلا رہی ہیں احسن!''

''میں نہیں آرہا۔ بہت تھکا ہوا ہوں انہیں

کل آجاؤں گا۔'' مسلسل سر دباتے ہوئے وہ بولا۔

''دوا لی ہے آپ نے۔'' اسے نڈھال دیکھ کر نہایت فکرمندی سے وہ اس پر جھکی۔

''دوا میں دے چکی ہوں۔''

پیچھے سے زارا کا دوٹوک انداز سنائی دیا تو وہ منہ بناتی چل دی۔ زارا نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ کر اسے دیکھا اور پھر رخ موڑ کر احسن کو دیکھنے لگی۔ جب بھی اس کے سر میں درد ہوتا تھا وہ اپنی گود میں سر رکھ کے مالش کرتی تھی۔ آج اتنے فاصلے آگئے تھے کہ اس نے صرف دوا لینے پر اکتفا کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں کو تکتے ہوئے ایک دم خالی پن سا اس کے دل میں اتر آیا تھا۔ آنکھ سے لڑھکتے آنسو کو دائیں ہاتھ سے صاف کرتی وہ واپس مڑ گئی تھی۔

اگلے روز دفتر سے واپسی پر وہ سیدھا اوپر چلا آیا تھا۔ دل تو بالکل بھی نہیں کر رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ شہناز نے اسے دیکھتے ہی سونے کا ارادہ ترک کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

رضوانہ بھی جھٹ سے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ سلام اور حال احوال کے بعد وہ ڈائریکٹ اس سے فیصلے کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ احسن جی بھر کر بے زار ہوا۔

''اماں! میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔'' انداز جھلایا ہوا تھا وہ بھڑک اٹھیں۔

''تو کیا بے اولاد مرے گا۔ ایک بانجھ عورت کے ساتھ کون گزارا کرتا ہے اور پھر وہ خالی بانجھ نہیں ہے۔ جھوٹی اور خراب عورت ہے تیرا دل کیسے کرتا ہے اس کے ساتھ رہنے کو۔''

لفظ ''خراب'' پر وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں احسن! میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے وہ اپنے کسی کزن احد سے لمبی لمبی باتیں کرتی ہے۔'' رضوانہ نے بھی سچ جھوٹ ملا کر ساس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جبکہ سچ تو یہ تھا کہ اس نے سوائے ایک دو بار کے کبھی زارا کو احد سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا مگر اس وقت لوہا گرم کرنا اور اس پر چوٹ لگانا بہت ضروری تھا تب ہی مبالغہ آرائی سے کام لے گئی۔

''ایک شادی شدہ عورت کی کیا تک بنتی ہے کہ وہ اپنے کزنز کے ساتھ لمبی چوڑی کپیں ہانکے۔ بتاؤ مجھے۔ تم تو اندھے عاشق ہو میاں مگر ہماری آنکھیں کھلی ہیں۔'' ان کا طنز احسن کو سرتاپا سلگا گیا تھا۔ دروازے کو ٹھوکر مار کر باہر نکلتے ہوئے وہ سخت غصے میں تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر طیش دباتے ہوئے وہ پوری قوت سے داخلی دروازہ بند کر کے گیا تھا کہ اندر بیٹھی زارا بری طرح لرز گئی تھی۔ راستے میں آئی ہر چیز کو ٹھوکریں مارتا وہ پارکنگ ایریا کے بینچ پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔

سر دونوں ہاتھوں میں گرائے وہ اب تکلیف کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار زارا کا جملہ گونج رہا تھا۔

''تم نہیں سمجھو گے اس محبت کو ابھی۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسلسل پیشانی مسل رہا تھا۔

''میں تمہیں اس بے وفائی کی اجازت نہیں دوں گا زارا بیگم۔'' وہ اب بڑبڑاتے ہوئے زمین کو گھورنے لگا۔ کئی گھنٹے اسی جگہ پر گزار کر اس نے واپس گھر کی راہ لی تھی۔

☆☆☆

اب شب و روز یاسیت لیے سست روی سے ڈھلنے لگے تھے۔ احسن کا دھوپ چھاؤں سا رویہ اسے اندر ہی اندر توڑ رہا تھا۔ زندگی کا یہ پہلو اس کی مسکراہٹ نگل چکا تھا۔ اتنے سال احسن کی محبت کو اتنے قریب — پایا تھا اب جو یکلخت ان دیکھی سی اجنبیت آن پڑی تھی اس نے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لی تھیں۔

احسن کی بے رخی کی بابت وہ چونکہ کئی بار پوچھ کر اپنی بے عزتی کروا چکی تھی۔ اس لیے بالکل خاموش تھی مگر کب تک یوں رہتی۔ محبت اور رشتے کی

نزاکت نے اسے پھر سے جھکنے پر مجبور کردیا

ہفتے کا دن تھا آج بہت دنوں بعد اس کا پہلے کی طرح تیار ہونے کو دل کیا تھا۔ احسن کے پسندیدہ رنگ کا جوڑا منتخب کرکے اس نے استری کرکے صوفے پر رکھا۔ ساتھ میچنگ زیورات بھی نکالے اور نہانے چلی گئی۔ نہا کر وہ ابھی تیار ہو ہی رہی تھی کہ احد کی کال آگئی وہ ملنے آرہا تھا۔ اسے سن کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ تیزی سے باورچی خانے میں آکر اس نے فٹافٹ کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنا چاہا۔

''بہت خوش لگ رہی ہو خیریت ہے۔'' تجسس سے رضوانہ نے پوچھا جو آج بہت کھل رہی تھی۔

''جی بھابھی! دراصل آج میرے تایا ابو کا بیٹا احد آرہا ہے۔ امی نے علینہ کا رشتہ طے کردیا ہے ناں احد کے ساتھ۔ فی الحال میں تو جا نہیں سکتی اس لیے امی نے اس کے ہاتھ کچھ سامان بھیجا ہے۔'' سیدھے سادھے لفظوں میں بتاتے ہوئے وہ بہت خوش تھی۔ رضوانہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور موبائل نکال کر احسن کے نمبر پر کال ملانے لگیں۔ انجام کیا ہونا تھا وہ نہیں جانتی تھیں مگر وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں سو بڑے تحمل اور سمجھداری سے انہوں نے ڈرامائی انداز میں سیدھی سی بات کو پیش کیا تھا۔ اب انہیں احسن کے آنے کا انتظار تھا۔

کچھ فریز کی ہوئی ایک دو چیزیں تھیں باقی تھوڑا بہت اس نے گھر پر بنالیا تھا۔ پلیٹیں سیٹ کرکے اس نے جلدی سے کپ نکالے کہ گھنٹی بج اٹھی بھاگ کر دروازہ کھولتے ہوئے اس نے بڑے وقار سے سلام کیا۔ اتنے دنوں بعد کسی اپنے کی صورت دیکھ کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

''آجاؤ اندر آؤ۔'' وہ اسے لیے لاؤنج میں آگئی۔ ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز اور بڑے بڑے ڈبے احد نے اسے پکڑائے تھے۔

''اتنا سارا سامان۔''

''جی ہاں! آپ کے اور آپ کی ساس کے لیے کچھ جوڑے ہیں۔ چچی کے ہاتھ سے بنے آپ کے پسندیدہ پکوان ہیں اور دو مٹھائی کے ڈبے ہیں۔ ایک چچی نے بھیجا ہے اور ایک میری طرف سے۔'' اس نے بیٹھتے ہوئے تفصیل بتائی۔ زارا اشتیاق سے چیزیں نکال کر دیکھنے لگی۔

''اب دو دو رشتے ہیں تمہاری طرف۔ دھیان رکھنا جو میری بہن کو کچھ کہا تو بڑی بہن اور بڑی سالی ہونے کے ناتے کان کھینچ لوں گی تمہارے۔'' مٹھائی کا ڈبہ کھولتے ہوئے وہ شرارت سے بولی

''توبہ کریں آپی! میری یہ مجال کہ میں اسے کچھ کہوں۔'' کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے وہ بھی اسی کے انداز میں گویا ہوا۔

''چلو بھئی دو لہے میاں! منہ میٹھا کرو۔'' رس گلہ اس کے منہ میں ٹھونستے ہوئے وہ بڑے پن سے بولی۔

''کیا تماشا ہے یہ۔'' احسن کی اچانک دھاڑ پر وہ کرنٹ کھا کر اچھلی تھی۔

''آ..... آپ.....'' اس کی بے وقت آمد پر وہ حیران ہوئی۔

''السلام علیکم احسن بھائی!'' احد نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرنا چاہا جسے وہ بری طرح نظر انداز کرگیا۔ وہ خجل سا ہو کر رہ گیا جبکہ اس ہتک پر زارا کی پیشانی پر لکیریں بچھ گئیں۔

''حیران کیوں ہو رہی ہو۔ تمہارے شغل میں مداخلت ہوگئی ہے۔'' دونوں بازو سینے پر لپیٹے ہو وہ چبا کر بولا۔

''یہ شغل کا لفظ کس ضمن میں استعمال کیا ہے وضاحت دینا پسند کریں گے آپ۔'' اس کے تیو دیکھ کر زارا کا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ وہ غلط سوچ رہا ہے۔

''مجھے وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے یہ سارے تحائف اٹھاؤ اور اپنے اس چہیتے کے ساتھ چلتی بنو۔''

''مائنڈ یور لینگویج احسن بھائی۔'' احد ضبط کرکے ناگواری سے بولا۔

''تم اپنے کرتوت درست کرلو۔ میں اپنی زبان درست کرلوں گا۔'' اس کی طرف انگلی اٹھا کر وہ سختی سے بولا۔

''آپ حد سے بڑھ رہے ہیں احسن!'' زارا نے تحمل سے کہا۔

''حد سے تم بڑھی ہو۔ جب حد کا تعین ہوجائے تو اس گھر میں قدم رکھنا۔ فی الحال گیٹ لاسٹ۔'' اس کے لہجے اور الزام پر وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔

''آپ مجھ پر شک کررہے ہیں۔ میرے کردار پر الزام لگا رہے ہیں۔'' اتنی گھٹیا سوچ پر وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔

''الزام نہیں لگا رہا بی بی! ٹھیک کہہ رہا ہے میرا بیٹا۔ کسی کھاتے کی کھیتی نہیں ہو تم۔ ویران۔ اجاڑ۔ بنجر۔ بانجھ اور تیور دیکھو ذرا اپنے۔'' رضوانہ کے سہارے بمشکل سیڑھیاں طے کرکے نیچے آتی شہناز نے بری طرح لتاڑا تھا۔ زارا کا وجود جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔

''بانجھ نہیں ہوں میں۔'' وہ تڑپ کر اس نئی بات پر صدمے سے چیخی۔

''اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے، اپنی آنکھوں سے نظارے دیکھ کر بھی اس کھی کو نگلنے کو تیار بیٹھا ہے۔ تیرے جیسا بے غیرت میں نے آج تک نہیں دیکھا۔'' وہ اب احسن کو آڑے ہاتھوں لے رہی تھیں۔

''چپ کریں آپ۔ شرم نہیں آتی آپ کو۔ تین بیٹیاں ہیں آپ کی اور کیسے منہ بھر کر جھوٹ بول رہی ہیں آپ اور جس نظارے کی آپ بات کررہی ہیں تو ایسے کئی نظارے احسن اور عمرانہ کے بیچ بھی ہوئے ہیں میں بھی حساب مانگوں اب۔'' ساس کے مقابل آکر وہ روتے ہوئے بولی۔ ایسے گھٹیا الزامات نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔

''بکواس بند کرو۔'' احسن نے اسے شانوں سے تھام کر جبڑے بھینچے۔

''اپنی ذہنیت کا گند میری بہن پر مت اچھالو۔ یہ لچھن تمہیں ہی مبارک ہوں۔'' رضوانہ نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔ زارا نے تاسف سے لبریز نگاہ بھابھی پر ڈالی تھی وہ کیا سمجھی تھی انہیں اور کیا نکلی تھیں وہ.....

''میرے الزام پر تکلیف ہورہی ہے۔ آپ کا الزام بھی پھول نہیں ہے جسے ہنس کر سہہ لوں۔ میرے کردار پر بات آئی ہے احسن!'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ احد اس سارے معاملے پر سخت بوکھلا گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے۔

''میرے ساتھ چلیں آپ۔ یہاں نہیں رہیں گی۔'' اسے جو سمجھ میں آیا اس نے کہہ دیا۔ احسن استہزائیہ ہنسا۔

''ہاں ہاں لے جاؤ اسے مگر واپس نہ لانا۔'' اس نے غرا کر کہا۔

''میں کہیں نہیں جارہی۔ یہ میرا گھر ہے اور میں یہیں رہوں گی۔'' آنسو بھری سرخ آنکھیں لیے وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''نہ یہ گھر تمہارا ہے اور نہ ہی میں تمہارا ہوں۔ میں آج تمہیں اس کھوکھلے اور جھوٹے تعلق سے آزاد کرتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں زارا احسن۔'' اس کی بے جان ہوتی آنکھوں میں دیکھ کر احسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''احسن نہیں.....'' اس نے تڑپ کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''احسن میں آپ سے محبت کرتی ہوں بخدا۔'' سسکتی ہوئی کانپتی آواز کی التجا و پکار بے اثر گئی اور ہمیشہ کی طرح محبت کے دعوے دار بے اعتباری کی سیڑھیاں ٹاپ کر اوپر چڑھتے اعتبار کو نیچے چھوڑ گئے۔ احد نے گرتی ہوئی زارا کو بڑھ کر سنبھالا تھا۔

رضوانہ کی تو عید ہوگئی تھی عمرانہ نے نخوت سے ناک چڑھایا تو شہناز نے بے زاری سے اس کے شکست خوردہ وجود کو دیکھا اور سب وہاں سے گویا

مفت تماشا دیکھ کر ہاتھ جھاڑتے چلتے بنے۔ ساکت نظروں سے احسن کے پلٹنے کو دیکھتے ہوئے وہ نیچے ڈھے گئی تھی۔ کلیجہ پھٹ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ احد بھی آنسو ضبط کیے اس کے ساتھ نیچے بیٹھا تھا۔ کتنی خوشی سے وہ یہاں آیا تھا اور کیسی قیامت اپنے ساتھ واپس لے کر جا رہی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ خود کو ذمہ دار سمجھتے ہوئے اس کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ احسن اتنا کم ظرف ہوگا۔ جبکہ وہ احد کو جانتا تھا کہ زارا کے ساتھ اس کا کیسا رشتہ ہے۔ زارا کا کوئی بھائی نہیں تھا اس نے اپنی آدھی زندگی چچی کے گھر زارا اور علینہ کے ساتھ کھیل کود کر گزاری تھی اور احسن یہ بات اچھے سے جانتا تھا پھر بھی اپنے تعلق کو شک کی بھٹی میں جھونک گیا تھا۔

''زارا آپی! اٹھیں، گھر چلیں۔'' اس نے صدمے سے چور زارا کا بازو ہلا کر رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ زارا نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ احد کا دل کند چھری سے ذبح ہو گیا تھا۔

''اٹھیں پلیز۔'' وہ اب اک لمحے کے لیے یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ زارا نے اک طائرانہ نگاہ گھر پر ڈالی تھی۔ صوفے پر رکھے تمام بیگز الٹ پلٹ ہو چکے تھے۔ مٹھائی کے ادھ کھلے ڈبے میں سے جھانکتی گلاب جامنیں کسی خوشی کی منتظر تھیں۔ زمین پر گرے ادھ کھائے رس گلے سے شیرا نکل کر فرش کو نم کر رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔

سکتہ ٹوٹا تو آنسو اس شدت سے نکلے کہ وہ دھاڑیں مارنے لگی۔ احد نے بے بسی سے اسے تڑپتے ہوئے دیکھا اور آنکھیں رگڑنے لگا۔ وہ اونچا اونچا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جب تک اس کے گلے میں خراشیں نہیں پڑ گئیں وہ چیخ چیخ کر روتی رہی۔ احسن کی حرکت نے اس کا دل نوچ لیا تھا۔ احد نے بمشکل اسے سنبھالا اور جیسے تیسے گھر لے گیا۔ گھر جاتے ہی امی کے گلے لگتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی تھی

☆☆☆

بارش تھم چکی تھی مگر بادلوں کا راج پاٹ آسمان پر بدستور قائم تھا۔ سفید بادل تو ناراض ہو کر گم ہو گئے تھے البتہ سیاہ بادل پورے طمطراق سے تاحد نگاہ براجمان تھے۔ داخلی دروازے کی گھنٹی بجاتے ہوئے وہ شدید غصے میں تھی۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم؟ کبھی موسم کو دیکھ کر بھی چل لیا کرو۔ وقت بے وقت بازار جانا ہوتا ہے تمہیں بھی۔''

وہ اس کے لیے کب سے پریشان ہو رہا تھا اسی لیے دروازہ کھولتے ہی اسے سامنے دیکھ کر بول اٹھا مگر اگلے ہی پل اس کا لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''کیا ہوا ہے۔ کس کے ساتھ آئی ہو۔'' دروازے سے باہر جھانک کر اس نے گلی میں جھانکا۔ گلی کے نکڑ تک سوائے بچوں کے تھرکتے۔ بھاگتے وجود کے کچھ دکھائی نہ دیا۔

''سابقہ سوکن کے''

اس کے نخوت بھرے انداز پر وہ چونک کر پلٹا۔

''کیا کہا۔ کہاں ملی وہ تمہیں۔''

''جہاں بھی ملی۔ محترمہ بڑے ٹھاٹ باٹھ میں ہیں۔ خوب پیسے والا بندہ رکھایا ہے۔ کیا ٹور ہے اس کی۔'' بری طرح جلتے کلستے ہوئے وہ شدید حسد کا شکار تھی۔ زارا کی گائنا کالوجسٹ کے کلینک کے باہر ملنے والی بات وہ گول مول کر گئی تھی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اس کے ساتھ آنے کی۔'' اب کی بار احسن تڑخ کر بولا۔

''ضرورت تھی تو بیٹھی اس کی گاڑی میں۔ ایسی طوفانی بارش شروع ہو گئی تھی کہ اللہ کی پناہ۔ پھر اس نے خود ہی لفٹ دی تو میں بنا کچھ سوچے سمجھے بیٹھ گئی۔'' وہ یہ بات دانستہ چھپا گئی تھی کہ وہ اپنے بجٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیٹھی تھی۔

''جو بھی ہے تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا اس کے ساتھ۔ خواہ مخواہ کا احسان لیا۔'' احسن بڑبڑاتے ہوئے اندر بڑھ گیا تو وہ بھی سر جھٹکتے ہوئے اس کے پیچھے چل دی۔

اگلے روز بارش کے باعث موسم میں خنکی گھلی

تھی۔ ہفتے کا آخری دن تھا۔ کام کے بوجھ تلے ملازمین کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ تاکہ جلد از جلد فارغ ہو کر گھروں کی راہ لیں اور اتوار کی چھٹی کے سکون کو محسوس کریں۔

شام کو دفتر سے واپسی پر وہ بھی بہت عجلت میں تھا مگر اس عجلت کی وجہ کام نہیں بلکہ وہ لفافہ تھا جو آج دن میں اسے دفتر کے پتے پر موصول ہوا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے پیروں کو جوتے کی قید سے آزاد کیا۔

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اسے اتار کر میز پر ہی رکھ دیا۔ شرٹ کے بٹن کھولنے کے بعد اس نے لفافہ اٹھایا اور تجسس سے کھولنے لگا۔

''لو بھئی! آتے ہی شروع ہو گئے پھر سے کاموں میں۔'' عمرانہ نے داخل ہوتے ہی دہائی دی۔

''آج ہم نے کھانا باہر کھانا ہے یاد ہے ناں۔'' وہ اک ادا سے بولی مگر وہ متوجہ ہی کب تھا۔

''جاؤ چائے لے کر آؤ۔'' اس کی بے وقت کی مداخلت روکنے کے لیے احسن نے جلدی سے کہا

''بن رہی ہے چائے۔ ابھی لے کر آتی ہوں۔'' وہ جو اس کے برابر میں بیٹھنے ہی والی تھی۔ اس حکم پر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ لفافے میں سے ایک فائل اور ایک سنگل صفحہ تہہ کیا ہوا نکلا تھا۔ اس نے صفحہ کی تہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ خط کے شروع میں سلام اور آداب کی چند لائنیں خالی چھوڑی گئی تھیں۔

''میں یہ لکھنا ہرگز نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کا فیصلہ وقت کر دیتا مگر آپ کی بیوی سے مل کر مجھے لگا کہ یہ ضروری ہے۔ یہ خط میری صفائی یا وضاحت نہیں ہے بلکہ آپ کی اور آپ کے گھر والوں کی حقیقت ہے۔ میں نے رپورٹس جھوٹی بنوائی تھیں اس میں کوئی شک نہیں۔''

یہاں تک پڑھنے کے بعد احسن کی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔ خط کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے اس نے غصہ نکالا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی مٹھی بند کیے وہ ماتھے پر بل ڈالے بیٹھا خود کو کمپوز کرتا رہا پھر دوبارہ کھول کر پڑھنے لگا۔

''مگر وہ جھوٹی رپورٹ آپ کی تھی میری نہیں۔ ایک بار اپنی بھابھی سے بھی پوچھ لیجیے گا کہ دراصل جھوٹی رپورٹس کس نے اور کیونکر بنوائیں اور ہاں۔ اپنی امی سے کہہ دیجیے گا، زارا محسن بانجھ نہیں ہے۔ رب اسے اولاد جیسی نعمت سے نوازنے جا رہا ہے البتہ احسن وقار بانجھ ہے۔ ان کا بیٹا ان کی خواہش کو حسرت بنا دے گا۔ اپنی بھابھی اور بیوی کو بھی بتا دیجیے گا جو کسی کی راہ کھوٹی نہیں کرتے اللہ انہیں خوب صورت منزل عطا کرتا ہے اور میری منزل کی خوب صورتی آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ میرے شوہر معراج علی صرف مجھ سے محبت نہیں کرتے بلکہ میرا اعتبار بھی کرتے ہیں۔ یقیناً آپ کی بیوی نے آپ کو میری شادی کے بارے میں آگاہ کر دیا ہوگا۔ ایک آگاہی مجھ سے بھی لے لیں، احد میرا بھائی تھا۔ ہے اور رہے گا اور اب تو وہ باضابطہ طور پر میرا بہنوئی بن چکا ہے۔ جس روز آپ کی بے اعتباری نے تماشا لگایا اس روز وہ مجھے اپنے اور علینہ کے رشتے کی مٹھائی دینے آیا تھا اور اسے امی نے بھیجا تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا مسٹر احسن کہ کس نے آپ کو کیسے ٹریپ کیا مسئلہ یہ تھا کہ آپ کو اپنی محبت پر اعتبار نہیں تھا اور جنہیں اپنے تعلق پر اعتبار نہ ہو ان پر واجب ہے کہ اپنی پوری زندگی سسک کر گزاریں۔

اللہ حافظ

مسز زارا معراج علی!''

تیزی سے خط اک طرف پھینکنے کے بعد اس نے رپورٹس والی فائل کھولی اور ساکت رہ گیا۔ کیسی روح فرسا حقیقت تھی۔ رپورٹ اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گر گئی۔ چائے لاتی عمرانہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر چائے میز پر رکھی اور احسن کا کندھا ہلانے لگی۔

''احسن کیا ہوا ہے..... کیا ہے یہ سب..... کیا لکھا ہے ان میں.....'' وہ اسے جھنجھوڑ کر پوچھ رہی تھی

جس کی سرخ آنکھوں سے پانی اذیت بن کر نکل رہا تھا۔

''احسن.....'' اس نے جونہی اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا وہ ایک جھٹکے سے اسے پیچھے کی جانب دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔ بے یقینی اور جنون کی کیفیت نے اس کے حواس سلب کر لیے اس کا جی چاہا عمرانہ کو دو تھپڑ لگائے۔ رضوانہ بھابھی سے چیخ چیخ کر پوچھے کہ ایسا کیوں کیا مگر پھر کیا حاصل.....

جو کھویا تھا اس میں وہ خود برابر کا قصور وار تھا۔

بکھرتے ہوئے وہ نیچے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ عمرانہ خوف زدہ نظروں سے اس کی حالت دیکھ رہی تھی پھر ڈرتے ڈرتے اس نے ہاتھ بڑھا کر خط والا صفحہ اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

جیسے جیسے وہ الفاظ پڑھتی جا رہی تھی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے بے جان ہاتھوں سے فائل کھولی اور ایک جھٹکے سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا گئی۔ ڈھیر ساری کسک۔ تشنگی معہ کرب و شرمندگی اس کے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ سارے جتن بے کار گئے تھے۔ نہ احسن کی محبت ملی اور نہ ہی اس کے حوالے سے نسل کی پہچان.....

اس کے ادھورے وجود کے ساتھ اب پوری زندگی اسے حسرت سے گزارنی تھی۔ وقت کی چنی گئی سزا بہت دردناک تھی۔

''کوئی فائدہ نہیں ہوا آپی! بساط غلط بچھ گئی۔'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ آنسو بہانے لگی۔ جبکہ دوسری جانب دیوانوں کی طرح زمین کو گھورتے ہوئے احسن مسلسل زلزلے کی زد میں تھا۔

میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اور وہ اس لباس میں موجود چھید کے بھرم کو رکھنا چاہتی تھی مگر اس نے اپنا بھرم خود توڑ دیا۔ نہ صرف خود کو بے لباس کیا بلکہ اپنے تعلق کو بھی شک کے کٹہرے میں کھڑا کر کے سب کے سامنے برہنہ کر دیا۔

''صرف میں ہی نہیں میری محبت بھی بانجھ تھی زارا!'' ہولے سے بڑبڑاتے ہوئے وہ سسک پڑا۔ شرٹ کے ادھ کھلے بٹن۔ بکھرے بال اور شکستہ وجود

.....

کل اسی جگہ پر زارا اس کے لیے تڑپ رہی تھی اور آج وہ اس کے لیے سسک رہا تھا۔ وقت نے خود پر ڈھائے مظالم کا حساب لیا تھا اور وقت کا حساب کتاب دل چیر کر ہی مکمل ہوتا ہے۔

''کانوں کے کچے! تجھے کتنا کہا تھا میں نے سب کی سنتے ہیں مگر مان نہیں لیتے ہیں۔''

☆☆☆

پوری عدت اس نے گویا نیم بے ہوشی میں گزاری تھی۔ احد ہر روز اس سے معافی مانگنے آجاتا تھا اور وہ اس کے بندھے ہاتھ نیچے کرتی رہتی تھی۔ علینہ اور امی ہر وقت نم آنکھیں لیے اس سے نظریں چرائے پھرتی تھیں۔ مسلسل قیامت خیز لمحوں کا سامنا تھا۔

پھر اک روز کسی کے توسط سے معراج علی کا رشتہ آیا اور امی نے تسلی و تشفی کے بعد فوراً ہامی بھر دی۔ وہ روتی تڑپتی اس تعلق سے نفرت کا اظہار کرتی رہ گئی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ زارا کی طلاق کے بعد وہ بالکل ڈھے گئی تھیں۔ دونوں بچیوں کو اپنے گھر بار کا کر کے پرسکون موت مرنے کی خواہش نے زارا کے نالاں وجود کو پھر سے اک نئی جنگ کے لیے تیار کر دیا تھا۔

ماں کے جڑے ہاتھوں کا بھرم رکھتے ہوئے وہ خالی دل سے مان گئی تھی اور پھر بہت جلد علینہ اور زارا کا فرض ادا ہوا۔ یوں وہ اس شخص کی زندگی کا حصہ بنی جو اس کے لیے بہترین شریک حیات ثابت ہوا۔ شادی سے پہلے حرف بہ حرف سچائی بتانے کے بعد اس نے نئے رشتے کے لیے خود کو قائل کیا تھا کہ ماضی کا حوالہ کبھی حال کے لیے دیوار نہ بنے۔

معراج کی پہلی مرحومہ بیوی سے ایک بیٹا یشفہ ہے جو اول روز سے زارا کا پیار اور توجہ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا شوہر نہ بہت حسین ہے اور نہ بہت

تعلیم یافتہ۔ واجبی سی شکل وصورت کے ساتھ واجبی تعلیم مگر بڑے سارے ظرف کے ساتھ ایک خوب صورت دل کا مالک ہے۔ مسلسل مسکراتے ہوئے وہ ساکت پتلیوں کے ساتھ دیوار پر لگے گھڑیال کو تک رہی تھی۔

معراج نے پاس آکر جونہی شانوں سے تھام کر حصار میں لیا، وہ یکلخت چونک کر اس کے کاندھے پر سر رکھ گئی۔ چند لمحے یونہی خاموشی سے سرک گئے۔

''زوجہ پریشان ہیں۔''

اپنے بالوں میں نرم انگلیوں کا لمس محسوس کر کے زارا نے ہلکا سا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''نہیں! زوجہ حیران ہیں۔'' دونوں بازو گردن میں حمائل کرتے ہوئے گہرا بوسہ اس کے لبوں پر پھیلا۔

''وہ کیوں؟'' معراج نے سر ذرا سا پیچھے کر کے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

''زوج سے محبت جو ہوگئی ہے۔'' چہرہ جھکا کر اظہار کیا گیا تھا۔ وہ کھل کر مسکرا دیا۔

''ماما! میں کارٹون دیکھ لوں۔'' یشفہ کی آواز پر وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ چھوٹے سے دوپٹے میں الجھتی وہ پاس آکر زارا سے فرمائشی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''جی بالکل! ادھر آؤ۔'' اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے اس نے چھوٹا سا دوپٹہ سلیقے سے لپیٹا اور اسے اٹھا کر اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا۔ کارٹون میں مگن ہوتی ننھی سی جان اب دھیرے دھیرے سرک کر زارا کی گود میں اپنا سر رکھ چکی تھی۔

اس کی حرکت پر زارا نے مسکرا کر معراج کو دیکھا اور پھر جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

احسن کا بھرم رکھ کر اس نے جو گنوایا تھا وہ اپنی ماں کے فیصلے کا بھرم رکھتے ہوئے پا بھی لیا تھا بلکہ اس سے بہتر اور دگنا پایا تھا۔ بے شک رب بدتر سے گزار کر بہترین سے نوازتا ہے۔ اور وہ ہر شخص کو اس کی نیتوں کا ثمر دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

☆

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

قیمت=/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہٰذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں بستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہروالے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/400 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/600 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1100 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

فرحت جبیں

دعا مانگی کوئی

میں پورے تین مہینے بعد میکے رہنے آئی تھی وہ بھی سسرال کے حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے جتنا میرے میکے میں سکون تھا اتنی ہی بے سکونی میرے سسرال میں تھی۔ شاید سب لڑکیوں کو ایسا ہی لگتا ہے کہ ان کا میکہ جنت، سسرال جہنم ہے لیکن مجھے شروع سے ایسا نہیں لگتا تھا یہ تو بس چند سالوں سے ایسا تھا اور میں اس کا سبب نہیں جان پا رہی تھی۔

''جب میری شادی ہوئی تھی امی تب حالات بہت مختلف تھے اور اب بہت مختلف ہو چکے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ نعیم کی پے نہیں بڑھ رہی۔ وہ تو ماشاء اللہ سے ہر سال بڑھتی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اب پوری نہیں پڑتی۔ پہلے تو ہمارا کھلا کھانا پینا، گھومنا پھرنا تھا۔ سکون اور خوشی حاصل تھی لیکن اب تو سب کچھ رخصت ہو چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اخراجات تو اتنے نہیں بڑھے لیکن پھر بھی با مشکل پورے ہو رہے ہیں۔ حلال کمائی ہے اور حلال پر ہی خرچ ہوتی ہے پھر بھی نہ جانے کیوں..... مجھے ایسا لگتا ہے امی جیسے کسی نے تعویذ کرا دیا ہے۔ تب ہی ہمارے گھر اتنی بے برکتی ہے۔''

دل بھرا تھا تو امی سے دکھ سکھ کر لیا۔ ہم بیاہی بیٹیوں کا مضبوط سہارا مائیں ہی تو ہوتی ہے۔ میرے میکے کے معاشی حالات ہمیشہ سسرال سے بہتر رہے تھے لیکن اب تو لگتا تھا کہ دن بدن میکہ ترقی اور سسرال تنزلی کا سفر طے کر رہے ہیں۔

''کسی کی دل آزاری تو نہیں ہوگئی؟ کسی پرندے، جانور یا ملازم سے بدسلوکی؟ کہیں کسی کی بددعا تو نہیں لگ گئی بیٹا؟''

امی بھنڈیاں دھو رہی تھیں، پکانے کا کام اب خانساماں کیا کرتا تھا۔ امی کے اب آرام کے دن تھے کہ ساری زندگی انہوں نے بہت کام کیا تھا۔ یہ سکون بھی کسی خوش نصیب کو ہی ملا کرتا تھا اور صد شکر کہ میری ماں ایسی خوش نصیب تھیں۔

''توبہ ہے امی! میں کیوں کسی کے ساتھ زیادتی کرنے لگی۔ الٹا گھر کے حالات کی وجہ سے تو میں نے صدقات دینے بھی زیادہ کر دیے ہیں لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صدقات بھی ہماری آفات کو روک کیوں نہیں پاتے۔''

''صبر و کرو بیٹا پھر۔ وقت لگتا ہے حالات بدلنے میں ہمارا وقت دیکھو کیسا تھا اور پھر کیسے بدل گیا۔ میری زندگی سے سیکھو کہ کتنے سالوں کی تنگی کے بعد آسودگی ملی ہے۔ حالات چٹکی بجانے سے نہیں بدلا کرتے۔ انتظار سے بدلا کرتے ہیں۔'' امی نے واقعی مشکل وقت دیکھا تھا شاید اسی لیے وہ اتنی عاجز اور نرم مزاج خاتون تھیں۔

''پتا نہیں کیسے وقت بدلا کرتا ہے اور آپ کا کیسے بدلا؟'' میں سخت بیزار بیٹھی تھی۔

''ہمارے وقت بدلنے میں تمہاری پھپھی کی دعاؤں کا بڑا دخل ہے۔''

''امی! اب آپ بھی ابا کی زبان نہ بولیں۔ وہ اپنی اور آپ کی محنت کا صلہ ماننے کے بجائے پھپھو کے سر سہرا باندھتے ہیں۔ اور اب آپ نے بھی دماغ میں یہی بات بٹھالی ہے۔'' منہ بسورتے میں نے سر جھٹکا۔ مجھے ابا کی اس عادت کا بخوبی پتا تھا اور یہ بات کبھی ہضم بھی نہ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ بہن کو کریڈٹ دیتے رہتے ہیں۔ ابا کی زبانی پھپھو کی کہانی میں نے کئی بار بے دلی سے سنی تھی اور کبھی اس پر یقین نہیں کیا تھا۔

''نہیں بیٹا! اس بات میں صداقت بھی ہے تمہارے ابا غلط نہیں کہتے، شروع میں ہمارے حالات تنگ تھے لیکن تمہاری پھپھی کے تو ہم سے بھی گے

گزرے تھے۔ ہماری تو پھر بھی اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی لیکن وہ بے چاری اکثر ایسے حالوں میں ہوتی کہ روٹی کو پانی میں ڈبو کر کھا رہی ہوتی۔ کبھی ایک وقت کا کھانا ہوتا تو اگلے وقت فاقہ۔ ایسے میں تمہارے ابا ہی ان کی معاونت کرتے۔ اس وقت مجھے بڑا برا لگتا کہ ہمارے کون سے قارون کے خزانے ہیں کہ بہن کی مدد پر لٹائے جا رہے ہیں لیکن پھر مجھے لگنے لگا کہ تمہارے ابا کی کم آمدنی میں بھی برکت ہوگئی۔

تمہارے ابا جب بھی فہمیدہ کی مٹھی میں چند نوٹ تھماتے، وہ بھائی کے گلے لگ کر بہت روتی اور دعائیں دیا کرتی۔ میں نے اب بھی زبان پر اٹھتے بیٹھتے ہمیشہ ہمارے گھرانے کے لیے دعائیں سنی ہیں۔ بس پھر تمہارے ابا ترقی کرتے چلے گئے۔ گھر میں خوشحالی داخل ہوتی گئی اور ہمارے دن پھر گئے۔ تمہاری پھپھو اپنے بھائی کی ترقی پر شاید مجھ سے بھی زیادہ خوش ہوا کرتی تھیں۔ دن اس کے بھی بدلے لیکن جب بچے بڑے ہو گئے تو۔ اس نے زندگی کے کسی موڑ پر ہمیں دعائیں دینا ترک نہیں کیں۔ ایک بات تو ماننا پڑے گی کہ وہ احسان فراموش نہیں ہے بدلے میں اور کچھ نہ دے سکی تو اٹھتے بیٹھتے دعائیں ہی دے دیتی۔ آج کل کے دور میں کسی کے پاس کسی دوسرے کے لیے دعا کرنے کا بھی وقت نہیں ہے۔ اسی لیے تمہارے ابا کا ماننا ہے کہ انہیں فہمیدہ کی دعائیں لگی ہیں۔"

امی کی بات یہ مجھے لگا میں اس سرے تک پہنچ گئی ہوں میرے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

جب میری شادی ہوئی تھی تو نعیم ہمیشہ ازکی باجی کے آنے پر ان کے بچوں کو کچھ نہ کچھ دے دلا کر بھیجا کرتے تھے۔ موسم کی مناسبت سے کپڑے بنوا دیتے۔ فروٹ، دودھ، سبزی بھجوا دیتے۔ گھر میں کچھ بنتا تھا تو ان کے گھر بھی ضرور بھیجا جاتا تھا کیونکہ ازکی باجی کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ میں نے گھر کی اس روایت کو نعیم پر بہت زور ڈال کر بدلا تھا کیونکہ کمائی تو میرے شوہر کی تھی جو کسی اور پر لٹائی جا رہی تھی اور اپنے اندر پنپتے حسد کی وجہ سے میں نے نعیم کو منع کر دیا تھا کہ وہ اب اپنی فیملی کا سوچیں نا کہ ازکی باجی کا۔

امی کی بات سن کر مجھے لگا کہ ہمارے ہاں سے برکت اسی لیے اٹھ گئی تھی کیونکہ ہم نے ایک غریب بہن کا دانہ پانی بند کر دیا تھا۔ خود میں جب میکے آتی بھائی خوب دے دلا کر بھیجا کرتے کہ ابا نے ان کی تربیت میں بہنوں کو دینا شامل کیا تھا اور بھابھی بن کر میں نے یہ کیا کیا تھا؟

بھلا ادھر ادھر صدقات کرنے سے کئی گنا بہتر نہیں تھا کہ میں سب سے قریبی غریب رشتے کی مالی معاونت کر دیتی اور ازکی باجی سے زیادہ حق دار کون تھا بھلا؟

اپنی غلطی کا ادراک ہوتے ہی میں نے تہیہ کر لیا کہ اب پہلے کی طرح ازکی باجی کے لیے میں سب کچھ خود کروں گی۔ کیونکہ ہر انسان کی طرح مجھے بھی ان خاموش دعاؤں کی ضرورت تھی جو کسی مجبور کے دل سے بے ساختہ نکلتی ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟

☆

برقی قمقموں سے روشن اس رات میں وسیع چھت پر رنگ و بو کا ایک طوفان آیا ہوا تھا۔

ردا اور ارسلان کی مشترکہ مہندی کی رسم جاری تھی۔ اسٹیج پر ردا اور ارسلان پھولوں سے سجے جھولے میں بیٹھے تھے، جہاں باری باری خاندان کی خواتین اور مرد حضرات جوڑے کی شکل میں جا کر رسم ادا کر رہے تھے۔ اسپیکر پر فل آواز میں ایک کے بعد ایک گانا بج رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسٹیج سے مناسب فاصلے پر موجود میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھی ماہ پارہ بڑے انہماک اور دلچسپی سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ گلابی رنگ کی چھوٹی سی کرتی کے ساتھ اس نے سبز رنگ کا شرارہ پہنا ہوا تھا۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ نے اس کے نوخیز حسن کو دوآتشہ کر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی لیکن آج اس کی تیاری کچھ خاص تھی۔ رات کا ایک بج چکا تھا لیکن وقت کی پروا کسی کو نہیں تھی۔ رسم ختم ہوتے ہی لڑکوں نے بھنگڑا شروع کر لیا تھا۔ ردا اور ارسلان کو اٹھا کر عین ان کے درمیان کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ردا کانوں پر ہاتھ رکھ کر تقریباً چیخ رہی تھی لیکن کسی کو سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کہہ کیا رہی ہے۔

☆☆☆

''کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے دائیں جانب گردن موڑ کر پوچھنے والے کا چہرہ دیکھا۔ ''شاہ میر'' اسی کے لیے تو وہ یہاں آئی تھی۔ نہ کیسے کر سکتی تھی۔ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ آج کے مہندی تھیم کے لحاظ سے وہ سفید شلوار قمیص میں تھا۔ ہاتھ میں کچھ دیر پہلے کی سرخ، سبز اور پیلے امتزاج کی پٹی جو گلے میں ڈالے بھنگڑا ڈالا جا رہا تھا، اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

نوشین فیاض

شام شہر ملال میں

مکمل ناول

''یہاں کہیں میرا نام لکھا ہے؟''

''نہیں لیکن خواتین کے ساتھ نشست کے لیے اجازت لینا اخلاقی فرض بنتا ہے۔ اس لیے پوچھا۔'' سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ صاف کیا۔

''واہ۔ یہاں لوگ اخلاقیات بھی جانتے ہیں۔'' جب سے وہ آئی تھی، قابو کرتے کرتے بھی بار بار اس کا لہجہ طنزیہ ہوا جا رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے

میں خود پر قابو پایا۔
''کیا کسی نے کوئی بداخلاقی کی ہے؟'' سنجیدہ ہوکر کرسی کھینچتے آگے ہوکر اس نے بازو میز پر رکھے۔
''ارے نہیں۔۔ ویسے ہی کہہ رہی ہوں۔''
''ویسے ہی میں بھی ایک بات کہوں؟''
''میں ''نہیں'' کہوں تو پھر؟'' ایک ادا سے اس نے بالوں کو پیچھے جھٹکا اور آگے ہوکر بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر گانوں کا شور شروع ہو چکا تھا۔
''خوب صورتی کا حق ہے کہ اسے سراہا جائے۔ آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔''
اس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھتے اس نے چیختے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔ گردن پیچھے گرائے وہ ہنسی تو اس کے کھلے بالوں کو جھٹکا لگا تھا۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی اپنی تمام تر نزاکت کے ساتھ دور سے بھی چمک رہی تھی۔ دور سے دیکھتی دو آنکھوں میں اس کے حسن کے لیے ستائش ہی ستائش تھی۔
''یہاں لوگ حقوق اور فرائض بھی جانتے ہیں۔'' اب کی بار اس نے دل میں سوچا۔ ''میں یہ نہیں کہوں گی، حسن دیکھنے والی آنکھ میں ہوتا ہے۔'' اس نے بھی جواباً چیخ کر کہا۔
اس کی بات پر وہ بھی ہنسا۔
''میں ابھی آیا۔'' وہ اٹھ کر گیا تو ماہ پارہ کے چہرے کے تاثرات ایسے تن گئے جیسے کچھ دیر پہلے والی لڑکی کوئی اور تھی۔
دور کھڑے تھری پیس میں ملبوس اس شخص نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے بدلتے ہوئے تاثرات ناقابل فہم تھے۔
اسٹیج کے سامنے اب لڑکیوں کی لڈی شروع ہو چکی تھی۔ کیسری رنگ کی مختصر فراکوں کے ساتھ پیلے رنگ کے لہنگے پہنے جن پر آتشیں دوپٹے تھے، وہ لڑکیاں کسی پیشہ ور رقاصہ کی طرح تتلیاں بن کر مخصوص ترتیب سے اڑتی پھر رہی تھیں۔ یہ سب ان کی اس ماہ کی مشق کا نتیجہ تھا جو وہ پچھلے دو ماہ سے کر رہی تھیں۔ وہ مکمل طور پر کھو چکی تھی۔ لڈی ختم ہوتے ہی جیسے ماحول کا فسوں ٹوٹا۔ لڑکیاں خوشی اور تھکن سے بے حال نشستوں کی جانب بڑھیں۔ کسی نے کھانے کے لیے آواز دی اور اس کے بعد میزوں پر کھانا چن دیا گیا۔ اپنی پلیٹ میں چاول اور بھنا گوشت ڈال کر وہ سیڑھیاں اتر آئی۔ ردا کے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلی گئی کہ ردا کی مہربانی سے انہیں یہ کمرہ ملا تھا۔

☆☆☆

''مما۔ کھانا کھا لیں۔'' تسبیح ہاتھوں میں پکڑے وہ نیند کی وادی میں تھیں۔
''میں پانی لے کر آتی ہوں۔'' انہیں جاگتا دیکھ کر وہ پانی لینے باہر نکلی۔ شیشے کے جگ میں پانی لیے وہ گلاس کی تلاش میں دیکھ رہی تھی۔
''کچھ چاہیے آپ کو؟'' شاہ میر سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔
''مجھے گلاس نہیں مل رہا۔''
''ایک منٹ، میں دیکھتا ہوں۔'' اس کے کہنے پر وہ وہیں رک گئی۔ دیوار سے ٹیک لگائے وہ اس رونق کو دیکھ رہی تھی، جس کا حصہ وہ زندگی میں پہلی بار بنی تھی۔ اس کے دائیں جانب آکر وہ تھری پیس میں ملبوس لڑکا بھی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ایک پیر پشت پر دیوار سے لگا ہوا تھا۔

شام ہوتے ہی تیری آنکھوں کے
دو دیپ جلے جاتے ہیں میرے دل میں
رات کا ریشمی آنچل جو کہیں سرکا ہے
تیری آواز سے کچھ گیت سنے ہیں میں نے
نکہتیں بدن سے تیرے، ادھاری لے کر
پھول کو بخشا ہے خوشبو کا تکلم کس نے
سرسراتے لہجے میں اس کی نظم نے جانے کیوں ماہی کا دل دھڑکا دیا تھا۔
''کچھ کہا اس نے؟'' اس کے قریب آتے شاہ میر نے پوچھا۔

''نہیں تو..... کچھ بھی نہیں کہا۔'' جھوٹ بولتی وہ متذبذب تھی۔ اسے ایسے لگا جیسے پشت پر وہ مسکرایا ہو۔

''یہ لیں۔ اور کچھ چاہیے؟'' اس نے گلاس ماہی کی طرف بڑھایا۔

''نہیں شکریہ۔'' اس نے رسمی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ وہ جو پیچھے کھڑا تھا، اس کے سامنے ماہی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کسی دل لگی کی۔

''ٹھیک ہے جائیں آپ..... کھانا کہاں کھا رہی ہیں؟'' اسے اچانک خیال آیا۔

سوال پوچھنے والا جس استحقاق سے سوال پوچھ رہا تھا اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ جھاڑ پلا دیتی۔ لیکن اس کا تو مقصد ہی یہی تھا۔

''میں..... روا کے کمرے میں۔'' جواب دے کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھاگنے کی کی تھی۔

مما کے ساتھ اس نے بھی کھانا شروع کیا۔

''شاہ میر سے ملی ہو؟''

''جی مل لی ہوں۔ کہہ رہا تھا بہت خوب صورت لگ رہی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ مما مزید کچھ پوچھتیں اس نے مزے سے خود ہی بتا دیا۔

''واقعی؟'' وہ بے یقین تھیں۔ کھانا چھوڑ کر وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

''کیوں؟ کیا میں خوب صورت نہیں لگ رہی؟'' اس نے شرارت سے کہا۔

''یہ بات نہیں۔ بس یہ سوچ رہی ہوں، آج ہی تو تم اس سے ملی ہو اور.....''

''پہلی بار میں کوئی کسی کو پیارا نہیں لگ سکتا؟'' شاہ میر کی بات کرتے کرتے جانے کیوں اس کی نظر میں ایک اور چہرہ ابھرا۔ اس کی سنائی نظم کان میں گونج اٹھی۔

''سوچ رہی ہوں، کیسا دور آ گیا ہے۔ سب کچھ جلدی جلدی ہو جاتا ہے۔'' وہ کچھ نہیں بولی اور اسی خاموشی سے کھانا کھا کر اٹھ گئی۔

''یہ برتن باہر رکھ آؤ اور شاہ میر.....''

''دیکھ آئی ہوں اسے بھی۔'' ان کی بات کاٹ کر برتن لیے وہ باہر آ گئی۔

دروازہ کھولتے ہی وہ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ سامنے وہی کھڑا تھا۔ ڈریس پینٹ پر سفید شرٹ پہنے وہ پہلے سے مختلف اور تر و تازہ لگ رہا تھا۔

''روا!''

اسے دھیان سے دیکھتے دیکھتے وہ ایک دم چونکی۔ ''روا تو نہیں ہے اندر۔''

''جانتا ہوں۔ مہندی لگوا رہی ہے۔ تم بھی لگوا لو۔'' اس کے ہونٹوں پر تلے دبی مسکراہٹ نے ایک لمحے کے لیے ماہ پارہ کو خجل کر دیا تھا۔

''میں مہندی نہیں لگواتی۔'' کہتی وہ سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ اسے لگا وہ اس کے پیچھے آئے گا لیکن وہ شاید نیچے ہی رک گیا تھا۔ برتن رکھ کر وہ بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹتے وہیں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ زندگی کیسی ناقابلِ یقین چیز ہے۔ اس کے بارے میں بھلا کوئی کیسے پیشن گوئی کر سکتا ہے؟ وہ سوچ رہی تھی۔ آنے سے پہلے کیا سوچا تھا اور یہاں ہو کیا رہا تھا۔

☆☆☆

''آپ ماہی ہیں ناں؟'' ایک لڑکی کے مخاطب کرنے پر وہ اپنے دھیان سے نکلی۔ پندرہ سولہ سال کی اس لڑکی کے چہرے پر اشتیاق دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''جی میں ماہی ہوں۔''

''واؤ۔ جب سے مجھے پتا چلا کہ آپ ہماری کزن ہیں، میں نے چن چن کر آپ کی ویڈیوز دیکھی ہیں۔ یہ جو میک اپ کیا ہوا ہے یہ میں نے خود کیا ہے آپ کی ویڈیو دیکھ کر۔''

بتاتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے جھینپ گئی تھی۔

''میں نے تو اپنی کالج کی دوستوں کو بھی آپ کا

بتایا ہے اور جب ردا آپی نے کہا کہ آپ ان کی شادی میں آئیں گی مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ آپ بہت خوب صورت ہیں۔ آپ کی اسکن اتنی گلوئنگ ہے۔'' وہ پرجوش ہو کر بولتی جارہی تھی۔

''تھینک یو ڈیئر۔''

''کیا میں آپ کے ساتھ تصویر بنالوں؟''

مسکراتے ہوئے اس نے انگلیوں سے اپنے بال سیٹ کیے اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے فون سیدھا کر کے تصویر لی۔

''سارہ! سارہ! کہاں پر ہو؟ ہادیہ کو دیکھو کیوں رو رہی ہے۔'' آواز سنتے ہی وہ اٹھ کر بھاگی۔

''مما جانی بلا رہی ہیں میں ابھی آتی ہوں۔ ابھی آپ سونے مت جایئے گا پلیز۔'' منت بھرے انداز میں کہتے وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی دور ہوئی۔ اس کی معصومیت پر اسے بیک وقت پیار بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی۔

''اکیلے اکیلے مسکرایا جارہا ہے۔'' کرسی کھینچ کر بیٹھتے شاہ میر نے کہا تو غیر محسوس انداز میں اس کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی جسے اس نے بخوبی چھپا لیا تھا۔

''نہیں بس ایسے ہی۔''

''مہندی نہیں لگوا رہیں آپ؟''

اس کی بات پر وہ جبراً مسکرائی۔ ایک تو سب کو یہاں مہندی کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ اس نے جل کر سوچا۔ ''میں مہندی نہیں لگواتی۔''

''کیوں؟ اتنے خوب صورت تو آپ کے ہاتھ ہیں۔ پھر لڑکیوں کو مہندی کا اتنا شوق ہوتا ہے، ابھی دیکھ لیں کتنی لڑکیاں تھیں۔ مجال ہے اب کوئی نظر آجائے۔''

''میرے ہاتھ مہندی کے بغیر ہی خوبصورت ہیں تو مہندی کا تکلف کیا کرنا؟ اور مجھے مہندی کا شوق بالکل بھی نہیں ہے۔'' اس نے ایک ادا سے تفصیلی جواب دیا۔

''اچھا کولڈ ڈرنک کا موڈ ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں کولڈ ڈرنکس نہیں پیتی۔''

''واؤ یار امیزنگ۔ ایسی بھی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ خیر میں اپنے لیے لے کر آیا۔''

اس کے جانے پر ماہی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ یہاں تک آنے کا مقصد ہی اس سے ملاقات تھا لیکن اب جب جب وہ سامنے آیا، ماہی کو اپنے کندھوں پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر وہ کوفت میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ اس کا لہجہ از خود بیزار ہو جاتا تھا۔ اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ اسٹیج کے انتہائی قریب کرسیوں پر عورتیں بیٹھی تھیں۔ لڑکیاں واقعی غائب ہو چکی تھیں۔ ایک طرف لڑکے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ دیر وہ یونہی دیکھتی رہی پھر اٹھ کر ریلنگ کی طرف چلی گئی۔ جانے کتنی دیر وہ ایسے ہی بے وجہ باہر دیکھتی رہی۔ جب وہ واپس ہوئی تو ریلنگ کے پاس ہی اسے ایک بار پھر وہ دکھائی دے گیا۔ اس کی نظر پڑنے سے پہلے ہی وہ نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر چاہنے سے بھی بھلا کچھ ہوا ہے۔

''چائے۔'' اس نے کپ ماہی کی طرف بڑھایا۔

''شکریہ لیکن میں چائے نہیں پیتی۔''

''ایک بار پی کر دیکھ لیں پسند نہیں آئی تو کوئی بات نہیں۔''

اس نے بڑھایا ہوا ہاتھ مزید آگے کیا تو بادل نخواستہ اسے مگ پکڑنا پڑا۔ دو کرسیاں کھینچ کر ایک اس نے ماہی کے آگے رکھی اور ایک کچھ فاصلے پر رکھ کر خود بھی بیٹھ گیا۔

''نیند نہیں آرہی کیا؟''

''نہیں ایسی بات نہیں۔ سوتی تو روز ہوں۔ سوچا آج یہ سارے منظر نظر میں بھر لوں، جانے پھر نصیب ہوں نہ ہوں۔'' اپنی بات پر اسے خود بھی حیرت ہوئی تھی۔ وہ بھلا اجنبیوں سے کب سے ایسے بات کرنے لگی تھی۔

''آپ کو خبر ہی نہیں لکھنے والے نے آپ کی قسمت میں کون سے اجالے لکھ دیے ہیں۔'' اس کا تکلم اتنا عام نہیں تھا۔ جانے وہ کون تھا مگر جب بات کرتا تھا تو ماہی کا دل کھنچتا تھا۔ کوئی بھی جواب دیے بغیر اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ یہ سبز چائے تھی جس میں خشک میوہ جات ڈالے گئے تھے۔

☆☆☆

''تھینک گاڈ آپ سونے نہیں چلی گئیں۔ ایک تصویر بناتے ہیں۔'' پھولے ہوئے سانس کے ساتھ سارہ واپس آ گئی تھی۔ ''ماہی! یہاں آ جائیں گی پلیز۔''

اس کی درخواست پر مگ چھوڑ کر وہ اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ یکے بعد دیگرے اس نے دو چار تصویریں نکالیں اور پھر مطمئن ہو کر شکریہ ادا کرتی چلی گئی۔ وہ واپس اپنی نشست پر آ بیٹھی۔

''یہاں تو لڑکیاں بھی آپ سے امپریس ہیں ہیں تو سمجھا تھا بس ہم ہی دل ہارے ہیں۔'' مسکراتی آنکھوں کے ساتھ اس نے ماہی کو دیکھا۔ اوپر آتی ازکی نے بے دھیانی میں اس کی بات سنی، ان کی طرف دیکھا اور پھر وہیں سیڑھیوں میں برف ہو گئی۔

اس کی بات پر ماہی کی چائے چھلک پڑی تھی۔ سارہ بہت بار اپنی تعریف سنی تھی لیکن دل ایسا بے اختیار تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔

''کیا ہو گیا ہے۔''

''شاہ میر۔'' ازکی نے آواز دی اور وہ پیچھے مڑ گیا۔

''آ رہا ہوں۔''

ماہ کے ہاتھ سے گر کر مگ چکنا چور ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ یہ شاہ میر تھا تو وہ کون تھا جسے وہ شاہ میر سمجھ رہی تھی اور یہ..... یہ شاہ میر کیوں تھا؟

''آر یو اوکے؟'' وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔

ہاتھ سے اسے دور رہنے کا اشارہ کرتے وہ بمشکل سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ ''شاہ میر..... میرے خدا یہ کیا ہو گیا۔'' سن ہوتے وجود کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ مما کمرے میں نہیں تھیں۔ یقیناً باقی خواتین کے ساتھ کہیں بیٹھی ہوں۔ اس نے شکر ادا کیا تھا کہ وہ کمرے میں نہیں۔ ورنہ اسے اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو جاتیں۔ اسے اب خود پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر اس نے کیسے فرض کر لیا تھا کہ اس کے پاس سب سے پہلے آنے والا شاہ میر ہی ہو گا؟ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی وہ دل کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہاں سے واپس بھاگ جائے۔ مما کے واپس آنے تک وہ منہ سر لپیٹ کر لیٹ گئی تھی تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ وہ تھک کر سو گئی ہے۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ صبح جانے کس وقت اس کی آنکھ لگی تھی۔ جو وہ اٹھی تو گیارہ بج رہے تھے۔ عام طور پر شادی والا گھر اتنا پرسکون ہوتا نہیں لیکن یہ ردا کا کمرہ تھا جو ایک تو باقی حصے سے الگ تھلگ تھا اور دوسرا دلہن ہونے کے ناتے اسے رعایت بھی حاصل تھی جس سے ماہی نے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ جب اٹھی تو مما کمرے میں نہیں تھیں۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر بیٹھی تھی جب وہ ناشتہ لے آئیں۔

''تھکن اتری کچھ؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر ٹرے اپنی طرف سرکالی۔ ''آ جائیں آپ بھی۔''

''نہیں۔ میں ناشتا کر چکی ہوں بی پی کی گولی کھانی تھی۔ تمہارے لیے لے کر آئی ہوں۔'' وہ خاموشی سے ناشتا کرنے لگی۔

''اچھا ناشتہ کر لو اس کے بعد کہیں باہر نکل

جانا۔ تھوڑا گھوم پھر کر دیکھ لینا۔ شاہ میر کو ساتھ لے جانا۔'' ان کی بات پر ماہی کے حلق میں نوالہ اٹکا تھا۔

''جج..... جی ٹھیک ہے۔'' اس نے کہہ تو دیا تھا لیکن بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہیں نکلنے کو۔ آنے سے پہلے اتنے بڑے بڑے منصوبے اسی نے بنائے تھے۔

''آپ ملتی رہنا اپنے رشتہ داروں سے۔ میں تو پورا شہر دیکھ کر آؤں گی۔ خاص طور سے شاہ فیصل مسجد۔'' اور اب اس کا کمرے سے باہر نکلنے کو دل نہیں چاہ تھا۔

☆☆☆

آج ارسلان کی بارات تھی اور رات کی ہی تقریب تھی۔ اس نے آج کے دن کے لیے پنک میکسی لی تھی جسے روانے الماری میں لٹکا دیا تھا۔ کھانا کھا کر اس نے الماری سے پہننے کے لیے کپڑے نکالے۔ یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ اس کی برانڈڈ مہنگی میکسی کو کسی نے بے دردی سے کاٹ کر گویا غصہ نکالا تھا۔ اپنے سامنے بیڈ پر میکسی نکالے وہ بے یقین بیٹھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گھر میں شور مچ گیا تھا۔

''کسی نے ماہ پارہ کی میکسی کاٹ دی۔''

کمرے میں رش لگ گیا تھا اور وہ گم صم بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ شدید شاک کی کیفیت میں تھی۔ اسے یہاں کوئی پسند نہیں کرتا، اس بات کا اسے کچھ کچھ اندازہ تھا لیکن ایسی نفرت؟ اس نے کتنے دل سے یہ سب لیا تھا۔ میکسی اور اس کی میچنگ چیزیں۔ اس کا دل رو رہا تھا۔

''چلو، کوئی بات نہیں۔ تم کچھ اور پہن لو، جانے کس کا بیڑہ غرق ہوا ہے۔'' کہنے والی خالہ سیما تھیں۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ جسے آپ کوئی بات نہیں کہہ رہی اتنا مہنگا تو شاید ولیمے کا لباس بھی نہیں لیا ہوگا۔ اسے نہیں پتا تھا یہ اتنے چھوٹے ذہن کے لوگ ہوں گے۔

''تم چلو، میں تمہیں یہاں سے دلوا لاتی ہوں کچھ۔'' مما نے اسے کندھے پر تھپکی دی۔ خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میکسی کو تہہ کر کے الماری میں رکھ دیا۔ پہننے کے لیے اپنا سیاہ گھیر دار فراک نکالا اور نہانے کے لیے چلی گئی۔ موسم سرد ہو رہا تھا لیکن اس کے اندر جیسے آگ بھر گئی تھی۔ مما نے کتنے چاؤ سے اسے یہ میکسی لے کر دی تھی۔ وہ اتنی مہنگی میکسی لینے کے حق میں نہیں تھی لیکن مما کا شوق تھا کہ خاندان میں پہلی شادی پر جانا ہے اور پھر شاہ میر ہوگا۔ اسے اچھا لگنا ہے۔

اندر کی کھوٹن کچھ کم ہوئی تو وہ کپڑے پہن کر باہر آ گئی۔

''مینا بتا رہی ہے یہیں مال میں اسی برانڈ کا آؤٹ لیٹ ہے۔ تم جا کر نئی میکسی لے آؤ۔''

اس نے گیلے بال جھٹک کر مما کی طرف شاکی نظروں سے دیکھا۔ ''ابھی آپ کا شوق اترا نہیں ہے مما؟ جہنم میں جائے شاہ میر اور یہ میکسی، میں کہیں نہیں جا رہی۔''

''اچھا پھر آج کیا پہنو گی؟'' وہ تحمل سے بولیں۔

''آج کے آج ہم واپس جا رہے ہیں۔ دیکھ لی ہم نے شادی۔ جو کل ولیمے کے لیے لائی تھی۔ وہ آج پہن لیتی ہوں اور بس۔'' اس نے کھڑے کھڑے فیصلہ سنایا۔

''ماہی۔ ایسے کیسے جا رہے ہیں ہم؟''

''تو مما دھکے کھا کر جانے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ آپ نے دیکھا، میری پچیس ہزار کی میکسی کو کس بری طرح برباد کر دیا ہے۔ آپ نے رکنا ہے رک جائیں لیکن میں آج واپس چلی جاؤں گی۔''

آئینے کے سامنے وہ بہت مطمئن بیٹھی تھی۔

مما اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ماہی واقعی اکیلی جانے کے لیے نکل کھڑی ہوگی اور یہ ان ہی کی دی ہوئی شہ تھی۔

''ماہی۔ دھیان سے میری بات سنو۔ میں نے بہت انتظار کیا ہے اس وقت کے لیے۔ اب ایک

پچیس ہزار کی میکسی کے لیے میں یہ سب ضائع نہیں کرسکتی۔ تم کسی کے ساتھ چلی جاؤ یا میں لے جاتی ہوں۔ جو پہننا ہے لے آؤ۔ میرے پاس پیسے ہیں اکاؤنٹ میں۔''

وہ کہنا چاہتی تھی بات میکسی یا پچیس ہزار کی نہیں۔ بات اس دل کی ہے جسے پہلی سیڑھی پر ہی دھکا لگ گیا ہے۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' کہہ کر وہ فون اٹھا کر دوبارہ بیڈ پر جا لیٹی۔

''تو تم اب باہر نہیں جارہیں؟''

''نہیں۔ مجھے کچھ سکون چاہیے پلیز۔'' ہینڈز فری کانوں میں لگاتے اس نے جواب دیا۔

''اچھا، میں باہر ہی ہوں، دیکھتی ہوں کپڑوں کا۔''

وہ دروازہ بند کر کے چلی گئیں تو اس نے ہینڈز فری کانوں سے نکال کر صوفے پر اچھال دی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ آسمانی اور گلابی امتزاج کا اس کا فراک بھی کہیں کسی کے حسد کی نذر نہ ہو گیا ہو۔ لپک کر اس نے الماری کھولی۔ شکر کیا کہ وہ اپنی اصلی حالت میں موجود تھا۔ ایک بار پھر اس نے میکسی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اس نے اور مما نے کتنا وقت لگا کر ویب سائٹس کھنگال کر یہ میکسی پسند کی تھی۔ بے دلی سے واپس رکھ کر وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ جس کسی نے بھی یہ کیا اس کا مقصد اسے تنگ کرنا تھا اور وہ اس حاسد کو اس کے مقصد میں کیوں کامیاب ہونے دیتی؟ اسی سوچ نے اسے کمرے سے نکالا تھا۔

☆☆☆

''ماہی! آپ کو اوپر پھپھو بلا رہی ہیں۔'' ازکی نے اسے سیڑھیوں سے آواز دی اور واپس مڑ گئی۔ دروازہ بند کرتے اس نے ابرو اچکائے۔

پھپھو اوپر کے کمرے میں بیڈ پر مختلف چیزوں کا انبار لگا کر بیٹھی تھیں۔ ان میں شام کی تقریب کے لیے پہنے جانے والے جوتوں کے ڈبے بھی تھے اور نکاح کی تقریب کے لیے چھوہاروں کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کے بڑے بڑے تھیلے بھی۔ ایک سوٹ کیس تھا جس میں دلہن کی بری کے کپڑے تھے۔ ایک نظر پھیلاوے پر ڈال کر وہ صوفے کے کنارے پر ٹک گئی۔

''جی پھپھو! آپ نے بلایا؟''

''ہاں میں کہہ رہی تھی۔ تم ازکی اور جنید کے ساتھ جا کر کوئی سوٹ دیکھ لو۔ پیسے میں دے دیتی ہوں۔'' چیزیں سمیٹتے وہ اس کی طرف بنا دیکھے بولیں۔

پھپھو کی بات پر اسے ہنسی آئی تھی۔ جنہوں نے خود کبھی چار پانچ ہزار سے اوپر کا سوٹ نہیں پہنا تھا، وہ اس کی میکسی کے متبادل اسے سوٹ دلوانے لگی تھیں۔

''نہیں پھپھو! رہنے دیں۔ میرے پاس ہے ایک ایکسٹرا سوٹ ہے، میں پہن لوں گی۔ آپ فکر مت کریں۔''

''نہیں بیٹا۔ تم پہلی بار آئی ہو، پتا نہیں کس نے ایسی حرکت کی ہے۔ تم میرا دل رکھنے کے لیے ہی چلی جاؤ۔ مجھے بہت برا محسوس ہو رہا ہے۔'' ان کے لہجے میں خاصی فکرمندی تھی لیکن ماہی کو یہ سب ڈھکوسلہ لگ رہا تھا۔

''اگر ضرورت ہوتی تو ضرور چلی جاتی لیکن پھپھو! واقعی ضرورت نہیں ہے۔ آپ برا نہ محسوس کریں۔ ویسے بھی پیسے ہیں میرے پاس۔''

''ماما جان! پھپھو کہہ رہی ہیں، میرا فون اٹھائیں۔'' فرح نے اندر جھانک کر پیغام دیا۔

''آئے ہائے فون کہاں چلا گیا۔'' انہوں نے چیزیں ادھر ادھر کرتے فون ڈھونڈنا شروع کیا تو وہ باہر جانے کے لیے اٹھ گئی۔

''ارے آپ یہاں بیٹھی ہیں اور آپ کی والدہ محترمہ آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہیں۔ اب تو بس مسجد میں اعلان کروانا باقی رہ گیا ہے۔''

اسے دیکھ کر ماہی کو ایک بار پھر غصہ آ گیا۔ وہ

کل رات اسے ہی شاہ میر سمجھ کر ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

''فرحان! ایسا کرو ماہی اور ازکی کو بازار لے جاؤ۔ جنید سے کہو، ماموں کی گاڑی لے آئے۔''

اسے دیکھ کر پھپھو کو ایک بار پھر بازار کا خیال آ گیا تھا۔

''نہیں پھپھو کہا تو ہے۔ کچھ نہیں لینا میں نے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''اچھا تو پھر بازار ہی گھوم آنا۔ ازکی کے کپڑے آنے ہیں درزی سے، وہ بھی لیتی آنا۔''

ماہی کا دل چاہ رہا تھا اپنا سر کسی دیوار میں مار لے۔ کتنی بار وہ کہہ چکی تھی، اسے کہیں نہیں جانا مگر یہاں تو جیسے سب کو ضد ہو گئی تھی۔ اس فرحان کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بھی اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش نہیں کی اور ایک طرف سے ہو کر کمرے سے نکل آئی۔

شام کو اس نے اپنا آسمانی رنگ کا فراک پہنا تھا۔ یہ بھی برانڈڈ سوٹ تھا۔ ہاتھ کے نفیس کام والے فراک کے ساتھ گلابی رنگ کا دوپٹہ تھا اور ٹراؤزر بھی گلابی تھا۔ مما کو اس نے تیار کر دیا تھا، وہ باہر اپنی سہیلیوں اور بہنوں کزنز کے پاس چلی گئی تھیں اور اب وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ میک اپ وہ تقریباً کر چکی تھی بس ایک آنکھ پر آئی لائنر اور لپ اسٹک باقی تھی جب دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے لائنر کا برش رکھا اور کوفت سے دروازہ کھولا۔ باہر وہ کھڑا تھا۔ نک سک سے تیار۔ آج بھی وہ تھری پیس میں تھا۔ جیل سے سیٹ کیے بال بڑے سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

ماہی کی آنکھوں میں دیکھتے شعر سنا کر وہ دروازے کے ساتھ بنی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ جب کہ وہ ایسے ہی بت بنی دروازے میں کھڑی تھی۔ پتا نہیں اس کا لہجہ ایسا سحر کیوں تھا یا شاید وہی اس کے سحر میں گرفتار ہوتی تھی۔ وہ یہاں اس لیے نہیں آئی تھی کہ خود گھائل ہو جائے۔ یہاں بننے والی محبت کی کوئی بھی داستان ادھوری رہنی تھی اور اسے اپنی جان کو روگ نہیں لگانا تھا لیکن یہ لڑکا۔۔۔ یہ تو جیسے اس کے لیے روگ ہی بنتا جا رہا تھا۔ زور سے دروازہ بند کرتے وہ اندر آئی اور مکمل تیار ہو کر باہر آ گئی۔

☆☆☆

''ازکی۔'' بیڈ پر پڑے اس کے کپڑے اٹھاتی ماما نے اسے پکارا۔

''جی ماما۔'' گالوں پر بلش آن لگاتی وہ دھان پان سی لڑکی پوری طرح آئینے میں گھسی ہوئی تھی۔

''یہ آپ نے کیا ہے نا؟''

''کیا؟''

''ماہ پارہ کا فراک آپ نے کاٹا ہے ناں؟''

ماما کے کہنے پر اس کے ہاتھ کانپ گئے تھے اور ان کو اپنا جواب بھی مل گیا تھا۔

''وہ مہمان ہے۔ کل یا پرسوں چلی جائے گی۔ اس پر اتنا غصہ آنا نہیں چاہیے آپ کو۔''

ماما کی بات پر ازکی کی نظر میں شاہ میر اور ماہی کا چہرہ گھوم گیا اور ساتھ ہی شاہ میر کی بات کی گونج بھی سنائی دی۔

''ماما! آپ نہیں جانتیں۔ وہ چڑیل ہے پوری۔ جتنی پیاری ہے اتنی ہی گھٹیا۔''

''ازکی۔''

ان کی تنبیہہ کرتی آواز پر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''آئم سوری ماما بٹ یو ڈونٹ نو ہر۔ میں اتنے غصہ میں کبھی نہیں آئی مجھے لگا۔''

''صبر مشکل چیز ہے، میں مانتی ہوں لیکن آپ صبر کرنا سیکھ لیں۔ زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔''

''ہماری بیٹی کو کون سی مشکل آ پڑی ہے۔'' پاپا

کی آواز پر وہ دوڑ کر ان کی طرف آئی اور ان کے سینے سے لگ گئی۔

''اسے کچھ پیسے اور گاڑی دے کر بھیجیں۔ اس نے بازار جانا ہے۔'' بستر کی چادر کو جھاڑتے انہوں نے عام سے انداز میں کہا تھا لیکن ازکی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''بارات نکلنے والی ہے، اب کیا رہ گیا ہے؟'' انہوں نے ازکی کو خود سے الگ کرتے پوچھا۔

''میرے کسی کام سے جانا ہے۔''

''اچھا، میں دیتا ہوں پیسے۔ شاہ میر کو ساتھ لے جانا۔''

وہ واپس مڑ گئے تو ازکی ان کے سر پر آ گئی۔

''اس کا جو سوٹ تباہ کیا ہے کوشش کرنا ویسا ہی لے آئیں اور اگر ویسا نہ ملے تو اس جیسا کوئی بھی اور۔ اس سے اچھا ہو جائے لیکن کم تر نہ ہو۔''

''ماما! بارات جانے والی ہے۔'' وہ رونے والی ہو گئی تھی اس حکم پر۔

''آپ نے پہلے بھی بہت شادیاں دیکھی ہیں یہاں، اور اس کے بعد بھی بہت سی دیکھیں گی۔ اس کی پہلی بار ہے اور شاید آخری بار بھی۔''

ماما کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شیشے پر پڑا پرفیوم اس نے پوری قوت سے زمین پر دے مارا تھا۔ ماما کی صبر والی ساری نصیحتیں اسے ابھی بھول گئی تھیں۔

☆☆☆

پوری بارات میں اس کی ٹکر کا کوئی نہیں تھا۔ ایک تو اس کے ہاتھ میں میک اپ نامی ہنر کا جادو تھا، دوسرا اللہ نے اسے حسن کی دولت سے خوب مالا مال کیا تھا اور تیسرا اس کا مہنگا میک اپ اور مہنگا لباس۔ لڑکے تو لڑکے، لڑکیوں کی بھی نظر بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھی۔ اکثر نظروں میں حسد تھا اور کئی نظروں میں ستائش۔ وہ ایک ناز سے سب کو نظر انداز کرتی مما کے پاس جا پہنچی۔

''اس کا دوپٹہ کہاں ہے؟'' انہوں نے دیکھتے ہی پوچھا۔

''تہہ کر کے کمرے میں رکھ آئی ہوں۔''

''لو۔ دوپٹہ اتنا پیارا تھا اس کا۔'' اس لباس میں انہیں فراک سے زیادہ دوپٹہ پسند آیا تھا۔ ''جا کر لے آؤ ماہی۔ اچھا لگے گا۔''

''بالکل۔ آپ کو بھی اچھا لگے گا اور مجھے بھی۔ بس آپ کے ان رشتہ داروں کو اچھا نہیں لگے گا۔ پھر کہتی پھریں گی ''ویسے تو بنا دوپٹہ نیٹ پر ویڈیو ڈالی جاتی ہے۔ اب گھر کی تقریب تھی تو ہمیں ملائی بن کر دکھا رہی ہے۔''

اس کی بات پر وہ خاموش ہو گئی تھیں۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ وہ ایک مشہور میک اپ آرٹسٹ تھی۔ اس نے یوٹیوب پر اپنا ایک چینل بنا رکھا تھا جہاں لاکھوں کی تعداد میں اس کے سبسکرائبرز تھے۔

بارات ہال میں پہنچی تو مما باقی سب کے ساتھ رسموں میں شریک ہونے کے لیے اٹھ گئیں۔ وہ اکیلی بیٹھی سب کے کپڑے اور میک اپ، میچنگ وغیرہ دیکھتی ارد گرد کی ہلچل سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

''اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟''

فرحان اس کے پاس کھڑا پوچھ رہا تھا۔ جب تک وہ اسے شاہ میر سمجھ رہی تھی تب تک تو اسے جیسے تیسے برداشت کر رہی تھی لیکن جب سے پتا چلا تھا کہ وہ شاہ میر نہیں فرحان ہے تب سے وہ بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اب اسے برداشت کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ناراض ہو؟''

''اکیلی نہیں بیٹھی۔ پوری بارات ساتھ ہے اور حیرت ہے اگر تمہیں نظر نہیں آ رہا۔''

وہ اس کے لہجے پر ایک دم شاکڈ ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے ماہی؟'' کرسی کھینچ کر وہ اس کے قریب بیٹھا۔ ماہی نے ابرو اچکا کر ترچھی نظر سے اسے دیکھا تھا۔

''میرا نام ماہ پارہ ہے پلیز۔''

''جانتا ہوں ماہ پارہ ہے لیکن میں تو تمہارا دوست ہوں نا۔''

اس سے پہلے کہ ماہی اسے کچھ جواب دیتی اسے ڈھونڈتی ہوئی فرح وہاں آ گئی اور وہ گہری خاموش نظروں سے اسے دیکھتا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے جاتے ہی ایک بار پھر وہ آس پاس رنگ و بو کا میلہ دیکھنے لگی۔

''شاہ میر نہیں آیا؟'' مما ذرا کی ذرا اس کے پاس آئی تھیں۔

''نہیں۔ ابھی تک تو نہیں دیکھا۔''

''تو تم یہاں بیٹھی مت رہو۔ اٹھو، یہاں سے چلو پھرو۔ یہیں کہیں ہوگا وہ بھی۔'' مما کے کہنے پر وہ بادلِ نخواستہ اٹھی اور ہال کے داخلی راستے کی طرف چلی گئی۔

شاہ میر ازکی کے ساتھ بازار میں دھکے کھا کر ابھی ہال میں پہنچا تھا اور کسی دعا کی طرح وہ اسے سامنے ہی نظر آ گئی تھی۔ ازکی اسے دیکھ کر دیکھتی رہ گئی۔ وہ اتنی خوبصورت کیوں تھی؟ ایسی مکمل مورت کیسے ہو سکتی تھی وہ؟ وہ لڑکی ہو کر بے انتہا نفرت کے باوجود اسے دیکھتے چلے جانے پر مجبور ہو گئی تھی تو شاہ میر یا باقی لڑکوں کا کیا قصور تھا۔ شاہ میر اس کے پاس سے گزرتے ہوئے لحظہ بھر کے لیے رکا تھا جسے اپنی اپنی جگہ ان دونوں نے محسوس کیا تھا۔ ازکی کا سکون برباد ہو گیا تھا جب کہ ماہ پارہ ایک خاص مسکراہٹ ان دونوں کے نام کر کے واپس پلٹ گئی تھی۔ شاہ میر کا دیکھنا اسے اندر تک سرشار کر گیا تھا۔ اسے دنیا دیکھتی تھی، تعریفیں کرتی تھی لیکن شاہ میر کی آنکھیں اسے جو پیغام دیتی تھیں وہ اس نے نہ پہلے سنے تھے نہ پڑھے تھے۔

آج کا دن اس کا بہت اچھا گزرا تھا اور وہ بے حد خوش بھی تھی۔ وجہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی لیکن وجہ کا نہ ہونا اس کی خوشی کو کم نہیں کر رہا تھا۔ اس خوشی میں اضافہ تب ہوا جب واپسی پر اسے الماری میں ایک خوب صورت فراک کے ساتھ سوری، کارڈ ملا تھا۔ فراک اس کی میکسی جیسی نہیں تھی بلکہ کافی الگ تھی۔ البتہ رنگ وہی تھا جو اس کی میکسی کا تھا۔ یعنی اپنی میچنگ کی تمام چیزیں وہ اس فراک کے ساتھ پہن سکتی تھی۔

''دیکھ لو اتنے بھی برے نہیں ہیں میرے رشتے دار، جتنا تم سمجھ رہی تھیں۔'' اس نے مما کو فراک دکھایا تو انہوں نے کہا۔ وہ جواباً ہنس دی۔

ارسلان اور منزہ کی فوٹو گرافی کے بعد اب باقی رسمیں جاری تھیں۔ وہ بھی شوق شوق میں رسمیں دیکھنے کے لیے وہیں تھی۔ وہ دونوں صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میز پر ایک پرات میں دودھ رکھا تھا جس میں گلاب کی پتیاں تیر رہی تھیں۔

''لو بھئی فیصلہ ہوا چاہتا ہے گھر کی حکمرانی تاج کس کے سر سجے گا۔'' یہ کہتے ہوئے خالہ سیما۔ پرات میں انگوٹھی ڈال دی۔ اب دولہا دلہن اس دود میں انگوٹھی ڈھونڈ رہے تھے۔

''بھابھی! ذرا چوڑیاں کھنکا دیں۔ ہمارا لڑکا سادہ مزاج ہے۔ خوشی خوشی ہار جائے گا۔'' کسی کز نے کہا اور قہقہے بکھر گئے۔ نئی نویلی دلہن نے شرما ہاتھ باہر نکال لیا۔ انگوٹھی ارسلان کے ہاتھ میں تھی۔

''یہ ویسے فاؤل ہے۔ چلیں اگلی بار سہی منزہ کی بہن نے کہا اور ایک بار پھر انگوٹھی دودھ ڈالی گئی۔

''آپ کی مما بلا رہی ہیں آپ کو۔''

ماہ پارہ نے مڑ کر دیکھا۔ شاید اسی سے کہا تھا۔ رسم چھوڑ کر وہ باہر آ گئی۔ مما اسے کہیں نظر آئیں۔ اس نے سیڑھیوں سے جھانکا۔

تجھ سے ہاریں کہ تجھے مات دیں
تجھ سے خوشبو کے مراسم ہیں تجھے کیسے کہیں

اس کے انتہائی قریب سے آواز ابھری وہیں مجسمہ ہو گئی تھی۔ جیسے ایک دلکش خواب کے جانے کا ڈر ہو۔

''میں اسے رکھ تو لوں لیکن اسے رکھ کر میں کسی کام کا نہیں رہوں گا۔ اس لیے یہ آپ رکھ لیں۔''

وہ پیچھے پلٹی۔ ایک ہتھیلی جتنا کارڈ تھا جسے اس کی طرف بڑھائے وہ پرشوق نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ اس نے وہ کارڈ پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ وہ اسی کا اسکیچ تھا۔ لپ اسٹک اور ایک آنکھ پر لائنر کے بغیر، ماتھے پر الف کی شکل میں تین لائنیں اور ادھ کھلے ہونٹ لیے وہ ماہ پارہ ہی تھی۔ اس نے اتنی مختصر مدت میں اسے اتنا جامع دیکھا تھا کہ کارڈ پر مفصل اتار لیا۔ بے یقینی سے اس نے اس کا چہرہ دیکھا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ اس نے پوری چھت پر اسے دیکھ لیا تھا لیکن وہ وہاں تھا ہی نہیں۔

''اب بتاؤ ماہی! کیا بات ہے۔''

فرحان سیڑھیاں چڑھ کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں نے کب کہا، کوئی بات ہے۔'' دل کی دھڑکن پر قابو پاتے اس نے کارڈ اپنی فراک کے گھیر کے پیچھے چھپایا۔

''اتنا اکھڑی اکھڑی کیوں ہو؟ کوئی بات ہوئی ہے تو صاف بتا دو۔''

اس کے جارحانہ انداز پر ماہ پارہ کھول کر رہ گئی تھی اسے لیے آر یا پار کا فیصلہ کر لیا۔

''تم میرے ایسے کون سے سگے رشتے دار لگتے ہو جسے میں سیدھی سیدھی باتیں بتاؤں؟ جب کہہ دیا، کوئی بات نہیں تو جان چھوڑ دو۔ سر کھانے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ لیومی الون پلیز۔''

''یہ سب تم اس دو ٹکے کے مجنوں شاہ میر کی وجہ سے کہہ رہی ہو نا؟ مجھے نظر آتا ہے جس طرح تم ہمارے آگے پیچھے پھرتا ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہوں۔ سمجھیں۔'' وہ جیسے تڑخ کر بولا تھا۔ اس کی باتوں نے ماہ پارہ کا دماغ گھما دیا تھا۔

''تم اپنی گھٹیا بکواس بند کرو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ وہ حال کروں گی کہ کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہو گے۔'' غصے سے کہتے وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ فرحان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ماہی یار، نہ کرو۔ تم بات کرو مجھ سے۔'' اس نے لمحے بھر میں رنگ بدلا تھا جبکہ ماہی کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ایک جھٹکے سے اس نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروایا۔

''تم ایک گھٹیا شخص لگے تھے مجھے اور اب یقین آ گیا کہ بلاوجہ نہیں لگے تھے۔ آئندہ مجھے چھونے کی کوشش بھی کی نا تو دیکھ لوں گی۔''

''تمہارا غرور نہ توڑا تو میرا نام بھی فرحان نہیں۔ کچھ کہنے کے قابل بھی نہیں رہو گی۔''

اپنے پیچھے اس نے پھنکارتی آواز سنی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے بیڈ پر بیٹھ کر گہرے سانس لیتی وہ خود کو نارمل کرنے لگی۔ بیٹھے بٹھائے مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔

''چلو ایک ہی دن کی بات ہے۔ کل ویسے بھی میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے خود کو تسلی دی اور ہاتھ میں پکڑا کارڈ سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ دل گدگداتا ہوا احساس سارے اندیشے اڑا گیا تھا۔

☆☆☆

''نیہا۔ یار! مجھے بھی ایک کپ چائے تو پلاؤ گرما گرم۔''

وہ باورچی خانے میں کھڑی چائے کی ٹرے سیٹ کر رہی تھی۔ اچانک عقب سے غیر متوقع پکار سن کر پیچھے پلٹی۔ ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' وہ حیران ہو کر عثمان کو دیکھ رہی تھی۔

''کیوں میرے یہاں آنے پر پابندی ہے؟'' اسٹینڈ سے گلاس اتار کر اس نے خود ہی کولر سے پانی لے لیا کہ وہ جو مجسمہ بن کر کھڑی تھی، اس سے پانی کے گلاس کی امید بھی نہیں تھی۔

''آپ جانتے ہیں۔ ہمارے رشتے کی بات چل رہی ہے باہر۔ اگر تایا ابو نے دیکھ لیا تو الگ سے شامت آ جائے گی۔ آپ جائیں یہاں سے۔'' وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی تھی۔ چائے کپوں میں پڑی

ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

''یار! کیا مسئلہ ہے تمہیں؟ میرے ابو ہیں، مجھے ڈانٹیں گے۔ تم کیوں اتنا ڈرتی ہو؟'' وہ اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا اور نیہا کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ اس کی جھکی پلکوں کی لرزش سے وہ جان گیا تھا کہ اب وہ بول نہیں پا رہی۔ ''اتنا مت ڈرا کرو۔ میں ہوں نا'' اس نے نیہا کا ہاتھ پکڑا اور وہ جیسے بے ہوش ہونے کو تھی۔

''آپ جائیں یہاں سے۔ پلیز۔''

''اچھا یار! جا رہا ہوں لیکن اب ذہن میں رکھنا ہماری منگنی ہو رہی ہے اور اس کے بعد زیادہ نہ سہی لیکن تھوڑا حق تو جتاؤں گا۔ اب خود کو اتنا تو مضبوط کر لو۔'' اس کی ناک پکڑ کر دباتے کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔

نیہا کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔ جتنا وہ بے صبرا اور شوخ تھا وہ اتنی ہی ڈرپوک اور سادہ تھی۔ جانے کیسے محبت نام کا رشتہ ان دونوں کے بیچ آ ٹھہرا تھا۔ اسی محبت اور عثمان کی ضد کی بدولت آج گھر میں منگنی کی رسم تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' عین دروازے میں وہ بی بی جان سے جا ٹکرایا۔

''کچھ چرانے نہیں آیا بی بی جان۔ چائے کا کپ مانگا تھا جو نہیں ملا تو واپس جا رہا ہوں۔'' نیہا کو گہری نظر سے تکتے اس نے جواب دیا۔

''دفع ہو یہاں سے۔ تیرے باپ نے دیکھ لیا تو یہیں سے مارتا ہوا گھر لے جائے گا۔'' انہوں نے اپنی دانست میں اسے ڈرایا تھا۔

''جا ہی رہا ہوں۔ آپ نے روک لیا۔''

''کیسی نکوڑی اولاد ہے۔ نہ شرم نہ حیا۔ جانے کون سا ہیرو بنا پھرتا ہے اور تیری ابھی تک چائے نہیں بنی کیا؟'' اس کے جانے کے بعد اسے برا بھلا کہتی اب وہ نیہا کی طرف آ گئی تھیں۔

''بن گئی بی بی جان! بس کپوں میں ڈال رہی ہوں۔'' جلدی سے چائے کے کپ ٹرے میں رکھ کر اس نے بی بی جان کو ٹرے تھمائی کہ کہیں اب اس کی شامت نہ جائے۔

اس شام اگرچہ اسے عثمان کے نام کی انگوٹھی نہیں پہنائی گئی تھی لیکن اس کے نام سے چند نوٹ ضرور اس کی ہتھیلی پر رکھے گئے تھے۔ سولہ سال کی اس لڑکی کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی منزل کا تعین کر دیا گیا تھا۔ منزل بھی وہ جس نے خود اس کی چاہ کی تھی۔ عثمان کی چاہ اب ایک رشتے کے نام سے اس کی بھی چاہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

''میری یہ سمجھ میں نہیں آتا اس لڑکے کے دماغ میں کون سا پارہ بھرا ہے جو اسے نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ پہلے منگنی منگنی کی رٹ لگا رکھی تھی۔ اب منگنی ہو گئی تو اسے شہر بدر ہونے کا شوق چرا ہا ہے۔''

بی بی جان آج کافی دنوں بعد آئی تھیں اور اسی حساب سے ان کے پاس کہانیوں کا ذخیرہ تھا۔ اتری شام کے سائے تلے وہ صحن میں بچھی چارپائی پر تکیے کے سہارے نیم دراز ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں جب انہیں اچانک ہی عثمان کی تازہ ترین ضد یاد آ گئی۔ نیہا کو ان کی کہانیوں سے کیا غرض ہوتی اگر اس میں عثمان کا نام نہ ہوتا۔ وہ چاول چننے کے بہانے باورچی خانے کے دروازے میں بلب کے نیچے بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''اب کیا ہو گیا بی بی جان؟'' امی نے ان کے سر میں ڈالنے کے لیے اصلی گھی کی کٹوری چارپائی رکھی تو وہ بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

''ہونا کیا ہے کہتا ہے شہر بھیجو گے تو ہی پڑھوں گا ورنہ مجھے کام میں لگا دو۔'' آنکھیں بند کیے سر پر گھی کی مہک سے ان کا غصہ دھیما ہونے لگا تھا۔

''بڑا ہی ضدی ہے۔ مجھے تو نیہا کی فکر ہے۔ ابھی چھوٹی ہے بس اس کی ضد کی وجہ سے کر دی۔'' امی کے لہجے میں اس کے لیے فکرمندی تھی۔

''فکر مت کیا کر۔ ابھی میں زندہ ہوں۔''

باپ بیٹھا ہے۔ سب سے بڑھ کر نیہا اس کی اپنی پسند ہے۔ کوئی اونچ نیچ نہیں کرے گا۔ بس ذرا صدی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ ہو جائے گا ٹھیک۔'' بی بی جان سکون کی وادی میں اتریں تو سارا غصہ کافور ہو گیا تھا۔ لہجے میں بھی سکون رچ گیا تھا۔

''اللہ کرے بی بی جان ایسا ہی ہو۔'' انہوں نے زیر لب کہا تھا۔ بی بی جان مساج کرواتے ہوئے سو گئیں تو وہ بھی اٹھ گئیں۔

''نیہا بیٹا! دیکھنا ذرا، سیمانے بی بی جان کی قمیص ٹھیک کر دی کہ نہیں۔ جاتے ہوئے لے کر جائیں گی۔'' امی کی آواز پر وہ اندر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ہی اس نے عثمان کو اندر آتے دیکھا۔ ایک لمحے کی دیر کیے بغیر وہ اندر بھاگ گئی تھی۔ جانتی تھی منگنی کے بعد کسی کو بھی اس کا یہاں آنا جانا پسند نہیں تھا لیکن وہ ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا، کسی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر کم ہی لیتا تھا۔ امی نے اسے ہی کہہ دیا تھا کہ جب وہ آئے تو سائیڈ پر ہو جایا کرو۔

''چچی جان! السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔'' اس کے سر پر پیار دیتے انہوں نے سلام کا جواب دیا اور اسے لیے بیٹھک میں آ گئیں۔

''بی بی جان کو لینے آئے ہو؟''

''نہیں بی بی جان کو لینے نہیں آیا۔ آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''میں ذرا چائے کا کہہ دوں پھر آتی ہوں۔''

''نہیں چچی جان! چائے نہیں۔ آپ سے بات کرنی ہے۔''

اس کی بات پر وہ بھی کرسی پر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ جانے کون سا بم پھوڑنے آیا تھا وہ۔

''میں نے ابو سے بات کی ہے، وہ مجھے لاہور بھیجنے کے لیے مان گئے ہیں۔ میں جانے سے پہلے تھوڑی سی دیر کے لیے نیہا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ یہیں پاس ہی جائیں گے۔ بس ایک کپ چائے پی کر اسے واپس چھوڑ جاؤں گا۔'' اس کی انوکھی فرمائش پر ان کا دل چاہا تھا، اپنا سر پیٹ لیں۔ کہاں تو نیہا کو اس کے سائے سے بھی بچایا جا رہا تھا اور کہاں وہ اپنے منہ سے اسے ساتھ لے جانے کی بات کر رہا تھا۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی اسے تمہارے ساتھ جانے نہیں دے گا، کیوں آئے ہو؟''

''چچی جان! میں غیر تو نہیں ہوں اور اب تو نیہا سے منگنی بھی ہو گئی ہے۔ آپ صرف ایک گھنٹہ دے دیں۔ کسی کو بھی مت بتائیے گا۔ ایک گھنٹہ پورا ہونے سے پہلے میں اسے واپس لے آؤں گا۔''

وہ قدموں میں آ بیٹھا تھا اور اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ انہوں نے نیہا کو اس کے ساتھ بھیجنے کی ہامی نہیں بھر لی۔ وہ ایسا ہی ضدی تھا۔ اسی ضد سے اس نے نیہا سے منگنی کی تھی۔ اسے لگا تھا اب اس کے نیہا تک جاتے سارے راستے سیدھے ہو جائیں گے لیکن یہاں تو وہ اسے دیکھنے سے بھی گیا۔ گھر میں الگ ڈانٹ ڈپٹ ہوتی رہتی تھی اور نیہا سے دوری کا ایک الگ قلق لگا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے لاہور جانے کی ضد باندھ لی تھی۔

یہ اس کی ضد ہی تھی کہ اگلی صبح کپکپاتی ہوئی نیہا اس کے ساتھ تھی۔ چھوٹے سے اس چشمے کے کنارے دونوں نے گھر سے تھرماس میں لائی چائے پی تھی۔

''آپ جا کیوں رہے ہیں؟ یہیں کسی کالج میں داخلہ لے لیا ہوتا۔'' خاموشی کی دبیز چادر کو نیہا نے تار تار کیا تھا۔

''خود تو تم سات پردوں میں چھپ کر بیٹھ گئی ہو۔ میں یہاں ہوں یا نہیں کیا فرق پڑے گا؟'' اس نے ستانے کے لیے کہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا نیہا دل پر لے لے گی۔

''میں ساری زندگی ایسے آپ کے سامنے بیٹھ کر گزار سکتی ہوں اگر مجھے اجازت ہو۔ ہمارے بڑے ہمارے فائدے کے لیے یہ پابندیاں لگا رہے ہیں۔ ورنہ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہوتا تو ہماری منگنی

کیوں کرتے؟ آپ بدگمان نہ ہو جایا کریں۔'' نیہا نے خاصا برا مان کر کہا تھا۔

''کیا فائدہ نظر آتا ہے تمہیں، ذرا مجھے بھی سمجھا دو۔''

''مجھے کیا پتا، میں تو ابھی چھوٹی ہوں۔'' سولہ سالہ نیہا کے منہ سے یہ بات سن کر وہ قہقہہ لگا تا ہنس پڑا تھا۔

''تم اگر چھوٹی ہو تو تمہاری منگنی کیسے کر دی انہوں نے؟''

''آپ کی ضد کی وجہ سے۔''

''میری ضد کی وجہ سے مجھے تم سے ملنے بھی دیں ناں۔''

چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی اوٹ میں اس چشمے کے کنارے اس وقت وہ دو ہی تھے۔ وہ اٹھ کر نیہا کے پاس بہت قریب آ گیا تھا۔ میرون سوتی شال میں اس کا موہنا روپ سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے، میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا نیہا! تم کیسے رہ لیتی ہو؟ کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ نیہا کی گھنی پلکیں حیا سے جھکی جا رہی تھیں۔

''بتاؤ نیہا! تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟ کیا میں اکیلا اس آگ میں جل رہا ہوں؟''

وہ اس کے کچھ اور قریب ہوا تھا۔

''بولو نیہا! کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟''

''کرتی ہوں۔'' اسے دور کرتے گھٹی گھٹی آواز میں اس نے جواب دیا تھا۔ وہ آہستگی سے اس سے دور ہوا۔

''گھر چلیں، کہیں دادا جان یا بی بی جان آ گئیں تو مجھے جان سے ہی مار دیں گی۔''

کچھ بھی کہے بنا وہ خاموشی سے واپسی کے راستے ہو لیا تو اس کے پیچھے شال سنبھالتی نیہا بھی چل پڑی۔

☆☆☆

آج ردا کی بارات اور ارسلان کا ولیمہ تھا۔ ردا کا میک اپ ماہ پارہ نے کیا تھا۔ وہ آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ دلہنا پے کا روپ ٹوٹ کر برسا تھا اس پر۔ پھپھو نے اسے منزہ کے میک اپ کا بھی کہا تھا لیکن اس نے کورا جواب دے دیا تھا۔

''ردا سے دوستی ہے، محبت ہے اسی مروت میں اس میک اپ کر دیا ہے ورنہ میں دلہنیں تیار نہیں کرتی بس میک اپ سکھاتی ہوں۔''

انہوں نے اس کا خاصا برا مانا تھا لیکن اب ردا کو دیکھ کر ساری شکایت بھول گئی تھیں۔ ردا پارلر جاتی تب بھی بارہ پندرہ ہزار کا خرچ ہو جانا تھا جو ماہی کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ اسے تیار کر کے ہال بھیجنے کے بعد اب ماہی خود بھی تیار ہو رہی تھی۔ سب ہی ہال جا چکے تھے بس وہ اور مما ہی گھر موجود تھیں یا پھر خالو جان۔ انہیں لینے کے لیے جنید نے آنا تھا۔

ماہی نے آج گہرے سبز رنگ کا شلوار قمیص کا سوٹ پہنا ہوا تھا، جس کے گلے اور دامن پر اسٹون کا سلور نفیس کام ہوا تھا۔ کھلے بالوں کے ساتھ میک اپ اس نے ہلکا ہی کیا تھا۔ اس کے تیار ہونے تک جنید بھی آ گیا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے باہر نکلی تو اس کے حلق تک کڑوا ہو گیا تھا فرحان کو دیکھ کر۔

''چلیں۔'' اسے مرکزی دروازے کے سامنے بت بنا کھڑا دیکھ کر مما نے پکارا۔ بڑی کراہیت سے وہ گاڑی میں جا کر بیٹھی تھی۔

''چچی جان! آپ کی بیٹی بہت نخرے والی ہے۔'' گاڑی چلاتے اس نے کہا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''ہونا کیا ہے، ایک غلط فہمی ہو گئی تھی جس کی سزا پر ایسا منہ بنایا ہوا ہے۔ میں آپ کے سامنے سوری کر رہا ہوں۔ اس سے کہیں، اب اپنا موڈ ٹھیک کر لے سوری ماہ پارہ! میرا وہ مطلب نہیں تھا جو میں کہہ گیا تھا۔'' گاڑی چلاتے وہ سامنے دیکھ رہا تھا لیکن ماہی اس کی نظریں اپنے وجود کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے ماہی؟''

''کچھ نہیں مما! بس ایسے ہی غصہ آ گیا تھا مجھے۔'' بات سمیٹنے کے لیے اس نے اپنی غلطی مان لی تھی کہ مما کے ساتھ یا مما کے سامنے اس فرحان سے بحث کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''اب تو کوئی ناراضی نہیں ہے؟''

''نہیں کوئی نہیں۔'' کہہ کر اس نے جان چھڑائی۔

ہال نزدیک ہی تھا۔ جب وہ پہنچے تو مما اتر کر اندر چلی گئیں وہ بھی اپنا بیگ پکڑ کر ان کے پیچھے نکل رہی تھی جب ایک بار پھر اس نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

''میری بات سنو ماہی۔ پلیز۔''

''مما کے سامنے بات کر نہیں لی؟ اب کیا رہتا ہے؟''

اس کے تپنے پر وہ مسکرایا۔

''مجھے جلدی غصہ نہیں آتا لیکن کل میں انتہائی تکلیف میں تھا کہ ایک بندہ بلا وجہ آپ کو نظر انداز کرنے لگ جائے اور وہ بندہ آپ کے لیے اہم بھی ہو تو دکھ ہوتا ہے۔ میں بار بار اپنی غلطی اسی لیے پوچھ رہا تھا۔ تم آج ہو، کل چلی جاؤ گی تو کیا ضروری ہے، کسی کا دل دکھا کر جاؤ۔ باقی میں کوئی تین ایجر تو ہوں نہیں جو غیر ذمہ داری دکھاؤں۔ اب کچھ نہیں کہوں گا۔ تم صرف ایک بار اپنا رویہ جانچ کر دیکھنا میرا کتنا قصور ہے۔''

بات مکمل کر کے وہ گاڑی پارک کرنے کے لیے چلا گیا تو وہ بھی اندر آ گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا غلطی اس کی نہیں تھی۔ ماہی نے اسے شاہ میر سمجھ کر اہمیت دی اور پھر باقیوں کی طرح نظر انداز کر دیا۔

غلطی تو اس کی اپنی تھی۔ یہ بات بھی سچ تھی کہ اسے ایک آدھ دن میں چلے جانا تھا شاید پھر کبھی نہ آنے کے لیے تو پھر اچھے طریقے سے جانے میں کیا مضائقہ ہے۔

اندر آتے آتے وہ فرحان کی طرف سے دل صاف کر چکی تھی۔ مما اسے کہیں دکھائی نہیں دیں تو وہ خود ہی ایک خالی کرسی پر جا بیٹھی۔ شاہ میر اسے آج پورا دن کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر فرحان قلفہ لیے اسی کے پاس آ گیا تھا۔ اب کی بار اس نے کوئی سخت ردِعمل نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

لاہور میں ہاسٹل کی زندگی عثمان جیسے لڑکے کو بہت راس آئی تھی۔ پڑھائی اپنی جگہ لیکن یونیورسٹی کے بعد لاہور کی مشہور جگہوں پر یار دوستوں کے ساتھ نکلنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ یہاں تک کہ جن بازاروں کو وہ ایک بار دیکھ چکے تھے، وہاں بھی بار بار جاتے، کبھی کچھ کھانے کے بہانے تو کبھی کچھ لینے کے بہانے۔ اسے ایک ماہ ہو چلا تھا آئے ہوئے اور اس کا اتنا دل لگ گیا تھا کہ اسے لگ رہا تھا۔ وہ چھٹیوں میں بھی واپس نہیں جائے گا۔ اس دن انگلش کی کلاس کے بعد وہ باہر نکلا تھا۔ ارادہ تو باہر جا کر کچھ کھانے کا تھا کہ ہاسٹل کے میس میں ملنے والا کھانا اسے شاذ ہی پسند آتا تھا، سو آج بھی وہ بھوکا ہی چلا آیا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔''

وہ پیچھے مڑا۔ وہ لڑکی اسی سے مخاطب تھی۔ دوپٹہ اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ سانولا رنگ ہونے کے باوجود وہ جس اعتماد سے کھڑی تھی، وہ اعتماد لڑکا ہونے کے باوجود عثمان میں بھی نہیں تھا۔

''کیا ہوا، جم کیوں گئے ہو؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔''

''اچھا یہ نوٹس پکڑو اور کاپی کروا کر لاؤ۔ میں کینٹین میں بیٹھی ہوں وہیں لے آنا۔''

نوٹس اور پیسے اس کے ہاتھ میں تھما کر اسے حیران پریشان چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئی تھی پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

''زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھے؟ میں تمہاری کلاس اور رول نمبر نام سب جانتی ہوں۔ بی کیئر فل۔''

اس نے ہوشیاری کیا کرنی تھی، وہ تو بس حیران رہ گیا تھا۔ یہاں اس نے ایک سے ایک بڑھ کر لڑکی دیکھی تھی۔ صرف دیکھی تھی۔ یہ پہلی لڑکی تھی جس سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ کتنی پراعتماد تھی وہ ایک انجان لڑکے سے بات کرتے ہوئے اور ایک نیہا تھی جو اپنے منگیتر سے بات کرتے بھی دوہری ہوئی جاتی تھی۔ بڑے غلط وقت پر بڑے غلط طریقے سے اسے نیہا کی یاد آئی تھی۔ فوٹو اسٹیٹ کروا کر وہ کینٹین میں آیا تو وہ اسے فوراً ہی ایک میز کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی نظر آ گئی۔

''یہ آپ کے نوٹس۔''

''تھینک یو۔ بیٹھ جاؤ۔''

وہ مشینی انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''مجھ سے لائنوں میں کھڑا نہیں ہوا جاتا اسی لیے تمہیں بھیجا تھا۔ میں نے کہا تھا ناں زہرا! یہ بہت بیبا بچہ ہے۔''

ساتھ بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھتے اپنی بات پوری کر کے اس نے بے باکی سے قہقہہ لگایا تھا جس پر وہ خجل ہو گیا۔

اس کے ساتھ عثمان کی یہ پہلی ملاقات تھی جو آخری نہیں تھی۔ اس کا نام جنت نور تھا اور وہ اسی شہر سے ہونے کے باوجود ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ وجہ اس کی سوتیلی ماں تھی جسے وہ گھر میں برداشت نہیں ہوتی تھی۔ باہر شتر بے مہار کی طرح پھرنے کے باوجود اس میں کوئی اخلاقی یا کردار کی کجی نہیں تھی۔ بس وہ بے باک اور حد درجہ پراعتماد تھی اور یہی شے عثمان کو لوٹ کر لے گئی تھی۔ عثمان اگر اس پر دل ہارا تھا تو اسے بھی عثمان کی صورت جائے پناہ مل گئی تھی۔ اجنبیت سے دوستی تک پہنچے تو جیسے ہر پردہ ختم ہو گیا تھا۔ جنت لڑکوں کی طرح بے باک مذاق کرتی اور ہاتھوں پر ہاتھ مار کر ہنستی عثمان کو احساس دلاتی کہ اس نے نیہا سے منگنی کر کے بہت جلد بازی سے کام لیا۔ یہاں آ کر اسے محسوس ہوا کہ گھر والے واقعی ٹھیک تھے کہ اتنی جلدی منگنی نہیں کرنی چاہیے۔ جنت کے ساتھ ریس کورس اور جناح باغ میں پھرتے اسے کبھی نیہا یاد نہیں آئی تھی۔ دل نے جنت کو چن لیا تھا اور اپنے انتخاب پر ایک بار پھر مطمئن تھا۔ ابھی چار سال باقی تھے اور اسے فی الحال کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کا اپنا خیال تھا جسے آنے والے وقت نے غلط ثابت کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

☆☆☆

ردا کا ولیمہ ان کے لیے آخری تقریب تھی آج بخوبی انجام پائی تھی۔ سب گھر والے ارسلا کے کمرے میں موجود تھے۔ سارے تایا چچا کے ایک ہی گلی میں واقع تھے سو کوئی آ رہا تھا اور کوئی جا تھا۔ سردرات اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں سمیت ا اداس دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی تیئس سالہ زند میں اس ہفتے سے زیادہ خوب صورت کچھ نہیں گ اس نے بھرپور رونق دیکھی تھی۔ دادا اور ان بھائیوں کے خاندان بھی یہیں آباد تھے اور ان میل ملاپ بھی ایسا ہی تھا جیسے چچازاد، تایازاد ہو کے بجائے وہ سب سگے ہوں۔ اتنے سارے تایا، پھپھوئیں، خالائیں اور اتنے کزنز تھے جن نام بھی اسے مشکل سے ہی یاد ہوں گے۔ اسے سب ہمیشہ یاد رہنے والا اور یاد آنے والا تھا۔ ر پر سر ٹکائے وہ ستاروں سے بھرا وہ آسمان دیکھ رہا جو ہمیشہ سے یہیں تھا، ہر راز کا امین، ہر سرد و گ گواہ۔

''کیا یار! ابھی شادی ختم ہوئی ہے۔ ابھی رہی ہو۔ کچھ دن اور رک جائیں تو تمہیں سار گھماتے۔ اتنا مزہ آتا تھا۔'' فرحان گرم کشمیری چ کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کے کھڑا ہو گیا۔

''اگلی بار جب آؤں گی، تب دیکھ لو ابھی اتنا حرج ہو رہا ہے کلاسز کا، مزید نہیں ٹھہر چائے کا کپ پکڑ کر وہ ریلنگ سے ہٹ گئی۔ اس کے پیچھے ہی نیچے آ گیا۔

''مامی! دو تین دن اور رک جائیں، ہم

کما پھر الیں کچھ۔"

"بیٹا! ابھی تو نہیں رکا جاسکتا۔ اس کے کام کا حرج ہوگا۔ ویسے بھی تم لوگ ابھی شادی کی تھکن اتارو۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی پھر آئیں گے۔ خاص طور سے گھومنے پھرنے کے لیے، تب چلیں گے۔"

ان کی بات پر اسے بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ ماہی بھی جانتی تھی، ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔

"کب جانا ہے؟"

"صبح ناشتہ کر کے نکل جائیں گے۔" گرم چائے کے گھونٹ بھرتے ماہ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کو بس میں بٹھا آؤں گا۔ میرا انتظار کیجیے گا۔"

اثبات میں سر ہلا کر ماہی اپنی سوچوں میں گم ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر اس کی خاموشی محسوس کر کے اٹھ کر چلا گیا۔ ماہی کا دل چاہ رہا تھا ایک بار اوپر جا کر دیکھے، کیا پتا وہ آ گیا ہو۔ ساری رات سوتے جاگتے عجیب بے زاری سی گزری تھی۔ صبح جیسی خوب صورت تھی اسے اتنی ہی بے کیف محسوس ہو رہی تھی۔ پہاڑوں پر چڑھتے سورج نے سونا بکھیر رکھا تھا۔ وہ کھڑکی سے طلوع ہوتے سورج کو دیکھتی رہی یہاں تک نیلا آسمان اندھیرے کی چنگل سے نکل آیا۔

"ماہی بیٹا! اٹھ کر ناشتہ کر لو پھر نکلنا بھی ہے اور یہ کسی بیگ میں ڈال لو۔ فرحان! تمہارے اور میرے لیے شالیں لایا تھا رات۔"

مما نے اسے آواز دی اور دو پیکٹ اس کے پاس بیڈ پر رکھ کر واپس چلی گئیں۔ گھڑی دیکھ کر پل بھر بیٹھی وہ بھی اٹھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ باہر آئی تو گزرے دنوں کی نسبت کافی سکون تھا۔ سب مہمان اپنے اپنے گھروں میں جا چکے تھے۔ ازکی، تبسم کے پاس آئی ہوئی تھی۔ ماہ پارہ کو جانے کے لیے سامان سمیٹتے دیکھ کر اس کے دل میں ٹھنڈک اتر رہی تھی۔ شاہ میر آج یہاں نہیں تھا، اس بات کی اسے زیادہ خوشی تھی کہ ایک آخری ملاقات بھی ان کے حصے میں نہیں آئی۔ ماہی کو بھی اس کا انتظار تھا آخری بار اسے دیکھ ہی سکتیں۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں تھا۔ جب یہ طے تھا کہ اس شخص کے بغیر زندگی گزارنی تھی تو پھر کیا فرق پڑتا تھا کہ رسم جدائی نبھائی بھی گئی یا تشنہ رہ گئی۔

"اتنی جلدی جا رہی ہو۔ کچھ دن رک جاتیں تو ماہی بھی بچوں کے ساتھ شہر گھوم پھر کر دیکھ لیتی۔"

بیگ وسیع صحن میں نکال کر رکھتے دیکھ کر پھپھو نے مما سے کہا تو اس نے کمرے کے دروازے سے آواز لگائی۔

"پھپھو آئی تو میں بھی یہی سوچ کر تھی لیکن یہاں اتنا مزہ آیا کہ باہر جانے کا سوچا ہی نہیں۔ اب اگلی بار آؤں گی تو پورا شہر چھان ماروں گی۔" اسے خود یقین نہیں تھا کہ اب بھی وہ اس شہر میں قدم بھی رکھنے کا سوچ سکے گی۔ بس ان کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اسی لیے جھوٹی آس لگا رہی تھی۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ جب آنا ہو تو بتانا۔ میں فرحان یا جنید کو بھیج دوں گی لینے۔"

"کھانا لگا دیا ہے، آ کر کھا لیں۔" فرح نے آواز دی تو پھپھو اور مما اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ سارا سامان باہر رکھ کر وہ بھی ہاتھ دھو کر ناشتا کرنے بیٹھ گئی۔ ناشتے پر بھی پھپھو نے اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ وہ ابھی ناشتہ کر رہے تھے کہ ولید تایا جان آ گئے۔

"میں نے سوچا، کہیں بنا ملے نہ نکل جاؤ اس لیے بھاگا بھاگا آیا۔" اس کے سر پر ہاتھ رکھتے انہوں نے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

"ہم واقعی نکلنے لگے تھے۔"

"بھائی! ذرا شاہ میر یا جنید کو بلا دیں انہیں اسٹاپ تک چھوڑ آئیں۔ فرحان کو بھیجنا تھا لیکن وہ صبح ہی صبح نکل گیا ہے کہیں۔"

پھپھو نے انہیں بیٹھنے کے لیے کرسی دی اور تبسم کو آواز لگائی۔ "تبسم بیٹا! ماموں کے لیے ناشتا باہر لے آؤ۔"

شاہ میر کے نام پر ماہ کی دھڑکنیں منتشر ہوئی تھیں۔

''نہیں، اتنی صبح کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے لے آؤ بس۔'' جیب سے فون نکالتے ہوئے انہوں نے کہا اور نمبر ملایا۔ ''شاہ میر کہاں ہو؟''

''اچھا اپنے چاچو عثمان سے گاڑی کی چابی لے آؤ۔ نیہا اور ماہ کو اسٹاپ تک چھوڑ آؤ ذرا۔''

ان کی بات پر ماہ پارہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ شاہ میر تو عثمان چاچو کا بیٹا تھا۔ اس نے مما کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سن چکی تھیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ولید تایا جان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاہ میر تو عثمان کا بیٹا تھا اور اسی وجہ سے انہوں نے کیا کچھ سوچا ہوا تھا۔ اتنے سالوں کی منصوبہ بندی کا محل زمیں بوس ہوا تو ہوش و خرد سے بے گانہ ہوتے ان کے لبوں سے ایک نام نکلا۔

''شاہ میر!'' جانے وہ کیا کہنے لگی تھیں جو ان کے لبوں پر دم توڑ گیا اور وہ کٹے شہتیر کی طرح سے زمین پر جا پڑیں۔ ماہ ان کی طرف بھاگی۔

ولید تایا جان نے ان کے نیلے پڑتے ہونٹ دیکھ کر دوبارہ نمبر ملایا۔

☆☆☆

آسمان پر کالے کالے بادلوں کے خیمے تھے۔ ایسے میں اس کا دل مچل مچل کر جنت نور کے ساتھ کی خواہش کر رہا تھا۔ اس نے ہاسٹل کے نمبر پر فون کر کے اسے کھانے کے لیے باہر بلایا تھا۔ وہ بھی شاید دل کے ہاتھوں مجبور تھی جو فوراً چلی آئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد بے وجہ مال روڈ پر چہل قدمی کرتے انہوں نے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں فلموں کی بات شروع ہوگئی اور ان کا فلم دیکھنے کا موڈ بن گیا۔

لاہور کے آسمان نے اس رات کھل کر پانی برسایا تھا۔ وہ دونوں ایک سپر ہٹ فلم کا آخری شو دیکھ کر سینما سے باہر نکلے تھے۔ بارش ابھی بھی نرم پھوار کی صورت برس رہی تھی۔

''اب کیا کیا جائے؟'' دونوں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے جب عثمان نے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے، نکلتے ہیں اس سے پہلے بارش تیز ہو، ہاسٹل پہنچ جاتے ہیں۔'' ہتھیلیوں کو مسلتی وہ پاگل لڑکی یخ بستہ ہواؤں کی پروا کیے بغیر باہر آئی تھی تو عثمان کہاں رہ سکتا تھا۔

''اتنی دیر سے ہاسٹل جانے پر کوئی کچھ کہے نہیں؟'' اس کے ساتھ ساتھ چلتے اس نے بات شروع کی۔

''سب جانتے ہیں، میں وقت بے وقت چل پڑتی ہوں، چاہے رات کے دو بجے ہوں کچھ مرضی کے خلاف ہوگیا تو واپس آجاتی ہوں۔''

اس کے جواب پر وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔

پھوار نے ایک دم جارحانہ انداز اپنا لیا تھا۔ بچنے کے لیے کسی شیڈ کی تلاش میں وہ دونوں پوری طرح بھیگ گئے تھے۔ پہلے چھینٹیں شروع ہوئیں اور نور تو باقاعدہ کپکپانے لگی تھی۔ پوری سڑک پر ان دونوں کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ویسے بھی اتنی سردی میں کوئی سر پھرا ہی ہوگا جو باہر نکلے گا۔ وہ دونوں تھے ہی سودائی۔ ایک منہدم عمارت دکھائی دی تو اسی جائے پناہ سمجھ کر وہ نور کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتا ہوا بھاگا۔

''یہاں کب تک بیٹھیں گے، میری مانو تو چلتے ہیں۔''

''تمہاری مان کر ہی یہاں بیٹھے ہیں ورنہ سے کہیں اچھا تھا، سینما میں ہی بارش رکنے کا انتظار کرتے۔'' گلے سے مفلر نکال کر نچوڑتے ہوئے نے ہنس کر کہا۔ ''یہ گیلی جرسی اتار دو ورنہ زیادہ کردے گی یہ۔''

''نہیں، بارش ذرا ٹھہرتی ہے تو نکل ہیں۔'' آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھتے اس جرسی کا دامن پکڑ کر نچوڑا۔

''تم پاگل ہو کیا؟ اتنی ٹھنڈی ہوا چل ہے۔ اتارو اسے۔ شال کو نچوڑ کر دوبارہ اوڑھ لو۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ایک دو منٹ اسے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر اس کی شال کھینچی

ن کیوں نہیں رہیں؟'' اسی لمحے بجلی چمکی اور عثمان نے اس کے نیلے پڑتے ہونٹ دیکھے۔ آگے بڑھ کر اس نے خود ہی اس کے کندھے پر دھری شال اتاری اور اچھی طرح نچوڑ کر جھٹک دی۔ ''اب جرسی اتارو گی یا وہ بھی میں اتار دوں؟''

اس کے فیصلہ کن لہجے پر اس نے جلدی سے منہ پھیر کر جرسی اتاری۔ سرد ہوا جیسے ہڈیوں کے گودے تک کو جمانے پر تلی تھی۔

''شاباش اب یہ شال اوڑھ لو۔'' شال اس کی طرف بڑھاتے وہ جرسی پکڑنے کے لیے آگے ہوا۔ وہ پیچھے مڑتے ہوئے اس کے سینے سے جا ٹکرائی۔ عثمان نے اسے بے ساختہ خود میں بھینچ لیا۔ خود وہ بھی وہیں سمٹتی اور کھلتی چلی گئی۔ وہاں گزارے ہوئے ڈیڑھ گھنٹوں نے ان کے درمیان سارے حجاب اٹھا دیے تھے۔

بارش رکی تو ایک دوسرے سے نظریں ملائے بغیر وہ خاموشی سے واپس اپنی اپنی جگہ چلے گئے۔ عثمان نہ تو شرمندہ تھا اور نہ ڈرا ہوا۔ نور البتہ گم صم ہوگئی تھی۔ وہ اس کے سامنے آتا تو کترا کر نکل جاتی۔ کچھ دن تو اس نے برداشت کیا اور پھر اس کے سر پر جا پہنچا۔ وہ گراؤنڈ میں زہرا کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' اس کے لہجے میں ایسا کچھ غیر معمولی تھا جسے سن کر زہرا فوراً کھڑی ہوئی اور خدا حافظ کہتی نظر سے دور ہوگئی۔ نور بے بسی سے لب کاٹتی رہ گئی۔

''کیا مسئلہ ہے تمہیں؟''

''کچھ نہیں۔''

''تو پھر نظر انداز کر کے منہ پھیر کر مجھے کیوں تکلیف دے رہی ہو؟''

وہ چپ بیٹھی رہی۔

''نور! میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔''

اس کے غصے سے کہنے پر نور نے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ ''میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں عثمان۔''

''تو میں نے کب کہا۔ کہ تم ایسی ویسی لڑکی ہو؟'' وہ حیران ہوا۔ ''میں نے تو کبھی سے کبھی تمہارے بارے میں بات تک نہیں کی۔''

''جو بھی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ.....''

''تم اپنے چاہنے کا سوچ رہی تھیں تو میرے چاہنے کا بھی سوچ لیا ہوتا۔ کیا ہو گیا ہے نور؟ کیوں ایسے بے موت مار رہی ہو مجھے؟ میں بیچ راستے چھوڑ کر جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ٹھیک ہے اس رات جو ہوا وہ بے اختیاری میں ہوا لیکن بخدا میں تم سے سچا پیار کرتا ہوں۔ تمہارا رویہ مجھے مار رہا ہے۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو پلیز۔'' اس کی ساری باتوں کے جواب میں وہ اٹھ کر تیزی سے وہاں سے چل پڑی۔ عثمان اس کے پیچھے بھاگا۔

''نور..... میں یہاں سب کے سامنے کوئی تماشا نہیں چاہتا۔ مجھے بس ایک بات کا جواب دے دو، اس کے بعد کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔''

نور نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا جو کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا کہ بیچ راستے چھوڑ کر جانے والوں میں سے نہیں ہے۔

''کیا تم مجھے نہیں چاہتیں؟''

''کیا ان سب باتوں سے وہ واپس آسکتا ہے جو ہوا؟'' منہ پھیر کر ارد گرد دیکھتے اس نے بڑی ہمت سے کہا تھا کہ عثمان کا چہرہ دیکھنے کی جرأت وہ خود میں نہیں پاتی تھی۔

''تو میں پوچھتا ہوں، کچھ بھی واپس کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں تم سے شادی کروں گا، تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ تمہیں اور کیا چاہیے بتاؤ مجھے؟''

''تم..... واقعی مجھ سے..... شادی کرو گے؟'' اس کی طرف دیکھتے نور کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''ہاں جیسے ہی ڈگری ملتی ہے، میں واپس جاتا ہوں۔ گھر والے میری بات ضرور مان جائیں گے۔ انہیں میری ضد کا پتا ہے اور تب تک تمہیں چھوؤں گا

بھی نہیں۔''

اسے یقین دہانی کرواتے وہ بہت پراعتماد تھا۔ اسے یاد تھا نیہا سے منگنی اس نے کن مشکلوں سے کروائی تھی۔ لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس وقت کسی کو اس نے ساتھ کی آس نہیں لگائی تھی۔ نور کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس شخص پر اعتبار کر لیتی اور اسے اعتبار کرنا ہی تھا۔

ڈیڑھ ماہ بعد اس کے ہاتھ میں حمل کی مثبت رپورٹ نے ثابت کر دیا کہ اسے عثمان پر اعتبار کرنا ہی تھا۔ نور کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی تھی۔ عثمان نے کرائے پر ایک چھوٹا سا گھر لے لیا اور اس سے بھی پہلے اس نے یار دوستوں کی مدد سے ایک مولوی کی معیت میں نور سے نکاح کر لیا تھا۔ مقررہ وقت پر نور نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا جسے ان دونوں نے شاہ میر کا نام دیا تھا۔ وقت کا دھارا بہتا رہا اور بالآخر عثمان کی ڈگری مکمل ہوگئی۔ یہی وقت تھا جب اسے گھر والوں کو نور کے بارے میں بتانا تھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تمہیں ایک دم گھر والوں کے سامنے لے کر جاؤں، اس لیے تم ہوٹل میں رکو۔ میں شاہ میر کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ جیسے ہی مجھے لگا کہ حالات ہمارے حق میں ہیں، میں تمہیں لے جاؤں گا اور اگر بالفرض ایسا نہیں ہوتا تو میں واپس آجاؤں گا۔ ہم لاہور چلے جائیں گے۔''

نور متفق ہونے کے علاوہ کیا کہہ سکتی تھی۔ اسے ہوٹل چھوڑ کر وہ شاہ میر کو ساتھ لے گیا۔

''یہ بچہ کون ہے عثمان؟'' گھر میں سب سے پہلے اس کی ملاقات سعید بھائی جان سے ہوئی تھی۔

''یہ میرا بیٹا ہے۔'' اس نے شاہ میر کا ہاتھ ایسے کس کر پکڑا ہوا تھا، گویا کوئی اس سے چھین کر لے جانے والا ہے۔ اندر سے آئی امی جان نے بھی اس سے پہلے شاہ میر کو دیکھا تھا۔ دل نے جیسے انہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ دل پر ہاتھ رکھے وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''بکواس مت کر۔ ٹھیک سے بتا کون ہے؟''

سعید کی بات میں رد ضرور تھا لیکن لہجہ اس کا بے یقین نہیں تھا۔

''میں نے شادی کر لی ہے اور یہ میرا ہے۔''

اس کی بات مکمل ہونے پر امی جان تیر کی طرح اس کے سر پر پہنچی تھیں۔ انہوں نے عثمان کے چہرے پر تھپڑوں کی برسات کر دی تھی۔ نیہا کا بے چین ان کی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ خود بیٹی کی تھیں۔ اس ناانصافی پر کانپ کانپ گئی تھیں۔

''ذلیل نامراد! یہی سب کرنا تھا تو اس آس کیوں دلا کر گیا تھا؟'' اسے پیٹتے پیٹتے وہ رو لگی تھیں۔ آن کی آن میں سارا گھرانہ وہیں صحن جمع ہوگیا تھا۔ کسی نے جا کر چاچو کے گھر بھی اط کر دی اور وہاں سے بھی تقریباً سب آ گئے تھے۔ بار۔ یہ پہلی بار تھا جب نیہا کے پیروں کو کسی زنجیر نہیں جکڑا تھا۔ چار سالوں میں اسے پہلی بار تھا۔ پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہوگیا تھا یا شاید صورتحا وجہ سے ہوا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی جو ترتیبی سے بڑھی ہوئی اس کے چہرے پر دکھائی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود ننھے ہاتھ و چھوٹا سا وجود جیسے بنا بنایا دوسرا عثمان تھا۔ وہ رو کے اسے دیکھتی رہی۔ جانے کسی نے کیا ک ہوا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ ہوش تب آیا جب جان دل پر ہاتھ رکھتے صوفے پر گرتے چلے گئے ''ایمبولینس کو بلاؤ کوئی۔'' جانے کس نے تھا۔

''اتنی جلدی نہیں مروں گا۔ تم لوگ مو بلاؤ۔ میں آج اور ابھی نیہا کا نکاح پڑھواتا ہو ان کی گھٹی گھٹی آواز پر کتنے قدم ساکت ہوئے۔

''شاہ ویز میں تمہارے علاوہ اپنے بیٹوں میں سے جس سے کہوں کہ وہ نیہا کو اپنی لے، وہی انکار نہیں کرے گا لیکن یہ سب تمہا بیٹے نے بگاڑا ہے اس لیے یہ تم پر فرض ہے کہ داغ کو دھوؤ۔ جیسے مرضی سہرا باندھ کر لے آنا،

یہا کا نکاح پڑھوانا ہے۔"

"اب کیا نکاح پڑھوائیں گے۔ مجھے اپنی بچی نہیں رولنی۔" امی نے نفرت سے کہہ کر زمین پر تھوک دیا۔ ان کا ہاتھ پکڑا اور گلی میں نکل آئیں۔

جانے کیا میٹنگ ہوئی، کیا بات ہوئی۔ شام کو سب ان کے گھر آئے تھے۔ اس کے سر پر سرخ دوپٹہ ڈال کر اس کے سارے حقوق ریان کے نام لکھ دیے گئے تھے۔ اس سے تو رسمی طور پر پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ عثمان کا کیا اپنی جگہ لیکن اس بات نے تو جیسے اس سے سارے احساسات چھین لیے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی، ابھی تو امتحان شروع ہوا ہے۔ دادا جان کو جانے کس شے کی جلدی تھی کہ انہوں نے اسے ساتھ ہی رخصت بھی کر دیا تھا۔

گلابی بیڈ شیٹ پر گلابوں کی پتیاں جیسے نیہا کی امید پر کسی پیارے کا آخری تحفہ تھیں۔ کسی شادی پر بنایا گیا سبز رنگ کا ہلکے کام والا جوڑا پہنے سرخ دوپٹہ اوڑھے وہ ریان کے کمرے میں کسی مجسمے کی طرح لا کر بٹھا دی گئی تھی۔ سن دماغ کے ساتھ بیٹھی وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا چاہ رہی تھی جب بالآخر ریان کمرے میں چلا آیا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟" دروازہ بند کرتے اس نے کہا۔

نیہا کو اس کی آواز میں مارگلہ کے پہاڑوں پر جمی سفید برف کی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ خشک حلق میں کانٹے پڑے تھے تو ذہن بھی سن ہوا تھا۔ وہ کچھ جواب نہیں دے سکی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں، مجھے یہاں دیکھ کر تم کیا محسوس کر رہی ہو گی۔ اس رات کو لے کر خواب عثمان نے ساتھ سجائے تھے اور تعبیر نکلا ریان، یعنی میں۔ بہت دل دکھا ہو گا نا؟"

ساری حسیات جیسے ایک دم جاگ گئی تھیں۔ خوف سے وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی تھی۔

"او میری جان! ایسے دور دور تو مت جاؤ آخر تمہارا شوہر ہوں۔" اسے دیکھتے ہوئے ریان نے اپنا کوٹ اتارا اور اس کے پاس بیڈ پر آ گیا۔ اس کے سر سے سرخ دوپٹہ اس نے نوچ کر نیچے پھینکا تھا۔

"میرا ابھی بہت دل دکھا ہوا ہے۔ تم جانتی ہو نا، میں نے کبھی کسی کے جوٹھے برتن میں نہ کھایا ہے نہ پیا ہے اس کے باوجود ایک استعمال شدہ لڑکی میرے حصے میں آئی ہے۔ بہت دکھی ہوں میں سچ میں۔" اس کے چہرے پر لرزتی آنے والی گھڑیاں پڑھ کر وہ جیسے محظوظ ہو کر بولا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" کانپتی آواز میں نیچی نظر کے ساتھ کرلاتے دل کو نظر انداز کر کے اس نے جواب دیا۔

"جب میں بات کر رہا ہوں، ٹوکنے کی غلطی مت کرنا۔ پہلی بار ہے، اس لیے معاف کر رہا ہوں۔" اس کی ٹھوڑی پکڑ کر زور سے مسلتے اس نے چبا چبا کر کہا تھا۔ درد کی شدت سے نیہا کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"اور جھوٹ مجھے بالکل پسند نہیں۔ جانتا ہوں، گھر کا ماحول جیسا ہے تمہیں اس کے ساتھ زیادہ موقع تو نہیں ملا ہو گا، تب ہی تو اتنے اعتماد سے یہاں میرے بستر پر چڑھ بیٹھی ہو، لیکن اس نے تمہیں چھوا تو ہو گا نا؟ ہے ناں؟"

اس کے کھلے الزام سن کر نیہا کا جی چاہا، زمین میں زندہ دفن ہو جائے۔

"بولو ہاں کہ نہ؟" اس کی چوٹی پکڑ کر جھٹکا دیتے اس نے اقرار چاہا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔۔"

"تو میں تمہیں پہلی رات ہی غلط لگنے لگا نیہا بیگم۔" اسے جھٹکے سے پیچھے گراتے وہ بیڈ سے اتر کر بتی بجھانے چلا گیا۔

یہ اس رشتے کی شروعات تھی جس نے نیہا کے دل میں عثمان کے لیے نفرت بھر دی تھی۔ اگلی صبح ریان نے لاہور شفٹ ہونے کا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ گھر والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ بی بی جان تو خوش ہوئی تھیں کہ اسی بہانے ان دونوں کو

ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کو ملے گا جس سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ وجہ تو نیہا بھی نہیں جانتی تھی لیکن اندر کہیں جیسے اسے علم تھا کہ یہاں سے لے کر جانے کے فیصلے میں اس کے لیے سزا کا عنصر ضرور موجود ہوگا۔ اور ہوا بھی یہی۔

''چلو تمہیں اس شہر میں لے آیا ہوں جہاں تمہیں ہواؤں میں اس کی سانسوں کی خوشبو تو ملے گی۔ اب تم مجھے مکمل طور پر بے حس نہیں کہہ سکتیں۔ کتنا احساس ہے نا مجھے تمہارا؟''

لاہور اترتے ہی اس نے نیہا کے کانوں میں صور پھونکا تھا۔ یہ لاہور نہیں تھا بلکہ نیہا کے لیے جہنم تھا۔ شروع شروع میں وہ اسے محض بول کر اذیت دیتا تھا لیکن اس کی خاموشی جو اس نے اپنی قسمت سے سمجھوتا کر کے اوڑھ لی تھی اسے دکھنے لگی تھی۔ اب اس نے نیہا پر ہاتھ اٹھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ پہلے پہل ہاتھ اور پھر مختلف چیزوں سے اسے دھنک کر رکھ دیتا۔ وہ عثمان کو جتنی بددعائیں دے سکتی تھی دیتی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دکھتے بدن کے ساتھ تہجد کی نماز میں وہ اس کے لیے بیٹی کی دعائیں کرتی کہ اللہ اسے بیٹی دے اور اس کا نصیب نیہا جیسا کرے۔

پھر بددعائیں چھوڑ کر اس نے عثمان سے انتقام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ سوتے جاگتے وہ اکثر اپنے ہاتھ عثمان کے خون سے رنگے ہوئے دیکھتی۔ کبھی وہ اسے جلا کر مار دیتی اور کبھی کوئی چھری خنجر اس کے سینے میں اتار دیتی۔ قدرت نے اسے بیٹے سے نوازا تو اس نے سوچا شاید ریان کا رویہ اب کچھ بہتر ہو جائے لیکن ریان نے تو اس نے جانوروں سے بھی بدتر سلوک شروع کر دیا تھا۔ نہ وہ کھانے کے لیے کچھ لا کر دیتا تھا نہ اسے پہننے اوڑھنے سے کوئی سروکار تھا۔

گزرے سالوں میں اس نے گھر والوں سے سارے رابطے بھی ختم کر دیے تھے۔ کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ نیہا اور ریان رہتے کس جگہ ہیں۔ اسی دور میں ریان نے نشہ شروع کر دیا تھا۔ نیہا قمر کے لیے کچھ مانگتی تو جواباً اسے گندی گالیاں اور ڈھیروں پڑتی۔

اب نیہا چپ نہیں رہتی تھی وہ آگے سے بو تھی۔ بندہ کہہ سن کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے لیکن ریا نے تو اسے بالکل لاوارث کر دیا تھا۔ اسے گھر والو پر بھی غصہ تھا جو اسے بالکل فراموش کر گئے تھے۔

سلائی کڑھائی کا کام جانتی تھی اس لیے ا نے ساتھ والے ایک دو گھروں سے کہہ دیا تھا۔ سمجھتی تھی کہ سب انجان ہیں لیکن محلے والوں کو اس کے حالات کا اندازہ تھا اس لیے ترس کھا لوگوں نے اسے کام دینا شروع کر دیا تھا۔ سلائی کام سے کم از کم قمر کے اخراجات پورے ہونے تھے۔ ریان کو نشے نے آدھا کر چھوڑا تھا۔ اب اس کی پرواہ بھی نہیں کرتی تھی۔

پھر ایک دن اسے اندرون شہر سستی اشیاء لیے بازار جانا پڑا۔ وہاں اس کی ملاقات ریان بہن سامعہ سے ہو گئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سسرالی رشتے دار کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ نند میں کزن اور سہیلی پہلے تھی۔ اس کے گلے لگ کرو دیر گم صم کھڑی رہی۔ اسی کی زبانی اسے پتا چلا کہ کے لاہور آنے کے دو دن بعد ہی دادا جان خالق سے جا ملے تھے۔ یہ تکلیف تھی لیکن بڑی تکلیف کہ ریان نے جانتے بوجھتے اسے لاعلم رکھا۔

''شروع شروع میں ریان بھائی نے رابطہ اور سب ٹھیک ہے کی رپورٹ سناتے رہے لیکن سب جانتے تھے کہ کہیں کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے کسی کو گھر کا پتا بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہ رہے ہیں اور آج تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا غلط کیا تھا۔''

''مجھے ریان سے کوئی گلہ نہیں۔ تم بھی دا مت کرو۔'' اسے واقعی ریان سے کوئی گلہ نہیں تھا

''یہ تمہارا بڑا پن ہے نیہا۔ ہو سکے تو سہ معاف کر دینا۔ کسی نے ایسا نہیں چاہا تھا۔''

''اس ایک شخص کے علاوہ۔'' دل ہی دل

اس نے ٹکڑا جوڑا۔ عثمان سے نفرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

سامعہ اسے اپنا نمبر دے گئی تھی۔

''کبھی ضرورت پڑے تو فون کر لینا۔ چاچی کی طبیعت بہت خراب رہتی ہے۔ اگر ہو سکے تو ایک چکر لگا لینا۔''

اس نے ہامی بھر لی۔ جانتی تھی ایسا کبھی ہو گا نہیں۔ نہ وہ جا سکے گی نہ کوئی اس کے پاس آ سکے گا۔ اس کے باوجود جب اس نے فون نمبر لیا تو سامعہ سے رابطہ کر لیا۔ امی سے اس نے کسی بات کا ذکر کیا تھا نہ گلہ۔ پھر بھی وہ اس سے معافی مانگتی رہیں اور اسے واپس بلاتی رہیں۔

''یہ میری قسمت ہے امی! مجھے جینے دیں۔ کہیں بھی رہوں، اپنی قسمت سے کیسے فرار ہو سکتی ہوں؟''

اس نے تلخی سے جواب دیا تھا اور اس سے کچھ روز بعد ہی سامعہ نے اسے امی کی وفات کی خبر دے دی۔ یہ وہ ریان سے لڑ کر ماں کا آخری بار چہرہ دیکھنے گئی تھی اور وہاں اسے عثمان نظر آ گیا۔ یعنی اسے دربدر کر کے وہ ابھی بھی وہیں تھا۔ ماں کو آخری آرام گاہ کے لیے رخصت کر کے وہ وہاں سے نکل آئی تھی۔ اسے سامعہ سے بھی گلہ تھا کہ وہ اسے سب کے بارے میں بتاتی رہی لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کے گھر والوں نے عثمان کو قبول کر لیا ہے۔ ایک بار پھر اس نے سب سے ناتا توڑ لیا تھا۔

''مل آئی ہو اپنے عاشق سابق و عاشق صادق سے؟ بتایا ہو گا اسے کہ میں تم پر اتنے ظلم کرتا ہوں۔ اس نے دلاسا بھی دیا ہو گا۔ ہے نا؟''

جب وہ واپس آئی تو ریان نے اسے قمر کے سامنے نہ صرف مارا بلکہ غلیظ گالیاں دیں، رکیک الزام لگائے۔ اب کی بار وہ چپ نہیں رہی تھی اس نے برابر کے جواب دیے اور چیزیں اٹھا اٹھا کر ریان کی طرف اچھالی تھیں۔ چار سالہ قمر خوف زدہ ہو کر یہ سب دیکھ رہا تھا۔

''تم گھٹیا انسان اس قابل ہی نہیں تھے کہ میں تمہیں عزت دیتی۔ اپنے بیٹے کا خیال تھا لیکن اگر وہ ماں کو پٹتے دیکھ سکتا ہے تو باپ کو ذلیل ہوتے کیوں نہیں۔ آئندہ سوچ سمجھ کر مجھ پہ ہاتھ اٹھانا۔''

قمر کے پاس جا کر اس نے اسے سینے سے لگایا۔ ریان کچھ دیر خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ میں پکڑا جوتا زمین پر گرا کر پہنا، نیہا کے ہاتھ سے قمر کو جھپٹ کر پکڑا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس آئے تو قمر کے پاس چاکلیٹس اور جوس وغیرہ تھے۔ اس کے بعد وہ اکثر ہی قمر کو باہر لے جاتا اور کھانے پینے کی چیزیں دلواتا۔

نیہا نے شادی کے بعد پہلی بار سکون کا سانس لیا تھا کہ کم از کم اس شخص کو اپنے بیٹے کی تو فکر ہوئی۔ اس بار وہ پھر امید سے تھی۔ قمر زیادہ تر ریان کے ساتھ ہوتا تھا اس لیے وہ آرام سے کام وام نمٹا کر سلائی کر لیتی۔ قمر کو اسکول داخل کروانا تھا اور پھر نئے آنے والے بچے کے بھی اخراجات بڑھنے تھے۔ وہ پوری تندہی سے کام میں مصروف تھی۔ نیہا محسوس کر رہی تھی کہ قمر اس سے کھنچا کھنچا رہتا ہے لیکن اس نے توجہ نہیں کی لیکن کب تک بے پرواہ رہا جا سکتا تھا۔ نیہا آوازیں دیتی رہتی لیکن قمر سنی ان سنی کر کے گلی میں کھیلنے نکل جاتا یا کارٹون دیکھتا رہتا۔ ایک دن نیہا نے اسے پکڑ کر سختی سے ڈانٹا۔

''مجھے ابو سمجھنے کی غلطی نہ کر لینا گھٹیا عورت۔''

الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ تھا جو قمر نے اس کی سماعتوں میں انڈیلا تھا۔ وہ ریان کی زبان بول رہا تھا۔ نیہا کو اب سمجھ میں آئی تھی ریان کے التفات کی وجہ۔

''میں آپ کی مما ہوں قمر۔ ایسے بات کرتے ہیں مما سے؟''

''تو جیسے تم ابو سے بات کرتی ہو ویسے بات کرتے ہیں شوہر سے؟ دوسرے آدمیوں کے لیے تم ابو سے ایسے بات کرتی ہو تو انہیں برا نہیں لگتا ہو گا؟''

نیہا کا ہاتھ جھٹک کر وہ باہر گلی میں نکل گیا۔ نیہا

بے یقین بیٹھی رہ گئی۔ یہ ایک بچے کے الفاظ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کا دل چاہا وہ تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لے۔ زندگی نے جیسے جینے کی ہر وجہ چھین لینے کی قسم کھالی تھی۔ اسے ایسا لگنے لگا تھا لیکن ماہ پارہ کو جنم دے کر اسے لگا قدرت نے اسے ایک اور زندگی ہو۔ ماہ پارہ واقعی چاند کا ٹکڑا تھی۔ نیہا اسے دیکھ کر اپنے سارے دکھ بھول گئی تھی۔

اب کبھی کبھی اس کا دل دکھتا تو وہ ماہ پارہ سے ڈھیروں باتیں کیا کرتی۔ وہ ساری باتیں جسے سننے کے لیے اسے بھی کوئی سامع میسر نہیں آیا تھا۔ یہ عادت اتنی گہری ہوگئی تھی کہ ہر کہنے نہ کہنے والی بات بے دھڑک اس سے کہہ لیتی تھی۔ ریان اب بھی ویسا ہی تھا۔ عثمان اور اس کے طعنے اسے صرف اس وقت یاد آتے تھے جب نیہا اسے نشے کے لیے پیسے نہیں دیتی تھی۔ اس سب کے باوجود اب بھی اسے عثمان سے بدلے کا خیال آتا تھا۔ اور پھر گزرے سالوں میں پکتے لاوے کو اخراج کی صورت نظر آگئی۔ ماہ پارہ کے ہاتھوں بے بس کر کے وہ شاہ میر کے ذریعے سے عثمان کو اپنے قدموں پر جھکا سکتی تھی۔ یہاں سے ماہ پارہ کی زندگی کا وہ سفر شروع ہوا جس نے ماہ پارہ کو ماہی این بنا دیا تھا۔ نیہا کو لگتا تھا جنت نور نے خوب صورتی اور اداؤں سے عثمان کو اپنی راہ پر لگایا ہوگا۔ وہ اسے دیکھ لیتی تو اپنی سوچ کو رد کر لیتی۔ اسی لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ماہ پارہ کو چاند ہی بنا رہنے دے گی۔ وہ چاند جس سے کوئی صرف نظر نہیں کر سکتا۔

اس نے ماہی کو کبھی چولہے کے آگے کھڑا نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کی رنگت نہ خراب ہو جائے۔ نیہا نے میٹرک کے بعد اسے اسکول سے اٹھا لیا تھا۔ محض پندرہ سال کی عمر میں ماہی کو سلائی کر کر کے جمع کیے پیسوں سے شہر کے ٹاپ کلاس پارلر سے پروفیشنل میک اپ کا کورس کروایا۔ ماہ پارہ نے وہاں لڑکیوں کو فون، ٹیب سے مدد لیتے دیکھا تھا۔ وہ کسی بھی اداکارہ کا میک اپ دیکھ کر خود کرتی تھیں۔ ماہی کو یہ بہت پسند آیا تھا۔ اس کے کہنے پر نیہا نے اسے کمپیوٹر لے دیا تھا اور انٹرنیٹ کی سہولت بھی مہیا کر دی تھی۔ ماہی دن رات کا فرق بھلائے نت نئے تجربات کرتی رہتی۔

اپنی ماں کی ہدایات پر مکمل طور پر اس شعبے میں ڈوب کر رہ گئی تھی۔ بنیاد سے لے کر اعلا ترین مر... تک اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا کہ اس کی صلاحیتوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ اس نے اس شوق کی خاطر دن رات ایک کر دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک کورس سے اسے ٹاپ میک اپ آرٹسٹس کی فہرست میں سب سے اوپر مقام بخشا تھا۔ پارلر کھولنے کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے خواب کچھ اور پر کے تھے۔ جس پارلر سے اس نے کام سیکھا تھا، وہاں پر اداکارائیں تیار ہونے آتی تھیں۔

اس کی مہارت دیکھ کر ایک ٹاپ ماڈل اداکارہ نے اسے ذاتی معاون کی نوکری کی پیشکش کی تھی جسے اس نے نیہا سے مشورے کے بعد قبول کر لیا۔ یہاں کام کر کے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ پارلر میں مخصوص برانڈ کا میک اپ استعمال ہوتا تھا جب کہ اس اداکارہ کے لیے اسے مختلف برانڈ کی مختلف چیزیں استعمال کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہیں اس نے ایک اور چیز سیکھی تھی جو کہ اس کی عمر کے حساب سے بہت بڑی چیز تھی۔

فلم کے سیٹ پر اکثر کئی عمر رسیدہ ہیروئنیں آتی تھیں۔ کام کے لیے بھی ہدایت کار کے تر... کرتی ہوئیں اور کبھی پروڈیوسر کی منتیں کرتی ہوئی۔ ماہی نے یہاں سیکھا کہ جوانی دیرپا نہیں، محض چند سالوں کی چکاچوند ہے۔ یہ جتنی روشن اور پرکشش ہوتی ہے، اس کے بعد اتنے ہی اندھیرے اور مہیب سناٹے حصے میں آتے ہیں۔ اسی لیے اسے جب اسے ایک معروف کمپنی نے ماڈلنگ کی پیشکش کی اس نے بلا تامل انکار کر دیا۔ اس کے ذہن میں وا... تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے پیسے اکٹھے کرنے ہیں کہ وہ اپنا میک اپ برانڈ مارکیٹ میں لا سکے۔ وہ کاروبار تھا جس کے ذریعے وہ بعد میں بیٹھ کر بھی

سکتی تھی۔

اس دوران نشے کی زیادتی کی وجہ سے ریان زندگی ہار گیا اور جاتے جاتے قمر کو اپنی جگہ چھوڑ گیا تھا۔

''میرے مرنے کے بعد بھی نیہا بیگم! تم مجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکو گی۔'' مرنے سے کچھ دن پہلے اس نے نیہا سے کہا تھا۔ تب وہ نہیں جانتی تھی اس بات کا کیا مطلب ہے لیکن اس کے مرنے کے کچھ دن بعد ہی قمر کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ ماہی اور نیہا پر گندے الزامات لگاتا اور مار پیٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر ہر بار نیہا سے پٹ جاتا۔ اب وہ مارتا تو نہیں تھا لیکن زبان پر بھی قابو نہیں رکھتا تھا۔

ریان کے مرنے کے بعد نیہا نے سامعہ سے رابطہ کیا۔ یہ رابطہ نہیں وہ دروازہ تھا جسے وقت آنے پر وا کر کے نیہا ایک بار پھر ان سب کی زندگی میں شامل ہو سکتی تھی اور عثمان کی زندگی عذاب بنا سکتی تھی۔

اس دوران ماہی نے پوری سنجیدگی سے اپنے کام کو وقت دیا تھا۔ اس اداکارہ کے ساتھ ایک دو فلموں کے بعد اس کے پاس اتنے پیسے ہو گئے تھے کہ وہ اپنے گھر کے ایک کمرے کو میک اپ اسٹوڈیو بنا سکے۔ مہنگا ترین میک اپ اور اس کی بے مثال صلاحیتوں نے مل کر سوشل میڈیا پر دھوم مچا دی تھی۔ مختلف برانڈز نے اس سے اپنے میک اپ کی تشہیر کے لیے رابطہ کیا تھا۔ اس سے بھی اس کی اچھی خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔ پھر جب یوٹیوب سے اس کی آمدن شروع ہو گئی تو اس نے نیہا کو سلائی کا کام کرنے سے منع کر دیا۔ یہ اور بات کے نیہا نے اس کی کبھی سنی ہی نہیں۔ وہ پہلے کی طرح سلائی کے پیسوں سے گھر چلاتی اور ماہی کے پیسے بینک میں ڈالتی۔ وہ جانتی تھی ماہی نے جو خواب دیکھا ہے اس کے لیے انہیں کھلا پیسہ چاہیے۔ عثمان سے دشمنی میں اس نے ماہی کو ایک عام لڑکی نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ جیتی جاگتی گڑیا بن گئی تھی۔ نزاکت و نفاست اس کے وجود کا حصہ بن گئی تھی۔ اب وہ وقت آ گیا تھا جب وہ شاہ میر کے سامنے ماہ پارہ کو کھڑا دیتی تو وہ نظر نہ پھیر سکتا تھا۔ سامعہ کے ساتھ تعلق کی تجدید کر لی تھی اور اب جب سامعہ نے اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی کی تو وہ خاص طور پر ماہی کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ یہاں آ کر سب کچھ منصوبے کے مطابق چل رہا تھا اور اب..... اب یہ کہہ رہے تھے کہ شاہ میر عثمان کا بیٹا نہیں۔ وہ کیسے حواسوں میں رہ سکتی تھی؟

☆☆☆

''ماہی! تم تھوڑی دیر کے لیے گھر جا کر سو لو۔ ہم یہاں ہیں۔'' بچی ہسپتال کی لابی میں اسے سینے سے لگائے پھپھو اسے گھر جانے کے لیے راضی کر رہی تھیں اور وہ تھی کہ مان ہی نہیں رہی تھی۔

''پھپھو! چلی جاؤں گی بس ایک بار مما سے مل لوں، انہیں دیکھ لوں۔'' مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں متورم اور آواز بیٹھ گئی تھی۔

''السلام علیکم بھائی۔''

سامعہ پھپھو کے کہنے پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تایا نوید آئے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا ہے نیہا کو؟ ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے؟'' اس کے سر پر پیار دیتے وہ ان کے پاس کھڑے ہو کر پوچھنے لگے۔

''کچھ نہیں، بس اتنے وقت بعد اپنوں سے ملی ہے تو شاید دوبارہ دور جانے کے خیال سے پریشان ہو گئی تھی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' جواب ولید تایا نے دیا تھا۔

ماہی خاموش بیٹھی رہی۔ وہ تردید کر بھی نہیں سکتی تھی۔ کیا بتاتی کہ سالوں کی منصوبہ بندی اکارت چلے جانے کا صدمہ لے لیا ہے۔

''بچی کو کسی کے ساتھ گھر بھجوا دو، اس کی حالت دیکھو، کیسے بے حال ہوئی ہے۔''

''خود میں بھی ابھی یہی کہہ رہی تھی لیکن مان نہیں رہی ہے۔''

''پھپھو! میں مما سے مل کر چلی جاؤں گی۔ اگر پریشانی کی بات نہیں ہے تو پھر ملنے کیوں نہیں دے

رہے صبح سے؟''

اس کی بات پر خاموشی چھا گئی تھی۔ واقعی وہ صبح سے یہاں تھے اور نیہا سے کوئی بھی نہیں ملا تھا۔ ان کے بات کرتے کرتے ایک نرس آ گئی تھی۔ ماہی بے چینی سے کھڑی ہو گئی تھی۔ سامعہ پھپھو بھی اس کے پہلو میں کھڑی تھیں۔

''آپ مریض سے مل سکتے ہیں لیکن کوشش کریں، کوئی پریشانی والی بات نہ ہو اور ایک وقت میں ایک ہی شخص مل سکتا ہے۔''

''پلیز، آپ مجھے ان سے ملوا دیں۔'' ماہی اس کی طرف بڑھی۔ نرس نے سوالیہ نظروں سے اس کے پیچھے کھڑے بڑوں کی طرف دیکھا۔ اثبات میں اشارہ ملنے پر وہ واپس مڑ گئی۔

''میرے ساتھ آئیں۔''

نیہا بستر پر دراز تھی۔ ڈرپ ختم ہونے پر تھی۔ سفید چادر سینے تک تانے وہ جاگ رہی تھی۔

''مما۔'' پاس جا کر اس نے آہستہ سے آواز دی۔

''ہوں۔''

''آپ نے بہت پریشان کر دیا تھا مجھے۔ ایسے کرتے ہیں بھلا؟ میں ہوں نا آپ کے ساتھ پھر کس شے کی پریشانی ہے۔'' اس کا ہاتھ تھامے وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

''ماہی تم تو ایسا مت کہو۔'' وہ بولیں تو ان کی آواز میں گویا صدیوں کی تھکن در آئی تھی۔

''مما! آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ ہم کوئی حل نکال لیتے۔ نہ بھی نکلتا تو مجھے بتاتیں آپ کو اپنا انتقام مجھ سے زیادہ عزیز ہے جو مجھے اتنی تکلیف دی ہے؟''

''میں بہت تکلیف میں ہوں ماہی!'' وہ نہ بھی کہتیں تو ماہی جانتی تھی۔ ''میں نے سالوں اس وقت کا انتظار کیا تھا پھر پتا نہیں کیا ہو گیا۔ میرا سارا سفر رائیگاں گیا۔''

''ہم کسی تکلیف دہ بات کو زیر بحث نہیں لائیں گے اور کچھ رائیگاں نہیں گیا۔ آپ کی ہمت نے مجھے آسمان پر چمکنے والا ستارہ بنا دیا ہے۔ اب آپ جلدی سے ٹھیک ہوں پھر واپس چلتے ہیں اور جا کر سوچیں گے، کیا کرنا ہے۔'' اس کا ہاتھ چوم کر اس نے ہونٹوں سے لگایا اور باہر نکل آئی۔ اسے واقعی کچھ سوچنا تھا۔ کچھ ایسا جو اس کی پیاری مما کی تکلیف کم کر سکتا۔

☆☆☆

نیہا بستر پر دراز تھی اور اس کے پاس تایا چچا کے بیٹے بیٹیاں جمع تھے۔ آگے سے ان کی اولادیں بھی آ جا رہی تھیں۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہو رہی تھی۔ ابھی تو شادی ختم ہوئی تھی اور اب ایک بار پھر سب جمع ہو گئے تھے۔

''ویسے نیہا! تم اب یہیں شفٹ ہو جاؤ۔ بہت رہ لیا اکیلا۔ یہاں ہم سب ہیں، تمہیں بہت آسانی ہو گی۔'' سامعہ پھپھو بہت محبت سے اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی کہہ رہی تھیں۔

ماہی کی نگاہ اٹھی اور پھر پلٹنا بھول گئی۔ شاہ میر دروازے کے باہر کھڑا تھا اور جیسے اسی کے متوجہ ہونے کا منتظر تھا۔ اسے اوپر آنے کا اشارہ کر کے وہ فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ ماہی کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ سب ہی اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ وہ کچھ لمحے تو چرا ہی سکتی تھی۔ ویسے بھی وہ عثمان چاچو کا بیٹا نہیں تھا تو ہو سکتا ہے، قسمت اسے ماہ پارہ کے نام لکھ دے۔ دل میں سر اٹھاتی خوش فہمیوں کو سنبھالتی ہولے ہولے قدم رکھتی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ یہ اس کا وہم تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ کمرے سے نکلتی ازکی اور باہر سے آتے فرحان نے اسے شاہ میر کے پیچھے اوپر جاتے دیکھا تھا۔ ازکی کھولتے دماغ کے ساتھ اس کے پیچھے سیڑھی کی طرف لپکی لیکن فرحان نے بھاگ کر اسے روک لیا۔

''کیا کرنے لگی ہو؟''

''تم نے دیکھا وہ چڑیل! وہ..... میں اسے مار

دوں گی۔'' غصے کی زیادتی سے وہ بات بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

''اسے مار کر کیا ہوگا؟ شاہ میر مل جائے گا تمہیں؟'' سینے پر ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا وہ پوچھ رہا تھا۔ شاہ میر اور ازکی بچپن سے ہی ایک دوسرے سے منسوب تھے اور سب ہی جانتے تھے۔ ماہ پارہ ان کے درمیان نئی تھی، اس لیے وہ اس بات سے آگاہ نہیں تھی۔

ازکی رو دینے کو ہو گئی تھی۔ ''تو پھر کیا کروں؟ اسے شاہ میر کو خود سے دور لے جاتے دیکھتی رہوں؟ میں مر جاؤں گی فرحان! نہیں میں اسے ہی مار دوں گی جو فساد کی جڑ ہے۔ اچھی خاصی زندگی تھی جسے جہنم بنانے آ گئی ہے۔''

''تم چپ کر کے گھر جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔ میرا وعدہ ہے، شاہ میر تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔ اعتبار کرو میرا۔''

وہ اس کی طرف جھکا دھیرے دھیرے بول رہا تھا اور جانے کیوں ازکی کے اندر سکون اترتا جا رہا تھا۔ وہ بنا کچھ کہے سیڑھیاں اترتی اپنے گھر چلی گئی۔ فرحان اوپر جانا چاہتا تھا لیکن فون پر آتی کال دیکھ کر ارادہ ملتوی کر کے فون کان سے لگائے اتر کر نیچے چلا گیا۔ اسے پنڈی سے ذرا آگے جانا تھا۔ نعمان اس کا دوست تھا اور اسے اس کی گاڑی لے کر اس کے گھر پہنچانی تھی۔ کسی وجہ سے وہ فوری طور پر خود گھر نہیں آ سکتا تھا اور گاڑی بھی ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ اسی لیے اسے بلایا تھا۔ اس کے ساتھ رات کا کھانا کھا کر، اس کی گاڑی لے کر جب وہ گھر کے لیے نکلا تب تک کافی وقت ہو چکا تھا۔ جلدی میں وہ امی سے مل کر یا کسی کو بتا کر بھی نہیں آیا تھا اور اب فون کی بیٹری بھی اختتام پر تھی۔ فون کسی بھی وقت بند ہونے والا تھا۔

گیارہ بج رہے تھے جب اس کے فون کی اسکرین پر جنید کا نمبر چمکا۔ ونڈ اسکرین سے پار دیکھتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا۔

جنید نے جو بتایا، وہ سن کر اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ ماہی مل نہیں رہی تھی۔ اس سے آگے کچھ سننے کے قابل وہ ویسے بھی نہیں رہا تھا لیکن فون ہی آف ہو گیا تھا جسے آن کیے بغیر اس نے گاڑی گھر کی طرف بھگا دی تھی۔

☆☆☆

''آپ مجھ سے ملے بغیر ایسے کیسے جا رہی تھیں، مجھے آپ سے کام تھا ایک۔'' شاہ میر اس کے پہلو میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ چھت پر ابھی بھی برقی قمقمے جل رہے تھے۔ وہ دونوں روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جو اس قدر سرد تھی کہ ہڈیوں میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا کام؟'' ماہی نے شور کرتے دل کو قابو کرتے بظاہر نارمل لہجے میں کہا۔

''آپ کو اپنا کمرا دکھاؤں؟'' اس سے نظریں چراتے ہوئے اس نے بات پلٹی۔ ماہی کو لگا وہ بھی خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''ہاں ضرور۔'' آدھی آستین سے ٹھنڈے پڑتے بازوؤں کو سینے پر لپیٹے وہ خود کو گرمائش پہنچانے کی کوشش کرنے لگی۔

''یہاں سے نظر نہیں آئے گا۔ آپ یہاں آئیں۔'' کہہ کر وہ دیوار میں بنے ایک چھوٹے سے دروازے کی سمت بڑھا تو اس کی تقلید میں ماہی بھی اس کے پیچھے آ گئی۔ پانچوں بہن بھائیوں کے گھر چھتوں سے اسی طرح جڑے ہوئے تھے۔ ہر چھت دوسری چھت سے ایک دروازے کے ساتھ منسلک تھی۔ ماہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ پہلی چھت، پھر دوسری، اس کے بعد اگلی چھت اور پھر اس سے بھی اگلی چھت۔ یہاں اندھیرا تھا۔

''وہ رہا میرا کمرہ۔ آجائیں پلیز۔'' اس نے اگلی چھت پر اشارہ کیا تھا۔

''نہیں۔ میں واپس چلتی ہوں۔ مما کو پتا نہیں، میں یہاں ہوں۔'' پتا نہیں کیوں اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اندھیرا اور اس کے ساتھ تنہائی مل کر ماہی کے

حواس مختل کرنے لگے تھے۔
''بس ایک منٹ لگے گا۔ آجائیں ناں۔''
''نہیں پلیز۔ پھر کبھی۔'' ماہی نے قدم واپس موڑ لیے۔
''ماہی!'' اس کی پشت پر بہت قریب سے آواز ابھری۔ ماہی نے مڑ کر دیکھا اور شاہ میر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کلوروفام میں بھیگا رومال اس کے ناک پر رکھ دیا۔ ایک لمحہ لگا تھا اور ماہی لکڑی کے شہتیر کی طرح اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ بڑی احتیاط سے نظر بچا کر وہ اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔
ماہی کی آنکھ کھلی تو پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کس جگہ ہے۔ سردی سے جسم اکڑا ہوا تھا۔ جب حواس بحال ہوئے تو فوراً گھڑی پر نظر گئی، رات کے گیارہ سے اوپر کا وقت تھا۔ اسے رفتہ رفتہ یاد آیا۔ وہ شاہ میر کا کمرہ دیکھنے اس کے ساتھ گئی تھی اور پھر شاہ میر نے اسے بے ہوش کر دیا تھا اور اب وہ یہاں تھی۔ مما پریشان ہوگئی ہوں گی۔ وہ اٹھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت سے بندھے تھے اور منہ پر ٹیپ لگی تھی۔ اپنی بے بسی پر اسے جی بھر کر رونا آیا تھا تو اپنی بے وقوفی پر غصہ بھی بے انتہا شدید تھا۔ کتنی دیر وہ اٹھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ان دیکھے کا خوف کہ جانے اب کیا ہوگا۔ یہاں تو کوئی اسے جان سے بھی مار دیتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔
''شاہ میر اسے مار نہیں سکتا۔'' اس نے سوچا۔ وہ اس کی کزن ہے۔ اندر کہیں اسے خود اس بات کا یقین نہیں تھا۔ وہ اپنی کزن کو بے ہوش کر کے منہ پر ٹیپ لگا کر، باندھ کر کمرے میں ڈال سکتا ہے تو وہ کیا نہیں کر سکتا؟ جواب سوچنے کی اس نے زحمت نہیں کی تھی۔ بے سود پڑے کچھ دیر گزری تھی کہ دروازے کے پار سرسراہٹیں سنائی دیں۔ اس کے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ بنا آواز کیے دروازہ کھول کر شاہ میر اندر داخل ہوا۔ نیم اندھیرے میں بھی اس کا ہیولی پہچان سکتی تھی۔ اندر آکر اس نے ویسے ہی احتیاط سے دروازہ بند کیا۔
''آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر برا حال ہوگیا ہے میرا۔ اب بھی طبیعت خرابی کا کہہ کر آیا ہوں۔''
اس کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آگرا تھا۔ سب اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ کاش کوئی یہاں بھی آجائے۔ اس نے دعا کی۔ آنکھوں میں خوف لیے وہ اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا ماہی کو ہوش آگیا ہے۔ کمرہ روشن کر کے وہ اس کے سامنے آبیٹھا۔ گھڑی کی سوئیاں سوا بارہ پر تھیں۔
''آپ ڈریں نہیں۔ میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس آپ میری تھوڑی سی مدد کر دیں، اس کے بعد میں آپ کو چھوڑ دوں گا، وعدہ۔'' اس پر جھکا وہ کہہ رہا تھا۔ نرمی سے اس نے ماہی کے چہرے پر انگوٹھا پھیرا۔ ماہی نے کراہیت سے منہ پھیر لیا۔ وہ برا مانے بغیر اٹھ گیا۔
''میں ایک ناکام آرٹسٹ ہوں۔ ناکام اس لیے کہ کوئی میرے فن کو پہچانتا نہیں۔'' الماری میں منہ دیے وہ اس سے بات کر رہا تھا۔ ''آپ نے دیکھا تھا نا، میں نے آپ کا جو خاکہ بنایا تھا۔ میں اب آپ کو اور کچھ خاکے دکھاتا ہوں۔'' ایک فائل لے وہ اس کے پاس آیا۔
''یہ دیکھیں اور میرے فن کی داد دیں۔'' کا بستر پر پھیلائے اس نے ایک کاغذ ماہی کے آگے اور ماہی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ اس برہنہ خاکہ تھا۔ وہ خاکہ خیال پر مبنی تھا اس کے باو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں جائے۔
''دیکھا، آپ نظریں نہیں ہٹا پا رہیں نا؟ و بالکل اصلی لگتا ہے نا؟ یہ دیکھیں ایک اور.....''
ذلت کی شدت سے ماہی نے آنکھیں لیں۔
''آپ کو شرمانا نہیں چاہیے۔ یہ اصلی ہیں، آپ جانتی ہیں۔ میں بھی جانتا ہوں اس

میرے اندر کے فنکار کی تسلی نہیں ہوتی۔ میں بس کچھ اصلی خاکے بنانا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے آپ کی کچھ تصویریں چاہئیں۔''

کاغذ اور فائل اس کے ایک جانب رکھ کر وہ اٹھا اور الماری سے ایک ڈبہ نکال کر بیڈ پر رکھا۔ اس کے بعد کمرے کی بتی بجھا کر سپاٹ لائٹ جلا کر اس کا رخ ماہی کی طرف کر دیا۔ تیاری بتا رہی تھی کہ یہ سب یہاں پہلی بار نہیں ہو رہا یا خاص طور پر اس کے لیے انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ ماہی دعا کر رہی تھی کہ اسے موت آ جائے لیکن ایسا کچھ نہ ہو جو اس کی باقی کی زندگی کے آگے سوالیہ نشان لگا دے۔

''آپ گھبرائیں نا پلیز۔ یہ تصویریں میرے پاس محفوظ رہیں گی۔ اگر کبھی لیک ہو بھی گئیں تو میں ہوں ناں، میں آپ کا سہارا بنوں گا، آپ سے شادی بھی کرلوں گا اور کبھی کسی بات کا طعنہ نہیں دوں گا۔''

بات کرتا وہ بالکل بے حس لگ رہا تھا۔ اسٹینڈ پر کیمرہ لگا کر وہ اس کے پاس بستر پر آ گیا۔ ماہی اندر ہی اندر مرنے لگی تھی۔ وہ پوری شدت سے کسی معجزے کی منتظر تھی۔ شاہ میر پاس بیٹھا تھا، وہ بے چینی سے نفی میں سر ہلاتی پیچھے سرک رہی تھی۔

''آپ تعاون نہیں کر رہیں۔'' اسے پچکارتے ہوئے اس نے ماہی کو کھینچ کر اپنے سامنے کیا جبکہ ماہی ایک بار پھر اس سے دور ہوئی۔

''آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ آپ کے لیے مسئلہ ہو جائے گا اگر میں نے یہ کپڑے پھاڑ دیے۔ آپ نے واپس جانا ہے نا؟ کیا پہنیں گی؟''

اس کے قریب آتے وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ پیچھے جانے کی جگہ نہیں تھی۔ ماہی نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند کرلیں۔ ان بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شاہ میر قریب ہوا تو اس نے پہلو بدل لیا اور بستر سے نیچے گر گئی۔

''پاگل لڑکی! آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا؟ ٹھیک ہے میں کپڑے کاٹ دیتا ہوں اس کے بعد آپ جانیں، آپ نے کیسے واپس جانا ہے۔''

اٹھ کر اس نے قینچی نکالی اور ماہی کو بستر پر پٹخ کر اس کے کپڑے کاٹنے شروع کیے۔ ماہی کو لگا تھا نیل و فرات اس کی آنکھوں کے رستے سے بہنے لگے ہیں جو آنسو رک ہی نہیں رہے مگر وہ بے نیازی سے اپنے کام میں مشغول رہا۔

ایک کلک کے ساتھ کمرے کا تالا کھلا اور اس سے پہلے کہ شاہ میر کی کچھ سمجھ میں آتا یا وہ کچھ سوچتا تایا ابو اندر داخل ہوئے۔ اندر کے ماحول پر ایک نظر ڈال کر انہوں نے منہ پھیر لیا تھا۔ ان کے پیچھے فرحان بھی تھا۔ شاہ میر بدحواس ہو کر اٹھ کر بھاگا مگر تایا ابو نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

اس منظر نے فرحان کی آنکھوں میں مرچیں بھر دی تھیں۔ جنید سے بات ہونے کے بعد وہ گاڑی بھگاتا ہوا لایا تھا۔ وہ جانتا تھا ماہی ان گھروں کے علاوہ دوسری کسی جگہ نہیں، سو اس نے تایا نوید سے مدد طلب کی تھی۔ ان کے گھر سے اس نے سب کی چھتوں پر بنے اسٹور نما کمرے دیکھے تھے اور پھر ماہی کو کہیں نہ پا کر ساری مصلحت بالائے طاق رکھ کر شاہ میر کا نام لے دیا تھا۔ وہ ششدر رہ گئے تھے۔

''وہ ہمارے ساتھ ڈھونڈ رہا تھا ماہی کو اور ابھی کچھ دیر پہلے اپنے کمرے میں سونے گیا ہے۔ اس کی طبیعت۔''

''تایا ابو پلیز، دیر نہ کریں۔ میں آپ کو سب سمجھا دوں گا۔ بس ایک بار اس کا کمرہ دیکھ لیں۔ میرا شک کسی لڑکی کی جان یا عزت گنوا دینے سے بڑا جرم نہیں ہو گا اگر بے بنیاد نکلا۔'' اس کا اضطراب تھا، اصرار تھا یا وقت کا تقاضا تھا کہ انہوں نے خود کو چابیوں میں سے شاہ میر کے کمرے کی چابی نکالتا پایا۔

''میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ کہیں میں اپنا صبر کھو کر تمہیں جان سے نہ مار دوں۔'' بوڑھی آواز کانپ رہی تھی۔ شاہ میر کمرے سے فوراً باہر بھاگ گیا۔ ماہی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کے بے آواز آنسو اب ہچکیوں سے بہہ رہے تھے۔ فرحان

نے اس کے منہ سے ٹیپ اتار دی تھی۔ اس کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دینا میرا بچہ۔'' دونوں ہاتھ جوڑے وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکے تو ماہی بے ساختہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''تایا ابو۔'' ان کے ہاتھ پکڑ کر اس کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے تھے۔

''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ نیہا نے زندگی میں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں، اس نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ ایک عمر گزار کر وہ اپنوں میں واپس آئی ہے اور اب اگر اسے پتا چلا تو۔ اسی کی خاطر پردہ رکھ لینا بیٹا۔'' نظریں نیچی کیے وہ اس کے ساتھ رو رہے تھے۔

''میں کچھ نہیں بتاؤں گی کسی کو۔ تایا ابو آپ روئیں نہیں پلیز۔'' ان کے جھریوں زدہ ہاتھ آنکھوں سے لگاتے وہ انہیں یقین دہانی کروا رہی تھی۔

''تایا ابو! ایسا کرتے ہیں، میں ماہی کو لے جاتا ہوں، کچھ دیر بعد ہم آ جائیں گے اور کہہ دیں گے یہ میرے ساتھ تھی۔''

فرحان نے یکبارگی حل نکالا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت اس کے علاوہ اور کیا ترکیب کی جا سکتی تھی۔ اس کے لیے کپڑوں کا انتظام کر کے فرحان اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

''پریشان مت ہونا، میں سنبھال لوں گا سب۔''

اس کی بات کے جواب میں ماہی خاموش رہی۔ کچھ بھی کہنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے کی قیامت گزر چکی تھی لیکن وہ شرمندگی کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ وہ کیسی حالت میں ملی تھی تایا ابو اور فرحان کو۔

''کچھ تو نارمل ہو جاؤ یار! سب کہیں گے میں تمہیں موت کے کنویں میں لے کر گیا ہوا تھا۔''

فرحان نے ازراہِ مذاق کہا تھا کہ رونے سے آنکھوں کا تو جو حال تھا سو تھا چہرہ بھی درد کی ایک الگ داستاں سنا رہا تھا۔ اس کے کہنے پر ماہی کو بھی خیال آیا۔ وہ اگر ذمہ داری لے رہا تھا تو کم از کم اسے اس کا ساتھ تو دینا چاہیے تھا۔ اگلے کچھ منٹ اس نے خود کو نارمل کرنے میں لگائے۔ بالوں سے پونی نکال کر بال ہاتھ سے سیٹ کر کے دوبارہ پونی ڈال لی۔ اب وہ کچھ بہتر لگ رہی تھی۔

''ایک کپ چائے پیتے ہیں اور اس کے بعد واپس چلتے ہیں۔''

''نہیں۔ کیا ضرورت ہے چائے کی اور اتنی رات کو چائے آئے گی کہاں سے؟'' وہ سٹپٹا گئی تھی۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

اس کے بولنے سے یہ تو ہوا تھا کہ ماحول کا تناؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔ ایک غیر معروف دھن پر سیٹی بجاتے وہ اسے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا۔

''چائے نہیں مل سکتی اس وقت۔ کوئی آئس کریم وغیرہ چاہیے تو حکم کرو۔''

''ٹھیک ہے دو آئس کریم ہی لے آؤ۔'' لڑکے کو کہہ کر وہ اس کی جانب مڑا۔ ''کون سا فلیور؟''

''آئس کریم بس سٹرابیری فلیور میں ہے۔'' کہہ کر جواب سنے بغیر وہ لڑکا واپس چلا گیا تو دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے مسکرا دیے۔ گھر جانے تک وہ کافی حد تک نارمل ہو چکی تھی۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئے، رات کے ڈیڑھ بج رہا تھا۔ حسبِ توقع سب جاگتے ہوئے ملے تھے۔ نیہا رو رو کر مرنے والی ہوئی تھی۔

''میں ماہی کو آئس کریم کھلانے لے گیا تھا۔ نعمان کی گاڑی پاس تھی تو ذرا دور نکل گئے۔ گاڑی خراب ہو گئی اور میرا فون بھی بند ہو گیا، اس لیے نہیں سکا۔''

اس نے شاید پہلی بار ابو سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ سب کے سامنے اس پر برس پڑے۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم۔۔ فرحان اس قدر لاپروا ہو سکتے ہو۔ ہماری جان پر بنی تھی کہ

بچی جانے کہاں کس حال میں ہے۔''

''چلو، اللہ کا شکر ادا کرو، اللہ نے صحیح سلامت بچی لوٹا دی۔ ورنہ آج کل کے جیسے حالات ہیں، بڑے ہول اٹھ رہے تھے۔'' تایا نوید کے کہنے پر ماہی کو سینے سے لگا کر سامعہ اسے کمرے میں چھوڑ گئیں۔ اسے اب مما کو منانا تھا۔

☆☆☆

سفر کی تھکن ہوتی تو ختم ہو جاتی لیکن یہ تھکن تو اس مسافت کی تھی جس کے بارے میں اس کے علاوہ کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ واپس آئے ہوئے ایک ہفتہ ہونے کو تھا لیکن اس کا کسی کام کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا شاید بدلتے موسم کا اثر ہے۔ سرد موسم میں یوں بھی اس پر سستی چھا جاتی تھی۔ منور کتنی بار پیغام بھیج چکا تھا کہ اگلی ویڈیو کے بارے میں کچھ بتا دو مگر اس کا فی الحال کسی کام کا ارادہ نہیں بن رہا تھا۔ اب بھی مما اسے کھانا دے گئی تھیں جو میز پر ڈھکا ہوا پڑا تھا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھانے بیٹھی تو منور آ گیا۔ منور ساتھ والے گھر میں رہتا تھا۔ اس کا کیمرا مین، اس کا ایڈیٹر اور سب سے بڑھ کر وہ اس کا رضاعی بھائی تھا۔ جب وہ دونوں چھوٹے تھے تو منور کی ماں سیڑھیوں سے گر کر ہسپتال جا پہنچی تھی، تب نیہا نے منور کو دودھ پلایا تھا۔ اس بات پر منور کی ماں تو شکر گزار تھی ہی، وہ بھی نیہا سے بے حد محبت کرتا تھا۔ دو بہنیں اپنی بھی تھیں لیکن جو محبت ماہ پارہ سے تھی اس کی کوئی برابری نہیں تھی۔

''فی الحال شادی ہضم کرو، تمہیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' منور نے کھانا اس کے سامنے سے اٹھا لیا۔

''میرا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا اور جب تک دل نہ چاہے تب تک کوئی کام کرنا نہیں چاہیے۔''

''تمہاری اس بات سے مجھے بریٹنڈ رسل کا انٹلیکچوئل ریش یاد آ گیا۔'' وہ ہنسا۔

''یہ کیا بلا ہے؟'' اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر نوالہ توڑتے ماہی نے پوچھا۔

''جن چیزوں کو ہم عظیم فلسفہ سمجھیں جبکہ وہ حقیقت میں کچرا ہوں، جیسے کہ تمہاری بات۔ اسے انٹلیکچوئل ریش کہتے ہیں۔ کام کا مطلب کام ہوتا ہے اور جہاں رزق ملتا ہو وہاں موڈ، دل ول کا چکر نہیں رکھتے بلکہ توجہ سے کام کرتے ہیں۔ اب تم اٹھ کر اپنی صورت سنوارو۔ شام کو ہم ویڈیو بنا رہے ہیں۔''

''آج نہیں پرسوں کا رکھو۔ ابھی بدلتے موسم کی وجہ سے سکن اتنی رف ہو رہی ہے، کچھ اتنے دنوں سے کچھ کیا نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''چلو ٹھیک ہے پرسوں کا ڈن ہو گیا۔'' دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھا کر وہ باہر نکل گیا تو کھانا چھوڑ کر وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے عکس کے پیچھے قمر کی شبیہ نمودار ہوئی۔

''کچھ پیسے دو مجھے۔''

اس نے کچھ کہے بنا پرس پکڑ کر تین سو نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

''بھیک دے رہی ہو؟ اور دو۔ تھوڑے ہیں یہ۔''

وہ کوئی جھگڑا نہیں چاہتی تھی، اس لیے تین سو پکڑ کر پرس میں واپس ڈالا اور ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ قمر کبھی نوٹ کو دیکھتا تو کبھی اسے۔ اتنی آسانی سے تو وہ کبھی پیسے نہیں دیتی تھی۔

''کیا انہوں نے تمہارے سیل نکال لیے ہیں؟'' اس نے مذاق کیا۔ ماہی بولے نہ تو اسے مزہ نہیں آتا تھا۔ اس ایک ہفتے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے ہر شے سے زیادہ ماہی کے چڑنے سے سکون ملتا تھا۔ وہ ہنوز چپ تھی۔

''ہوا کیا ہے تمہیں؟'' باہر جانے کے بجائے وہ اندر آ گیا۔

''کچھ نہیں۔ پیسے دے تو دیے ہیں اب اور کیا چاہیے؟''

''تمہاری زبان چاہیے، وہ جوگز بھر لمبی ہے۔ وہ والی۔''

ماہی حیران ہوئی۔ یہ قمر تھا؟ کیا اس ایک ہفتے میں یہاں بھی کچھ بدلا تھا۔ اس کی خاموشی پر کندھے اچکا کر وہ باہر نکل گیا تو وہ بھی آئینے کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ بستر پر پڑا اس کا فون بجنے لگا تو محفوظ نمبر دیکھ کر اس نے کال وصول کی۔

''کیا حال ہے راشد؟'' فون کان سے لگا کر وہ بستر پر بیٹھی اور آگے سے بات سن کر اچھل کر کھڑی ہوئی تھی۔ فون بند کر کے اس نے فوراً منور کا نمبر ملایا۔

''کب آسکتے ہو؟''

''ابھی آجاؤں؟'' اس نے اس کی بے چینی محسوس کر لی تھی پھر بھی مذاق میں کہا۔

''ہاں، ابھی آسکتے ہو تو ابھی آجاؤ۔''

''ہوا کیا ہے ماہی؟'' اس کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہوا۔

☆☆☆

ماہی نے ایک دو اعتبار کے لوگوں سے ذکر کیا تھا کہ وہ اپنا میک اپ برانڈ لانا چاہتی ہے۔ راشد بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک غیر معروف میک اپ برانڈ اپنی کمپنی بند کر کے اپنی فیکٹری تمام تر مشینری کے ساتھ بیچنا چاہ رہا ہے۔ قیمت ایسی تھی جیسے بچوں کی دس والی لاٹری سے سونے کی کوئی شے نکل آئے۔ اس نے دیر کیے بغیر منور سے مشورہ کیا۔ مما نے سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑا ہوا تھا سو وہ اور منور جا کر فیکٹری دیکھ آئے تھے۔ اس کے پاس گو کہ اتنے پیسے نہیں تھے کہ فیکٹری کے بعد وہ کام شروع کر سکتی سو نیہا نے اس کی خاطر ایک اور قربانی دی۔ جائیداد میں سے اپنا اور ریان کا حصہ لینے کے بعد اس نے اپنا گھر بھی بیچ دیا تھا اور کرائے پر چلی گئی تھی۔

یہ اللہ کی طرف سے مدد تھی کہ ماہی کو فیلڈ کے بہت سے تجربہ کار لوگوں کی پرخلوص حمایت حاصل تھی۔ اس نے پاکستان کے دو ٹاپ کے میک اپ برانڈ کی ٹکر کا برانڈ لانے کا سوچا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ایک دم تہلکہ مچا دینے والی رینج متعارف کروائے گی لیکن ایسا ہو نہیں پایا تھا۔ وہ وسیع رینج لانے کی حالت میں نہیں تھی، اس لیے فی الحال اس نے بنیادی چند ایک اشیاء پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اس کی اور اس کی ٹیم کی ان تھک محنت تھی کہ وہ مقررہ وقت تک اپنے ہدف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک تو معیار بہترین تھا اور دوسرا منور کی ایڈورٹائزمنٹ ٹیکنیک ایسی بہترین تھی کہ انہیں آغاز میں ہی کامیابی کا یقین ہو چلا تھا۔

اس کے کام کا دورانیہ بڑھ گیا تھا مگر وہ ماتھے پر بل ڈالے بنا دل جمعی سے کام کر رہی تھی۔ شاہ میر اور فرحان اس کے ذہن سے محو تو نہیں ہوئے تھے لیکن اب ان کا خیال بہت کم آتا تھا۔ وہ پورا دن اتنا مصروف ہوتی تھی کہ رات کو تھک کر چور ہوئی جب وہ بستر پر لیٹتی تو بنا کروٹ بدلے فوراً نیند کی وادی میں اتر جاتی۔ کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ کیسے رشتے دار تھے جو انہیں بالکل بھول گئے تھے۔ سات ماہ میں کسی نے ان کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ نیہا ہی جائیداد کے حصوں کے لیے ان کی طرف گئی تھی اور نیہا سے اس نے کسی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔

☆☆☆

اس روز مما نے اسے فون کر کے جلد آنے کی تاکید کی تھی۔ جلدی جلدی کرتے بھی وہ اپنے روز کے وقت پر پہنچی تھی۔ سامعہ پھپھو اور تایا نوید اس کے منتظر تھے۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

''میں نے سوچا، تم لوگ شادی کے علاوہ تو آؤ گے نہیں اس لیے ازکی اور شاہ میر کی شادی کا بلاوا لے کر آئی ہوں۔'' پھپھو کی بات پر اس نے غلطی سے بھی تایا جان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''میں نہیں آسکوں گی پھپھو۔ بالکل بھی وقت نہیں ملتا۔'' اس نے صاف جواب دے دیا تھا۔ بہ جاتے بغیر کہ کچھ دیر پہلے نیہا بھی یہی کر چکی ہے۔

اسے اب علم ہوا تھا کہ ازکی عثمان کی بیٹی ہے۔ وہ اس شخص کی کسی خوشی میں شریک نہیں ہونا چاہتی تھی۔

''اگر مجھے پتا ہوتا کہ شاہ میر وہ طوطا ہے جس میں عثمان کی بیٹی کی جان بستی ہے تو تمہیں گزرے آٹھ ماہ ضائع نہ کرنے دیتی۔ اچھا خاصا لڑکا تھا، اگر تمہاری شادی اس سے ہو جاتی تو کیا برا تھا۔'' ان کے جانے کے بعد نیہا نے افسوس سے کہا۔

''اس شیطان کے معصوم چہرے پر مت جایئے گا مما۔'' اس کی زبان بلا ارادہ ہی پھسلی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں مما۔ بس ایسے ہی۔'' اس نے سرسری لہجے میں کہہ کر اٹھنا چاہا لیکن مما نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''بتاؤ مجھے ماہی۔''

وہ سمجھ گئی تھی اب بنا بتائے چارہ نہیں، اس لیے اس رات کا راز نیہا کے سامنے کھول دیا۔ نیہا حق دق اسے دیکھ رہی تھی۔

''مما! بس کر دیں پلیز یہ انتقام کا کھیل۔ یہ زندگی ہے، اسے ایسے جوا سمجھ کر مت کھیلیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

یہ ٹھیک ہے نفرت کے اس کھیل نے نیہا کو اندھا بنا چھوڑا تھا، اس کے باوجود اس نے ماہی کے لیے ہمیشہ اچھا سوچا اور چاہا تھا۔ اگر اس رات کچھ ایسا ویسا ہو جاتا تو وہ جیتے جی مر جاتی۔ ویسے بھی اس کے انتقام کی آگ جو بظاہر بھڑ بھڑ محسوس ہوتی تھی، اندر سے بجھتا دیا تھی۔ یہ انتقام تو جیسے اس کے وجود کا ایندھن تھا۔ جو اسے مزید آگے بڑھنے کی لگن مہیا کرتا تھا۔ اگر یہ آگ اتنی ہی بھڑکتی ہوتی تو بھی ماہی سے اوپر کچھ نہیں تھا۔

''میں نے اپنا انتقام اللہ کی راہ میں چھوڑ دیا۔ میرا اب اس شخص سے نہ نفرت کا تعلق ہے نہ انتقام کا۔ گواہ رہنا ماہی۔'' اس کے کمرے میں کھڑے ہو کر کہتی وہ باہر نکل گئی۔ اس رات بہت وقت کے بعد وہ دونوں پرسکون نیند سوئی تھیں۔

☆☆☆

شاہ میر والے واقعے کو پورا ایک سال ہو گیا تھا اور آج سامعہ پھپھو آئی ہوئی تھیں۔ گزرے ایک سال میں یہ ان کا دوسرا چکر تھا۔ اس بار ان کے ساتھ فرحان، تبسم اور فرح بھی تھے۔ اب کی بار بھی ان کے لبوں پر بھلا دینے کا گلہ تھا۔ اب کی بار بھی اس کے پاس کام کا بہانہ تھا۔ فرحان کا سامنا کرنے سے جانے کیوں وہ کترا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر سارے پرد رد لمحے ایسے زندہ ہو جاتے تھے جیسے اس رات شاہ میر کی جگہ وہ تھا۔ فرحان کو دیکھ کر اسے وہ ذلت نئے سرے سے کچوکے لگانے لگتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رسمی سلام دعا کے بعد وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ رات کا کھانا اس نے سب کے ساتھ کھایا تھا۔ قمر گھر آ چکا تھا اور حیرت انگیز طور پر مہمانوں کے ساتھ بیٹھا بہت سلیقے سے باتیں کر رہا تھا۔ ماہی کو وہاں سے اٹھنے کی جلدی تھی ورنہ وہ اس کا تبسم کو دیکھ کر مسکرا مسکرا کر باتیں کرنا ضرور پکڑ لیتی۔

کھانے کے بعد سب سونے کے لیے لیٹ گئے تو وہ چپکے سے چھت پر چلی گئی۔ جاتے اکتوبر کی سرد ہوا نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تو وہ ٹھٹھر کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد مما بھی اس کے پاس اوپر آ گئیں۔

''توبہ ہے ماہی! میں تمہیں نیچے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آئی ہوں۔''

''کیا ہوا خیریت؟''

''سامعہ فرحان کا رشتہ لائی ہے تمہارے لیے۔'' کیسا بچھو تھا جس نے ماہی کو ڈنک مار کر اس کے سارے رنگ نچوڑ لیے تھے۔

''منع کر دینا تھا مما۔'' سر دریلنگ پر بازو رکھ کر سامنے سڑک پر نظریں جمائے اس نے لاپروا انداز اپنانے کی کوشش کی مگر زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسے لگا اندھیرے نے اس کا بھرم رکھ لیا لیکن اس کا کپکپاتا لہجہ اس کے اندرونی خلفشار کو عیاں کر رہا تھا۔

''کیوں ماہی؟ مجھے وہ لڑکا پسند ہے۔ میں تو بلکہ اتنا خوش ہوئی تھی۔''

''مما! وہ..... وہ گواہ ہے اس رات کا جسے میں خود سوچتی بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتی، وہ کل کلاں مجھے یہ سب یاد کروا کر تکلیف دے۔''

''میں اوپر آسکتا ہوں؟'' فرحان کی آواز پر وہ دونوں بری طرح چونکی تھیں۔ کہنا مشکل تھا کہ اس نے کچھ سنا بھی تھا یا نہیں۔

''آجاؤ بیٹا۔ یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔'' نیہا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماہی کو کچھ بھی کہنے سے منع کیا تھا۔

''امی آپ کو بلا رہی تھیں۔ فرح نے آپ کو دیکھا کہ آپ اوپر آرہی ہیں تو امی نے مجھے اوپر بھیج دیا۔''

''میں دیکھتی ہوں۔ تم لوگ بھی نیچے چلو اب، ٹھنڈ زیادہ ہورہی ہے۔''

''مامی میں ماہی سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو۔'' فرحان کے الفاظ نے نیہا کو سالوں پہلے ندی کے کنارے عثمان کے سامنے لے جا کھڑا کیا تھا۔ سر جھٹک کر وہ حال میں واپس آئی۔

''نیچے جلدی آجانا۔'' ان کی طرف دیکھنے سے گریز کرتی وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ اس کے پیچھے رات نے خاموشی کی ایک دبیز چادر اوڑھ لی۔

''مانا میں غصے کا تھوڑا تیز ہوں لیکن برا نہیں ہوں۔ کم از کم اتنا برا نہیں جتنا تم نے سوچ لیا ہے۔'' اس کے پہلو میں اسی کے انداز میں ریلنگ پر بازو رکھے وہ اس سے مخاطب تھا۔ ماہی سے جواب نہیں بن پایا۔

''مجھے بچپن سے تمہارا نام لے لے کر چھیڑا جاتا رہا ہے۔ امی نے بہت شروع میں یہ بات میرے ذہن میں ڈال دی تھی کہ ریان ماموں کی ماہی میری دلہن بنے گی۔ مجھے تمہارے روپ کا اندازہ نہیں تھا اور نہ اوقات میں رہ کر خواب دیکھتا۔ تمہیں بنا دیکھے میرے دل میں ایک گوشہ تمہارے نام سے آباد ہو چکا تھا۔ جہاں صرف ایک نام دمکتا تھا ''ماہ پارہ''۔ تمہاری یوٹیوب پر ویڈیوز دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ چاند میرا نہیں ہوسکتا لیکن ارسلان اور ردا کی مہندی پر تمہارا التفات مجھے غلط فہمی میں مبتلا کر گیا۔ پھر اگلے ہی دن تمہارا بدلا ہوا رویہ اور شاہ میر کا تمہاری طرف جھکاؤ مجھے ایک عذاب میں مبتلا کر گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک ہی رات میں ایسا کیا ہوگیا کہ زمین و آسمان بدل گئے ہیں۔''

ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا اور فیصلہ ہوگیا تھا۔ ماہی نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اس رشتے کو بنانا تھا جو ایک مدت سے فرحان یک طرفہ بنا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی لیے اس نے لب کھولے۔

''میں اسے چاچو عثمان والا شاہ میر سمجھ رہی تھی۔ اس کے ذریعے میں چاچو کو مجبور کر کے مما کے قدموں میں گرانا چاہتی تھی۔''

نیہا کی منصوبہ بندی کا ذکر کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

فرحان حیران ہوا۔ ''لیکن وہ تو تب ہی فوت گیا تھا جب عثمان ماموں واپس آئے تھے۔''

''کیا مطلب؟ کب اور کیسے؟''

''امی نے بتایا تھا اور یہاں تقریباً سب بچوں کو معلوم ہے۔ جب ریان ماموں نیہا مامی کو لاہور لے گئے تھے، اسی دن بڑے دادا ابو کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہاں ہسپتال میں عثمان ماموں بھی تھے۔ شاہ میر کو نمونیہ ہوگیا تھا۔ وہ بھی جانبر نہ ہوسکا اور بڑے ابو کی بھی وفات ہوگئی۔ اسی رات نوید ماموں کے گھر بیٹا ہوا تھا جسے عثمان ماموں کے بیٹے کے نام پر شاہ میر کا نام دیا گیا اور پھر جب بڑے دادا ابو نہیں رہے عثمان ماموں کے دکھ کا خیال کرتے انہیں بھی گھر آنے کی اجازت مل گئی تھی۔''

فرحان کی وضاحت پر وہ گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔

''کہیں نہ کہیں میں جانتا تھا کہ تم اس رشتے

قبول نہیں کرو گی، اس کے باوجود میں امی کو منع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں، میں اگر منع کر بھی دیتا تو وہ آسانی سے اپنی خواہش سے دستبردار نہ ہوتیں۔ اب..... نادانستگی میں میں نے جو بن لیا اس کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ ایک چھوٹی سی بات پکڑ کر اپنی اور تمہاری وہ زندگی جہنم بناؤں جس کے خواب میں بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا ہوں جب کہ تمہارا قصور بھی اتنا بڑا نہیں۔''

اس کی آخری بات پر ماہی نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہو کہ دیکھا تم مجھے قصوروار سمجھتے ہو۔

فرحان نے اس کی شکایت نیم روشنی میں بھی پڑھ لی تھی۔

''تمہارا قصور یہ کہ تم اس کے پیچھے گئی تھیں۔ عورت جتنا آزاد ہو رہی ہے، اس کے لیے غلطی کرنے کی گنجائش بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ جیسے کوئی پل صراط قدموں کے نیچے رکھا ہو۔ سوچ یا قدم کی چھوٹی سی لغزش وہاں گراتی ہے جہاں سے کوئی باہر نہیں نکل پاتا اور اگر نکل جائے تو ساری زندگی کسی کے برابر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہتا۔'' اس نے بنا کچھ کہے ہر کہانی کا خلاصہ کر دیا تھا۔

''میں جانتا ہوں، میں تمہاری طرح خوب صورت نہیں ہوں۔ میرے پاس ڈھیر دولت نہیں ہے اس کے باوجود میں محض کوشش کر سکتا ہوں کہ تمہیں ہر وہ خوشی دے سکوں جو تمہیں عزیز ہو۔'' اس کی طرف رخ کر کے براہ راست اس کا چہرہ تکتے وہ جذب کی کیفیت میں بول رہا تھا۔ ماہی اس کی نظروں کے ساتھ ساتھ ماحول کے فسوں کی گرفت میں بھی تھی۔ وہ فسوں جو اس کی باتوں نے تخلیق کیا تھا۔ بدگمانی اور لاعلمی کے سارے بادل چھٹ گئے تھے اور اب غبار آلود فضا بھی شفاف لگ رہی تھی۔ ماہی کو اپنا وجود پھولوں جیسا ہلکا لگ رہا تھا۔ نیہا کی پکار سن کر وہ نیچے اترنے لگی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر فرحان نے ایک بار پھر اسے آواز دی۔

''تو میں کیا سمجھوں پھر اب؟''

''مما کو بتا دوں گی۔'' سبک روی سے قدم اٹھاتی، رکھتی وہ نیچے اتر گئی۔ وہ وہیں کھڑا خلا میں نظر جمائے اس کا متوقع جواب سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ماہی کے ہاں کہنے کی دیر تھی کہ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ شادی نومبر کے آخری ہفتے میں اسلام آباد میں رکھی گئی تھی۔ ماہی متذبذب تھی۔ اتنی جلدی شادی کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''دیر کی وجہ کوئی نہیں۔ چوبیس سال کی ہو گئی ہو اور کیا بوڑھی ہو کر شادی کرو گی؟'' اس کی ہچکچاہٹ پر نیہا نے اسے لتاڑا۔

''پھر بھی مما! کوئی چار چھ ماہ تو انتظار کر لیتے۔ اتنی سردی میں شادی کرنے کی کیا تک بنتی ہے؟''

''یہ اعتراض تم دوسروں کے لیے رہنے دو۔''

نیہا نے شرارت سے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''انتظار وہاں کیا جاتا ہے جہاں غیروں میں شادی کرنی ہو۔ گھر کا دیکھا بھالا بچہ ہے۔ بلکہ سچ کہوں تو مجھے لگتا ہے، میرے اللہ کو مجھ پر رحم آ گیا ہے جو مجھے خوشیوں بھرے یہ دن دکھائے ہیں۔ اب تم جا کر اپنی تیاری کرو۔ جو چاہیے اس کی فہرست بناؤ اور اللہ سے اچھی اچھی دعائیں مانگو۔'' اسے ساتھ لپٹا کر ماتھے پر بوسہ دیتے نیہا کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

دوسرا شہر ہونے کے باوجود منور شادی کے ہر کام میں ساتھ تھا۔ منور کے ساتھ قمر نے بھی شادی کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر مدد کی تھی۔ وجہ تو کوئی نہیں جانتا تھا لیکن نیہا تو سارے دکھ بھول گئی تھی۔ قمر کی حرکتیں بھلا کر اس نے اسے سینے سے بھی لگایا تھا۔

قمر کو پہلی بار ماں کی محبت محبت لگی تھا۔ اپنا مرا ہوا باپ اسے آج جھوٹا لگا تھا۔ وہ بھی اس کے قریب آیا ہی نہیں تھا تو کیسے جانتا ماں کی محبت کیا شے ہے۔ اب بھی وہ مطلب سے پاس آیا تھا مگر آیا تو تھا۔ اس

ایک لمس نے جیسے آئینے سے سارے پردے اٹھا دیے تھے اور سچ پوری شان سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''سامعہ! تم چاہو تو عثمان کو بھی شادی میں بلا لینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اس نے سامعہ سے فون پر کہا تھا۔ جانتی تھی وہ حیرت سے گونگی ہوگئی ہوگی۔ ہوا بھی یہی تھا۔ اس کی عثمان سے نفرت یا گریز چھپی ہوئی بات تو تھی نہیں۔ ارسلان اور ردا کی شادی میں شرکت کے لیے اس کی یہی شرط تھی کہ عثمان اور اس کا خاندان شریک نہیں ہو گا اور اب؟ جو بھی تھا سامعہ کو خوشی تھی کہ اس کے سارے بھائی اس کی خوشی میں شریک ہوں گے۔

☆☆☆

ہر وقت میک اپ کیے رہنے کے باوجود بھی دلہن بنی ماہی پر ایک انوکھا ہی روپ اترا تھا۔ روایتی سرخ کام والے مہنگے لہنگے میں فرحان کے پہلو میں بیٹھی وہ کسی پری کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ چہرے پر خوشیوں کا عکس جھلملا رہا تھا جسے دیکھ کر ازکی کے اندر اندھیرا کچھ اور سیاہ ہوا تھا۔ اسے لگا تھا ماہی اس سے شاہ میر کو چھین لے گی۔ اسی لیے اس نے فرحان کے ذریعے گھر والوں کو آمادہ کیا تھا کہ وہ اس کی شادی کردیں۔

شادی کے بعد اسے شاہ میر کا اصل پتا چلا۔ دلکش شکل وصورت کے ساتھ متناسب سراپے کا مالک کم گو شاہ میر وہ نہیں تھا جو دیکھنے میں نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے ازکی کو ماہی کے بیچ نکلنے کی روداد گالیوں کے اضافے کے ساتھ سنائی تھی۔ وہ ایک فحش ویب سائٹ چلا رہا تھا جس کے لیے تصویریں اور ویڈیوز وہ خود بھی بناتا تھا اور ان لوگوں سے خریدتا بھی تھا جن کی رسائی مارکیٹ تک نہیں تھی۔ لڑکیوں کو بلیک میل کر کے رقم بھی لے لیتا اور پھر سب کچھ ویب سائٹ پر بھی ڈال دیتا۔

وہ ازکی کو بھی ویڈیو بنانے کا کہہ چکا تھا۔ ہزار قسمیں کھا کر یقین دلاتا کہ یہ صرف اس کے اپنے لیے ہے لیکن ازکی کو یہ سوچ کر ہی گھن آتی تھی۔ وہ اپنے باپ جیسی ضدی نہ ہوتی تو یا اس کی بات مان لیتی یا اس سے دستبردار ہو جاتی۔ مگر وہ ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

اب تو وہ اس پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا تھا۔ گزرے چند ماہ میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے شاہ میر کی صورت خود پر جہنم کا دروازہ کھول لیا ہے۔ وہ جنسی اور نفسیاتی مریض تھا اور اب ازکی کو لگنے لگا تھا کہ وہ اسے بھی ایسا ہی کچھ بنا دے گا۔ دانستہ وہ منہ موڑ کر اس طرح بیٹھی تھی کہ اسے ماہی کا چہرہ دکھائی نہ دے۔

''کیا ہوا ازکی؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟''

اس پر نظر پڑتے ہی سب کو چھوڑ کر جنت نور سیدھا اس کی طرف آئی تھی۔ ایک گلی میں گھر ہونے کے باوجود ازکی کئی کئی دن اپنی شکل تک نہیں دکھاتی تھی۔ جانے کون سی خود ساختہ ناراضی اس نے پال رکھی تھی۔

''جی ٹھیک ہوں۔'' کافی روکھا جواب تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا، وہ اپنی ماں سے بات کر رہی ہے۔

''آپ لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ جا کر سلامی وغیرہ دے آئی تھی۔'' عثمان کی آواز پر جنت نور فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلیں، میں آپ کو ہی دیکھ رہی تھی۔''

''اور شاہ میر کہاں ہے ازکی؟''

''وہ نہیں آیا۔ اسے کام تھا کوئی۔'' ازکی نے بے زاری سے جواب دیا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ تھا کہاں۔ عثمان نے اس کے رویے میں غیر معمولی پن محسوس تو کیا تھا لیکن یہ جگہ اس قسم کی کرید کے لیے مناسب نہیں تھی۔ اس لیے اس کام کو اگلی ملاقات پر ڈال کر نور کے ساتھ وہ اسٹیج کی طرف چل دیا۔ اسٹیج پر ماہی کے قریب کھڑی عورت کو دیکھ کر جنت نور کے قدم از خود رکنے لگے تھے۔

''یہ نیہا ہے۔'' عثمان نے اس کا رکنا محسوس کر لیا تھا۔ جنت نور حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ عمر کے اس حصے میں اتنی تکالیف دیکھنے کے بعد بھی وہ عورت ایسی تھی کہ وہ مسلسل دیکھے چلے جانے پر مجبور ہو گئی

تھی۔ اپنی جوانی میں وہ کیا ہوگی؟ اور ایسی لڑکی کو چھوڑ کر اگر عثمان نے اس کا ہاتھ تھاما تھا تو اس میں قسمت کے علاوہ کون سی چیز تھی جو یہ سب کروا سکتی؟

نور کو شروع میں ہی عثمان اور نیہا کی نسبت کا علم ہو گیا تھا لیکن یہ نسبت عثمان کی ضد کا نتیجہ تھی، اس بات کا علم اسے سالوں کے بعد ہوا تھا۔ وہ سوائے افسوس کے کیا کر سکتی تھی۔ یہ واقعی قسمت کے کھیل تھے۔ اگر اسے پہلے بھی پتا چل جاتا تو جس مقام پر وہ تھی، وہ کیسے عثمان کو اس کی طرف لوٹاتی؟

دلہن بنی ماہی نے تبسم سے باتیں کرتے قمر کے چہرے پر ایک انوکھا رنگ دریافت کیا تھا جسے وہ محبت ہی کہہ سکتی تھی۔ سب سے نظر بچا کر بار بار اس کا چہرہ دیکھنا اور تبسم کا اس کی موجودگی کے احساس سے چونک جانا اور پھر اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر جھینپ جانا۔ یہ محبت ہی ہو سکتی تھی۔ قمر کا اچانک بدلنا اور اس کی شادی کے لیے پرجوش ہونا اسے سب سمجھ میں آ رہا تھا اور وہ ان دونوں کے لیے خوش بھی تھی۔ نیہا کے لیے یہ کیسی خوش خبری ہوگی، یہ سوچ کر ہی اسے مزہ آ گیا تھا۔

☆☆☆

ماہی اپنے فیصلے پر مطمئن تھی اور اب خوش بھی۔

فرحان اس کی سوچ سے بھی بڑھ کر اسے چاہتا تھا۔ یہ ان کی شادی کا پانچواں روز تھا۔ وہ انگوی رنگ کے نفیس ہلکے کام والے جوڑے میں لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ منور نے ان کی دعوت کی تھی اور انہیں اس دعوت کے لیے جانا تھا۔ شادی کے تیسرے دن ہی فرحان نے گھر میں کام والی رکھوا دی تھی جو اس وقت کمرے کی صاف صفائی کر رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ ماہی اس وقت جس مقام پر ہے وہ ایک دو دن کی بات نہیں۔ اس کے پیچھے سالوں کی محنت ہے اور وہ یہ محنت چولہے چوکے کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے سامعہ سے بات کر کے اس نے کام والی رکھوا دی تھی۔

''اسے رہنے دو اور جا کر چائے بنا کر باہر لگاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' گھڑی پر نظر کرتے اس نے کپڑوں کو تہ کرتی نگینہ کو باہر بھیجا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فرحان آ گیا۔

''ظالم لوگو! ایک تو اتنا تیار شیار ہو، وہ بھی جانے کے لیے۔ بے چارہ شوہر تو مارا گیا نا؟'' جب سے اسے ماہی پر تمام حقوق ملے تھے، وہ ہر تھوڑی دیر بعد یونہی حواس کھونے لگتا تھا۔

''کوئی مارا نہیں گیا۔ گھڑی دیکھیں اور چلنے کی تیاری کریں۔''

''میں نہیں چاہتا، شادی سے تمہارے کام پر کوئی اثر پڑے۔ تم پہلے جیسے اپنا کام جاری رکھو۔ بس اتنا کرو کہ چند چھٹیاں لے لو۔ تمہارے غریب شوہر نے چند پیسے نئی مون کے لیے جوڑ رکھے ہیں اور اب وہ شور کر رہے ہیں کہ خدا کا واسطہ ہمیں خرچ کر لو۔'' اس کے غریب شوہر کہنے پر وہ ہنسی تو ہنستی چلی گئی۔ اس کا انداز ہی ایسا تھا۔ قدرت نے اس کے حصے میں ایسی بہت سی ہنسی لکھ چھوڑی تھی۔

''تو وہ مجھے دے دیں نا۔ مجھے ایک نئی پراڈکٹ لانچ کرنی ہے، اس میں کام آ جائیں گے۔ یوں بھی جتنی سردی پڑ رہی ہے، میرا اس کمرے سے نکلنے کا دل نہیں کرتا تو اور کہیں کیا جانا۔'' اس نے شوخی سے جواب دیا جو کسی قدر سچ پر مبنی تھا۔ اتنی سردی میں اس سے کمرے سے بھی نہیں نکلا جاتا تھا۔

''تو پھر میں یہ ہنی مون پیریڈ اپنے کمرے میں گزارنا چاہوں گا۔'' اس کا بازو کھینچ کر اسے اپنی طرف گھماتے وہ پھر شریر ہوا۔ پہلو بچا کر وہ باہر بھاگی۔

''چائے تیار ہو گئی ہوگی، باہر آ جائیں ابھی مما سے بھی ملنے جانا ہے۔''

ہاتھوں سے بال سنوارتے مسکراتے ہوئے وہ بھی کمرے سے باہر چلا گیا۔

نیہا ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ ہر یاران کے روشن چہرے دیکھ کر بے ساختہ شکر ادا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی دائمی خوشیوں کی دعا بھی کرتی تھی۔ اپنی تو جیسے تیسے گزر گئی تھی لیکن بچوں پر وہ کسی دکھ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

''میں تمہاری طرف جارہا تھا اور تم یہاں بیٹھی ہو۔'' اسے لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر قمران کی طرف ہی آگیا۔ اسے آتا دیکھ کر نیہا باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

''خیریت! آج تمہیں کیسے یہ خیال آگیا؟'' ان کی شادی کے بعد ابھی تک ایک بار بھی قمران کی طرف نہیں آیا تھا۔

''میں بس ایک مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔ میں کام کرنے کا سوچ رہا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔''

فرحان کا فون بجا تو وہ فون لے کر باہر نکل گیا۔ اب وہاں صرف ماہی اور قمر بیٹھے تھے۔

''تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''شادی۔'' بے اختیار اس کی زبان پھسلی۔

''تبسم سے؟'' ماہی کے کہنے پر مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''میں اب اپنی زندگی سیٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بہت خجل خوار ہولیا۔''

''ہاں تو بھائی! کرو سیٹ، منع کس نے کیا ہے؟'' اندر آتے فرحان نے اس کی بات سن کر جواب دیا۔ دونوں بہن بھائیوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں معاملہ ''پکا'' کیا اور مسکرا اٹھے۔

دسمبر کا یہ دن ان کے لیے بہت خوشگوار تھا۔ مگر ایک گھر ایسا بھی تھا جہاں بیڈ پر قید زندگی سے آزاد بدن لٹک رہا تھا۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی ازکی کی خود کشی کی اطلاع آگئی تھی۔ شاہ میر کے بغیر وہ رہ نہیں سکتی تھی اور اس کے ساتھ رہنے والی اب کوئی صورت رہ نہیں گئی تھی۔ ایک یہی راستہ تھا جو وہ اختیار کر چکی تھی۔ نور نے اسے صبر، برداشت سکھانے کی جتنی کوشش کی تھی وہ سب رائیگاں چلی گئی۔ مرنے سے پہلے اس نے ایک خط عثمان کے نام لکھا تھا جس میں اس نے شاہ میر کے کرتوتوں سے پردہ اٹھایا تھا۔ اس نے آخر میں لکھا تھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ کل کو میری بیٹی ہو جو میرے شوہر کے گناہوں کا کفارہ دیتی پھرے۔''

یہی وہ سطر تھی جسے پڑھ کر ساری زندگی خود کو صحیح سمجھنے والے عثمان پر اس لمحے اس کی ساری غلطیاں آشکار ہوگئی تھیں۔

جوان موت پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ نیہا بھی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس معصوم لڑکی کا کفن میں لپٹا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے عثمان کے لیے ہمیشہ درد اور سزا کی خواہش کی تھی لیکن ایسی سزا؟ اس کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔

ازکی کی تدفین کے بعد اس سرد رات وہ گھر نہیں گیا تھا۔ ساری رات اس کی قبر پر تلاوت کرتا اور اس سے معافی مانگتا رہا کہ اس نے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ صبح گھر جانے کے بجائے وہ نیہا کی طرف چلا گیا۔ دروازہ ماہی نے کھولا تھا۔ رات سے وہیں تھی۔ اسے بیٹھک میں بٹھا کر وہ نیہا کو بلا کر لے آئی۔

''تم نے جو زندگی میری وجہ سے گزاری، میری بیٹی نے اس پر موت کو ترجیح دی کہ یہ زندگی موت سے بھی بدتر تھی۔ میں نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے نیہا! اور جانتا ہوں سزا ابھی شروع ہوئی ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ میں معافی کے قابل نہیں۔ پھر بھی چاہتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔ شاید قبر حشر کی منزلیں آسان ہوجائیں۔''

نیہا خاموشی سے اس کا جھکا سر دیکھتی رہی۔ اس شخص کا سر جھکانے کی خواہش لیے اس نے کیسے کڑے عذاب کاٹے تھے۔ اب جب اس نے سب اللہ کے حوالے کر دیا تھا تو اس نے اسے اس کے در پر لا پھینکا تھا۔ ماہی چپ چاپ دروازے سے ہٹ گئی۔

''میں نے تمہیں اللہ کی رضا کے لیے بہت پہلے معاف کر دیا تھا۔''

اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اسی لیے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

ماریہ کامران

حسن آرا

"شکر کرو حسن آرا! صرف نام کی ہی حسین ہے۔ اللہ معاف کرے حسن آرا میں جو ذرا بھی حسن ہوتا تو اس نے قدم زمین پر نہیں رکھنے تھے۔ دماغ تو ابھی بھی ساتویں آسمان پر ہی رہتا ہے محترمہ کا۔" یہ منجھلی چچی اور بے بی پھوپھو کی مشترکہ رائے تھے حسن آرا کے بارے میں.....

خاندان بھر میں اپنے چڑچڑے اور تیکھے مزاج کی وجہ سے مشہور حسن آرا اخیر سے چار بھائیوں کے بعد جب دنیا میں آئی تو مانو اماں یا دادا کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بڑی منتیں مرادیں مانگی تھیں تب کہیں جا کر اوپر تلے کے چار بیٹوں کے بعد بیٹی کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی تھی پہلی بار جب نرس نے حسن آرا کو اماں کی گود میں ڈالا تو زچگی کی وجہ سے نقاہت زدہ چہرے پر تفکر کی بھی کئی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

"یہ کیا.....؟ بیٹے تو سارے صاف رنگت کے تھے اماں خود بے حد گوری چٹی، ابا بھی گندمی رنگت کے مالک تھے مگر بیٹی.....

گہرا سانولا رنگ اور عام سے نقوش۔ خیر اللہ کی مصلحت جان کر ننھی سی جان کو سینے سے لگا لیا۔

دادی نے چار عدد پوتوں کے بعد جب پوتی کی آمد کی خبر سنی تو خوشی سے نہال شاداں و فرحاں ڈھیروں مٹھائی لیے اسپتال آ پہنچیں مگر پوتی کو دیکھتے ہی اوئی ماں کہتی ناک پر انگلی جما کر بیٹھ گئیں۔

"اے بہو! سنگھاڑے تو نہیں کھا لیے تھے مجھ سے نظر بچا کر چاروں لڑکوں کی دفعہ بھی خوب نظر رکھی تھی میں نے تم پر کہ کچھ الٹا سیدھا نہ کھا لو اس حال میں۔"

"نہیں اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔" اماں جونڈھال سی لیٹی تھیں بیزاریت سے بولیں..... پر دادی پر چنداں اثر نہ ہوا۔

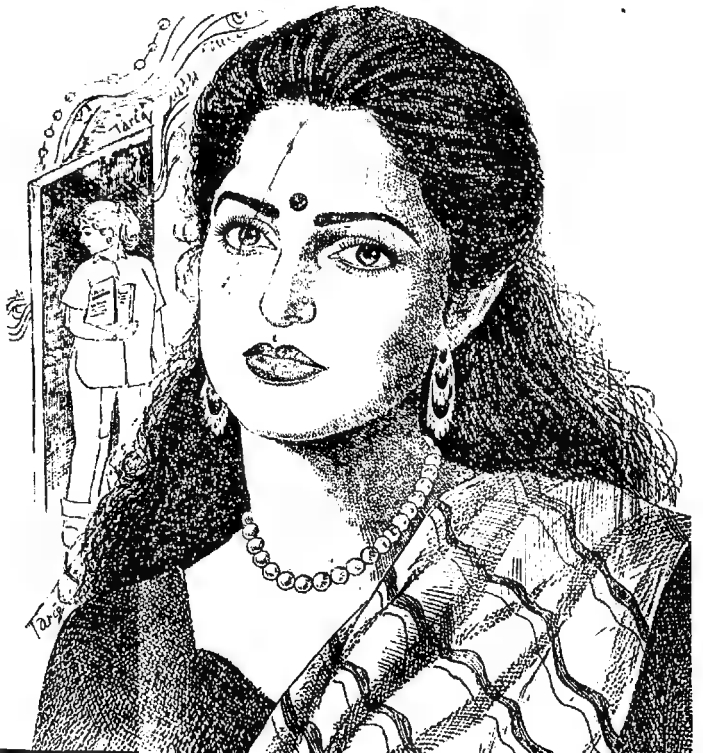

''اے رہنے دو بہو! کتنا کہا تھا تم سے کہ اپنی اس پڑوسن سہیلی سے ملنا جلنا کم رکھو اس حال میں، پر تم کب سنتی ہو کسی کی۔ خیر سے سارے ہی بچے گہری رنگت کے ہیں اس کے۔'' دادی کی اپنی ہی منطق تھی اماں نے بے بسی سے ابا کی طرف دیکھا جواب تک خاموش کھڑے تھے۔

''ارے اماں! کیوں فکر کرتی ہیں شکر ادا کریں کہ اللہ نے ہمیں اپنی رحمت سے نوازا ہے بس اچھے نصیبوں کی دعا کریں۔'' ابا نے متانت سے کہتے ہوئے بچی کو اٹھا کر دادی کی گود میں ڈال دیا۔

''اے ہائے کیوں نہیں، اللہ خیر سے نصیب اچھے کرے میری بچی کے۔'' دادی نے کئی بلائیں لے ڈالیں اور حکم صادر کر دیا کہ آج سے اور ابھی سے بچی کو سب حسن آرا کے نام سے پکاریں گے۔ ''گماں غالب تھا کہ نام کا اثر شخصیت پر ضرور پڑتا ہے۔''

☆☆☆

اسپتال سے گھر آتے ہی دادی نے کمر کس لی دن میں دو دو بار بچی کو نہلاتیں۔ کئی کئی بار منہ رگڑ رگڑ کر دھلایا جاتا۔ روغن بادام کی مالش اور نہ جانے کون کون سے ٹوٹکے، سارا دن اماں کو بھی ساتھ لگائے رکھتیں۔ بڑھاپا تھا ننھی سی بچی کو اٹھائے رکھنے میں ہی ہانپ ہانپ جاتی تھیں۔

''اے بہو رنگ تو مانو بہت ہی پکا لگتا ہے کسی چیز سے نہیں کٹ رہا۔'' تھک ہار کر تکیہ لگا کر لیٹ جاتیں مگر دوسرے ہی دن پھر نئے جوش اور ٹوٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتیں۔ حسن آرا نے ہوش سنبھالا تو خود بھی دادی کے ساتھ جت گئی کتابوں رسالوں سے پڑھ کر کبھی وہی پر دیکھ کر دونوں دادی پوتی ٹوٹکے آزماتی رہتیں۔

''حسن آرا! جاڑا شروع ہو گیا ہے سنگترے کے چھلکے سکھا لے ایسا اٹھن پیس کے دوں گی دنوں میں رنگ نکھر آئے گا۔'' جیسا جیسا دادی بتاتی جاتیں حسن آرا کرتی جاتی یہ الگ بات ہے کہ پیدائش کے دن سے اب تک حسن آرا میں کوئی فرق نہ آیا تھا پر دادی نے ہمت نہ ہاری تھی۔

''بیسن میں ہلدی دودھ کے ساتھ چندن کا پاؤڈر ملا لے چمک آجائے گی چہرے پر۔'' حسن آرا دادی کی ہر ہدایت پر عمل کرتی جاتی۔ بڑھتی عمر تھی سمجھ آتی جا رہی تھی۔ لڑکپن کی دہلیز پر قدم رکھا تو لوگوں کی نظروں کا مفہوم بھی سمجھنے لگی۔ خاندان کی ہم عمر لڑکیوں کو دیکھتی تو اپنی کم روی کا احساس بڑھ جاتا کسی سے گھلتی ملتی نہیں سب سے فاصلہ رکھ کر ملتی۔ بے نیازی کے ساتھ ساتھ خی کا عنصر بھی گھلتا جا رہا تھا مزاج میں..... کچھ گھر سے ملا حد درجہ لاڈ پیار بھی شخصیت میں بگاڑ کا سبب بنا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان بھر میں تیز مزاج اور چڑچڑی مشہور ہو گئی۔

دادی کی بوڑھی ہڈیوں میں جب تک دم رہا حسن آرا کو نکھارنے سنوارنے میں لگی رہیں۔ حسن آرا سولہویں برس میں تھی جب دادی بھی داغ مفارقت دے گئیں۔

☆☆☆

حسن آرا نے میٹرک کے پرچے دیے تو اماں کو جانے کیا سوجھی کہ ہاتھ پکڑ کر پچھلی گلی میں رہنے والی پارلر والی باجی کے پاس لے گئیں کہ حسن آرا بھی پارلر کا کام سیکھ لے۔ اماں ٹھہریں پرانے وقتوں کی سیدھی سادی گھریلو عورت وہ کہاں ان باتوں کو سمجھتی تھیں۔ یہ تو اماں کی ایک قریبی سہیلی تھیں جنہوں نے یہ خیال اماں کے دماغ میں ڈالا تھا کہ پارلر والیاں کالی پیلی بھی ہوں تو اپنے آپ کو سجا سنوار کے خوب صورت بنا لیتی ہیں .....ادھر حسن آرا نے پارلر کا کورس مکمل کیا ادھر ابا نے کہہ سن کر نکڑ والی دکان پر حسن آرا بیوٹی پارلر کا بورڈ سجا دیا پارلر چل نکلا تھا حسن آرا کو بھی مصروفیت ہاتھ آ گئی تھی۔

وقت تھوڑا اور سرکا تو کے بعد دیگرے سارے بھائی بھی خیر سے شادی شدہ گھر بار والے ہو گئے۔ اماں ابا کی بس یہی خواہش تھی کہ اب حسن آرا کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں۔

کچھ صورت کو جی کچھ مزاج کی تیز، یہی وجہ تھی کہ خاندان برادری میں سے کسی نے دست سوال دراز نہ کیا۔ کہہ سن کر باہر سے جو ایک آدھ بار رشتے آئے بھی تو لوٹ کر ایسے گئے کہ مڑ کر واپس ہی نہ آئے۔

حسن آرا کی بڑھتی عمر کے ساتھ اماں کے وظائف بھی لمبے ہوتے جارہے تھے مگر قسمت پر ایسا قفل لگا تھا جو کسی کنجی سے نہ کھل رہا تھا اب تو حسن آرا نے بھی تھک ہار کر سارے ٹونے ٹوٹکے چھوڑ کر پارلر کی مصروفیت میں خود کو گم کرلیا تھا۔

☆☆☆

عمر کا پینتیسواں برس لگا تو اماں نے کہہ سن کر ایک بار پھر وچولن کو بلا بھیجا۔ ہزار منتیں ترلے کر کے منہ مانگے پیسوں کا لالچ دے کر کوئی مناسب رشتہ لانے کا کہا۔ دوسرے دن ہی وہ ایک بڑی بی کو ساتھ لیے چلی آئی۔ بڑی بی نے دو سال پہلے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی تھی۔ بچے کی پیدائش پر ہونے والی پیچیدگی کی وجہ سے بہو چل بسی تھی۔ اس عمر میں ننھے سے بچے کے ساتھ گھر سنبھالنا ان کے لیے محال تھا چناں چہ سلجھی ہوئی خاندانی لڑکی کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ جو گھر اور بچہ دونوں سنبھال لے۔

اماں کے اخلاق سے متاثر نظر آئیں، خوش دلی سے ملیں سرسری نظر حسن آرا پر ڈالی ایک آدھ بات کی اور چلی گئیں۔ کچھ دنوں بعد ہی وہاں سے ہاں کا عندیہ مل گیا۔

وچولن کو بھی اپنے پیسے کھرے کرنے کی جلدی تھی آناً فاناً اماں ابا کو ساتھ لیا اور لڑکا دکھانے چل پڑی۔ ابا توصیف میاں کی متانت اور سنجیدگی سے متاثر ہوئے۔ اماں کو بھی دھیمے مزاج کے سلجھے ہوئے توصیف میاں بہت بھائے لیکن بیٹی کے مزاج سے ڈرتی تھیں کہ کہیں شادی شدہ ایک بچے کے باپ کا رشتہ سن کر انکار نہ کر دے۔ جانتی تھیں کہ جب نوعمری میں کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہ ملا تو اس عمر میں تو کنوارے لڑکے کا رشتہ ملنا ناممکن ہی تھا۔ اماں نے خود ہی حسن آراء سے بات کرنے کی ٹھانی۔ رشتے کے تمام کوائف بمعہ توصیف میاں کی تعریف و توصیف کے سب حسن آراء کے سامنے رکھ دیے۔ حسن آرا بھی اب وقت کی نزاکت کو سمجھتی تھی۔ مزاج میں بھی پہلے جیسے طنطنہ نہ رہا تھا سو اماں ابا کی رضا اور خوشی کے آگے سر جھکا دیا۔

شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں گو کہ یہ توصیف میاں کی دوسری شادی تھی مگر حسن آرا کی تو پہلی ہی شادی تھی۔ سو اماں نے خوب ارمان نکالے اکلوتی بیٹی کی شادی پر..... شادی کے دوسرے دن توصیف میاں ایک خوب گول مٹول گورے چٹے بچے کو گود میں اٹھائے چلے آئے۔ ڈرے سہمے معصوم سے بچے پر حسن آرا کو بہت ترس آیا۔ بڑھ کر کلیجے سے لگا لیا وہ بچہ جو پیدا ہوتے ہی ممتا جیسی عظیم نعمت سے محروم ہو گیا تھا۔ حسن آرا سے ایسا مانوس ہوا کہ ہر وقت اس کا پلو تھامے ساتھ ساتھ رہتا۔

☆☆☆

توصیف میاں ابھی ابھی دفتر سے لوٹے تھے اور حسب عادت اماں جان کی مزاج پرسی کے لیے ان کے کمرے میں موجود تھے۔

''حسن آرا دل کی بہت حسین ہے اماں! ایک اطمینان سا ہو گیا ہے اب کوئی بے سکونی نہیں رہی منے کی طرف سے۔ دفتر میں بھی سکون سے اپنا کام کرتا ہوں۔''

توصیف میاں کے لہجے میں حسن آرا کے لیے ممنونیت اور عقیدت تھی تو اماں کے لہجے میں بھی مان اور پیار تھا۔

''دل کو لگتی بات کی ہے توصیف میاں۔ حسن آرا نے منے کو بالکل سگی ماں جیسا پیار دیا ہے اللہ سکھی رکھے بچی کو.....''

اور دروازے کی چوکھٹ پر چائے لے کر آتی حسن آرا دل تھامے کھڑی تھی یونہی..... اتنی عمر بتا دی ایک لاحاصل کے پیچھے۔ پتا نہیں تھا کہ تن اجلا نہ بھی ہو تو من کا اجلا پن آپ کے چاروں طرف نور کے چراغ روشن کر دیتا ہے۔

''حسن کا جو خراج آج ملا تھا وہ انمول تھا۔''

دو جلد باز آنسو آنکھوں سے پھسل کر رخسار پر امڈ آئے تھے ساری زندگی اپنی تعریف کے لیے ترسنے والی حسن آرا کے لیے یہ احساس بے حد خوش کن تھا۔ کہ وہ بھی حسین ہے ''دل کی حسین''

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

☆

عندلیب زہرا

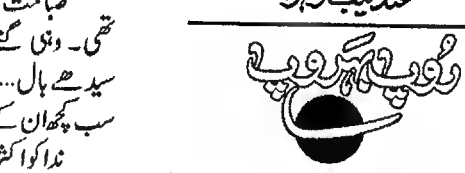

صباحت آپی اپنی خالہ کی پسندیدہ بھانجی تھیں۔ جب بھی آتیں، خالہ کے کتنے کام اپنے سر لے لیتیں۔ محبت سے، پوری ذمہ داری کے ساتھ..... جیسے یہ ان کا اپنا گھر ہو۔ ہر فرد سے ان کا لگاؤ قلبی تھا۔ حسن اور معیز کو ان کا انتظار رہتا۔

''آپی کے ہاتھ کے کھانے..... واہ واہ۔'' وہ دونوں چٹورے سارے کھانے گنواتے جو وہ فرمائشیں کر کر کے بنواتے تھے اور صباحت آپی بنا ماتھے پر بل لائے ان کی فرمائشیں پوری کرتی جاتیں۔ فاطمہ کو ان سے مہندی لگوانا پسند تھا۔ جب صباحت آپی رہنے آتیں وہ بہنیوں تک ڈیزائن بنواتی۔ اپنی سہیلیوں کو بھی بلاتی۔ ثمن کی تو پکی سہیلی تھیں۔

خالہ کے دکھ سکھ (سسرالی برائیاں) سنتیں۔ تیل کی مالش کرتیں۔ خالو کی بے اعتنائی کے شکوے پر تسلی دیتیں۔ جب بھی خالہ کے گھر رہنے آتیں، سب پکنک کے پروگرام ـــ بناتے۔ چاچو اور تایا کے گھر دعوت ہوتی۔ واپسی پر خالہ، صباحت آپی کو سب کی طرف سے تحائف دیتیں۔ جو وہ بہت خوش سے ممنون ہو کر رکھ لیتیں۔

لیکن اتنی اچھی لڑکی انتیس تیس برس کی ہو کر بھی کنواری تھی۔ معلوم نہیں اوپر سے دیر کی یا بندش..... لیکن کسی نے ان کو اس حوالے سے پریشان اور تلخ نہ دیکھا تھا۔

''جب اللہ کو منظور ہوگا تب ہو جائے گا۔'' ہر کسی کے استفسار پر وہ متانت سے یہی جواب دیتیں۔ ان کی محبتوں کے سب گرویدہ تھے۔ ایسے میں صرف ندا کو ان کی شخصیت مصنوعی لگتی۔

''یہ کیا انسان کو اپنی پریشانی کا احساس نہ ہو۔'' صباحت آپی کی مالی حیثیت بھی قدرے کمزور تھی۔ وہی گنے چنے کپڑے..... کوئی فیشن نہیں۔ سیدھے بال..... لیکن یوں بے نیازی سے رہتیں گو سب کچھ ان کے دامن میں ہے۔

ندا کو اکثر محسوس ہوتا جیسے ان کے گھر آ کر آپی ہر شے پر اپنا تسلط چاہتی ہیں..... لیکن پھر واہمہ سمجھ کر جھٹلا دیتی۔

سمرینہ اور ہانیہ اس کے چچا کی بیٹیاں تھیں۔ ماڈرن اور اعلا تعلیم یافتہ..... لیکن معلوم نہیں کیوں صباحت کا لہجہ ان کے متعلق بات کرتے ہوئے ہلکا سا استہزائیہ ہو جاتا، جیسے ان کا مذاق اڑا رہی ہو۔

''بندہ وہ کام کرے جو سوٹ کرے..... سمرینہ پر شارٹ شرٹ کیسی لگتی ہے۔'' تبصرہ کر کے وہ ان سے رائے طلب کرتیں۔

''تمہارے چچا انہیں اکیلے سفر کی اجازت کیسے دیتے ہیں (ابرو کے اشارے سے کہتیں) آج کل کے حالات..... میری امی تو مجھے اکیلے چھت پر جانے نہ دیں۔'' وہ ان کے تعلیمی ٹرپ پر تبصرہ کرتیں۔ ثمن اور نباء فاطمہ ہاں میں ہاں ملاتیں۔ لیکن ندا کو یہ پسند نہ تھا۔

''چچا کو ان پر بھروسا ہے آپی۔'' ندا سنجیدگی سے کہتی۔

صباحت آپی کندھے اچکا کر بریانی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ خالہ ان دنوں بہت پریشان تھیں۔ خالو کی بیماری..... صباحت آپی کی شادی..... ماں حالت..... امی تسلیاں دیتیں۔ اپنی معاونت کی یقین دہانی کرواتیں۔ لیکن خالہ کے حالات جوں کے توں تھے۔

سجاد چچا جرمنی سے گئے۔ امی ابو کی خواہش تھی وہ اب پاکستان میں شادی کر کے واپس جائیں۔

''امی! آپ کو صباحت آپی کے لیے چاچو کیسے لگتے ہیں؟'' ثمن نے ایک دن کہا۔

''خیال تو نیک ہے لیکن تمہارے چاچو کا معیار بہت بلند ہے۔ خوب صورتی پہلی شرط ہے۔ اعلا ڈگری دوسری اور دولت تیسری..... ورنہ صباحت سے اچھی لڑکی انہیں کہاں ملے گی۔'' امی نے اداسی سے کہا۔ اسی وقت صباحت نے کھانا تیار ہونے کا عندیہ دیا۔

''انہوں نے سن لی ہوں گی باتیں.....'' نباء فاطمہ نے فکرمندی سے سوچا۔ لیکن صباحت آپی کے پرسکون چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

آخر سجاد چاچو کی شادی ان کی آئیڈیل لڑکی سے ہوگئی۔ خوب دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ دنیا دنگ رہ گئی۔ سب نے پورے جوش سے شرکت کی۔ صباحت آپی اور خالہ بھی آئیں۔ ندا کو آپی میں جوش مفقود لگتا۔ سب کا خیال رکھتیں۔ مگر پہلا سا لگاؤ نہ ہوتا۔ ایک اداسی ان کی آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی۔ ندا ان کے دل کا راز پا گئی تھی سو دل بوجھل ہوگیا۔

نئی نویلی دلہن سب کو پسند آئی۔ ہنسوڑ اور چنچل۔ صباحت آپی کا رویہ سنجیدہ اور کسی قدر روکھا تھا۔ جیسے نئی دلہن کی حرکتیں پسند نہ ہوں۔ تقریبات کے خاتمے کے فوراً بعد وہ واپس چلی گئیں۔ چاچو اپنی بیوی کو لے کر واپس جرمنی چلے گئے۔

زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی تھی۔ ان ہی دنوں امی کا پاؤں فریکچر ہوگیا۔ صباحت آپی کی ضرورت سب کو تھی لیکن انہوں نے آنے سے انکار کردیا۔ گھر کے کام..... خالہ کی طبیعت..... دور راستہ، وغیرہ وغیرہ۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا پھر آپی ان کے گھر آنے سے گریز کرنے لگیں۔ وہ ان کا قیام..... من پسند کھانے پکانا..... گپ شپ سب عنقا ہونے لگے۔ امی اکثر استفسار کرتیں۔

''صباحت کو کیا ہوا ہے؟ ناراضی ہے کسی سے؟''

کسی کے پاس جواب نہ تھا ماسوائے ندا کے۔ جو دل کی بات دل میں رکھنے کی قائل تھی۔

''کیا ہم سے کوئی رشتہ نہ تھا؟'' وہ اکثر خود سے سوال کرتی۔ ان ہی دنوں صباحت آپی کی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی خبر سنی۔ سب بہنوں کے پیپرز تھے، صرف بھائی اور امی ابو گئے۔

''بہت امیر گھر میں بیاہی گئی ہے صباحت۔ لڑکے والے ماڈرن اور آزاد خیال لوگ ہیں۔'' امی کا بس یہی تبصرہ تھا۔ انہوں نے تصویریں اور مووی دیکھی بس.....

☆☆☆

خالہ، خالو کی وفات کے بعد مصروف زندگی میں اب صباحت آپی ایک یاد تھیں۔ بھولی بسری..... دھندلی سی۔

ندا کی شادی ہوگئی اور وہ دوسرے شہر آ گئی۔ اجنبی لوگ..... اجنبی ماحول..... وہ خود کو ایڈجسٹ کررہی تھی۔ جب ایک سسرالی تقریب میں صباحت آپی سے ملاقات ہوئی۔

''صباحت آپی! آپ.....'' وہ فرط جوش سے ان سے لپٹ گئی۔ جیسے نوعمری میں ان کی آمد پر گلے لگ جاتی تھی۔ امی..... خالہ کی خوشبو ان کے وجود

سے اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس نے خلوص سے ہاتھ تھام لیے۔

''فائن..... آپ سناؤ۔ ایوری تھنگ از فائن۔'' مصنوعی اور جوش سے عاری لہجہ..... وہ پھیکی سی پڑ گئی۔

اور پھر قدم قدم پر اجنبیت بھرے رویے نے اسے سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر ان سے ملنے گئی۔ وہی رشتوں کی ہٹرک..... کسی اپنے سے ملاقات۔ میز پر وہ اپنی امیر اور طرح دار سہیلیوں میں سب سے نمایاں لگ رہی تھیں۔

''میں تو شروع سے دبئی شاپنگ کرنے جاتی ہوں۔ میرے پاپا کا بزنس وہیں ہے۔'' صباحت آپی کسی سے کہہ رہی تھیں۔

''میری مما نے شروع سے کک رکھا تھا۔ کوکنگ اور میں..... نو وے۔'' یہ تو کوئی اور عورت تھی، صباحت نہیں۔ ندا نے آنکھیں ملیں جو دھندلا گئی تھیں اور کانوں میں ماضی کا کوئی پل گونجا۔

''اپنی خواہشات محدود رکھنی چاہئیں، سادگی میں سکون ہے۔''

''امی کے ہاتھ کے دال چاول تو مجھے پزا اور برگر سے بڑھ کر مزے دار لگتے ہیں۔''

''ممن یہ جدید لباس آج کل لڑکیوں کو کارٹون ہی دکھا سکتا ہے۔ مجھے تو شلوار قمیص میں پُر وقار لگنا ہے۔''

آج ندا پر یہ عقدہ کھلا تھا کہ بعض لوگ کس طرح کھوکھلی زندگی گزارتے ہیں۔ مصنوعی ملمع سازی کر کے عزت بناتے ہیں۔ صباحت آپی کے گھر میں پابندیاں تھیں۔ فیشن کرنے پر..... شاپنگ پر..... سہیلیوں کے گھر جانے پر..... لے دے کے خالہ کا گھر تھا۔

وہاں نہ تو بے جا آزادی تھی اور نہ ہی تنگ نظری اور جبری پابندیاں۔ وہ بہنیں فیشن کے مطابق اپ ڈیٹ رہتیں۔ کالج، یونیورسٹی جاتیں۔ پپا نے وعدہ کر تھا کہ ان بہنوں کو جاب کی اجازت بھی ملے گی۔

ایسے میں صباحت آپی خود پر بے نیازی اور صبر شکر کا ملمع چڑھا کر رکھتیں۔ جیسے وہ اپنے حالات مطمئن ہیں اور اصل زندگی اور ماحول مفید اور باعث عزت ہے جس میں ان کی ذات مقید تھی۔ ہلکے پھلکے انداز میں ہر اس لڑکی پر جو خود سے بہتر اور برتر محسوس ہوتی۔

''آہ! انسان کی فطرت جو خاص حالات میں ہی عیاں ہوتی ہے۔'' ندا نے افسوس سے سر جھٹکا۔

وہ بلاشبہ صباحت آپی ہی تھیں۔ اپنے تراشیدہ بالوں پر ہاتھ پھیرتیں۔ لیکن انسان کی فطرت موقع کی تلاش میں رہتی ہے اور اپنا اصل دکھا کر رہتی ہے۔ عثمان بھائی ان کے شوہر آزاد خیال..... کردار۔ ہلکے اور نظر باز تھے۔

جب عثمان بھائی کا رشتہ آیا تو پپا اپنے کزن رشتہ بھی لائے تھے جو گورنمنٹ جاب کرنے وا۔ مڈل کلاس تھے۔

''صباحت اپنے جیسے شریف لوگوں میں جا۔ گی۔ شریف لڑکا ہے۔'' امی اور پپا مسلسل قا کر رہے تھے۔ خالہ خاموش اور کھوئی کھوئی سی لگتیں آخر خالہ نے فیصلہ عثمان بھائی کے حق میں کیا..... کسی سہیلی کی وساطت سے آیا تھا اور جواز یہ رکھا پپا کے کزن کا قد بہت کم ہے۔ صباحت کی آنکھوں چمک اور لہجے کی کھنک نے باور کروا دیا تھا کہ یہ فیصلہ ان کا ''اپنا'' تھا۔

اپنی شادی پر صباحت آپی روایتی دلہن بجائے سر اٹھا کر بیٹھی تھیں۔ جیسے سب کے تاثرات جائزہ لے رہی ہوں۔ شادی کے فوراً بعد اپنی بدل دی تھی۔

ندا کو افسوس ہو رہا تھا کہ بظاہر سوبر، سمجھ صباحت آپی نے پیتل کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن ان کا ملمع بھی اتر گیا۔

☆

حُمیرا شفیع

سونا چاندی اور دانبا

تیسری دفعہ بھی دستک دینے پر جب کوئی جواب نہ آیا تو شجاعت نے واپسی کے لیے قدم بڑھالیے۔ اچانک سامنے سے گڈو جاگتا ہوا آیا۔

''شجو بھیا! واپس کیوں جارہے ہیں؟ آیئے نا.....'' یہ کہہ کر گڈو نے ایک زوردار لات دروازے کو رسید کی۔ دروازہ شاید کسی اینٹ سے بند کیا گیا

تھا۔ اس کے دونوں پٹ ایک ہی جھٹکے سے کھل گئے۔ سامنے ہی سلمٰی زور شور سے برآمدے میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی فوراً دوپٹہ درست کیا اور دھیرے سے بولی۔

''السلام علیکم! شجاعت بھیا۔ تشریف لائیں۔''

شام کے چار بجے صفائی کا یہ کون سا ٹائم ہے۔ شجاعت نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کوفت سے سوچا۔ سامنے کمرے میں تائی حمیداں پلنگ پر تشریف فرما تھیں۔ شجاعت کو دیکھتے ہی وہ گرم جوشی سے آگے بڑھیں، اس کا حال چال پوچھا اور اپنے پاس ہی بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

شجاعت سعادت مندی سے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی۔ کمرہ صاف ستھرا اور ہر چیز قرینے سے سیٹ تھی۔ مگر نیچے چھوٹی سی چٹائی پر شاپنگ بیگز اور کپڑوں کا ڈھیر رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سلمٰی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی، جس میں ایک گلاس مشروب اور ایک پیالی میں نمکو رکھی تھی۔ اس نے ٹرے شجاعت کے سامنے کی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس تھام لیا۔ ''شکریہ۔''

''سلمٰی! آج کل تم کیا کر رہی ہو؟'' اس نے مسکرا کر دریافت کیا۔

''میں آج کل بی اے فائنل کی تیاری کر رہی ہوں۔'' سلمٰی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور نیجو بھیا میں نے پانچویں میں وظیفہ لیا ہے۔'' ننھا گڈو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے چہکا۔ ''واہ بھئی گڈو! تم نے تو کمال کر دیا۔'' شجاعت نے اس کو پیٹھ تھپکتے ہوئے داد دی۔

تائی حمیداں اس سے باقی گھر والوں کا حال چال دریافت کرنے لگیں۔ وہ چونکہ پچھلے سال سے مسقط میں تھا۔ اس لیے جب سال دو سال بعد پاکستان کا چکر لگاتا تو تمام رشتے داروں کے ہاں ملنے ملانے ضرور جاتا۔ پچھلی دفعہ جب وہ آیا تھا تو آتے ہی ڈینگی بخار نے گھیر لیا۔ واپس جانے کے دن تک وہ بامشکل صحت یاب ہو پایا۔ اس لیے کہیں بھی نہیں جا پایا۔ مگر اس دفعہ اس نے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ تمام عزیزوں سے ضرور مل کر آئے گا۔

تائی حمیداں کا گھر اس کے لیے اس وجہ سے بھی زیادہ مانوس تھا کیونکہ سارا بچپن اس نے ان کے آنگن میں گلی ڈنڈا اور آنکھ مچولی کھیلتے گزارا تھا۔ سلمٰی سے بڑے آفاق بھائی کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ پھر اچانک ایک حادثے میں آفاق اللہ کو پیارے ہو گئے تو اسی آنگن سے اس کو بے حد خوف آنے لگا۔ اس نے تائی حمیداں کے گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ آہستہ آہستہ اس کیفیت میں کمی آتی گئی اسی دوران اس کی مسقط میں جاب ہو گئی۔

اس نے سر ہلا کر تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا اور تائی حمیداں کی طرف متوجہ ہوا جو اس سے وہاں کے حالات اور نوکری کی بابت دریافت کر رہی تھیں۔ نیچے چٹائی پر سلمٰی اور گڈو بیٹھے کپڑوں کو شاپنگ بیگز میں سیٹ کر رہے تھے۔

''آج آپ لوگوں نے اتنی ڈھیر ساری خریداری کر لی ہے!'' اس نے حیرت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ارے نہیں بیٹا! یہ تو ہم لوگ اجرت پر پیک کرتے ہیں۔ کچھ اضافی آمدنی ہو جاتی ہے۔'' تائی حمیدان نے ہچکچاتے ہوئے بے حد پست آواز میں بتایا۔

اس کو حیرت اور صدمے نے کنگ کر دیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ تائی حمیداں کے حالات کچھ خراب ہیں کیونکہ ایک عرصے سے ان کی زمینوں کا مقدمہ چل رہا تھا مگر اتنے زیادہ خراب ہیں۔ یہ وہ ہرگز نہیں جانتا تھا۔ اس کو اپنی بے خبری اور بے حسی پر سخت غصہ آیا۔

نائی حمیداں نے اس کو کھانے پر روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

ابھی اپریل کا وسط تھا مگر گرمی اور دھوپ میں اچھی خاصی شدت تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے جو چند ایک ٹنڈ منڈ درخت تھے وہ ناکافی سایہ فراہم کررہے تھے۔ وہ پچھلے چالیس منٹ سے شہر جانے والی بس کا انتظار کررہی تھی۔ یہ کوٹ باغاں والی کا بے رونق سا اسٹاپ تھا۔ چند ماہ پہلے یہاں کے واحد مائی اسکول میں اس کی تقرری بطور لیب اسٹنٹ ہوئی تھی۔

اسکول میں اس سمیت کل پانچ خواتین ملازم تھیں۔ جن میں سے تین تو اسی گاؤں کی رہائشی تھیں۔ ایک قریبی گاؤں سے آتی تھی۔ سب سے زیادہ فاصلے پر اسی کا گھر تھا۔ اور نوکری سے زیادہ اس آنے جانے کی مشقت نے اس کو نڈھال کررکھا تھا۔ اگرچہ رکشے وغیرہ کی سہولت سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا اور وہ کبھی کبھار ایسا کر بھی لیتی تھی۔ مگر روز روز رکشہ افورڈ نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ اگر ایسا کرتی تو پھر اس کا کرایہ اس کی ماہانہ تنخواہ کے نصف سے ہی زیادہ بنتا جبکہ فی الحال وہ اتنی عیاشی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔

خدا خدا کرکے بس کی آمد ہوئی۔ وہ اپنا سیاہ عبایا سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی اور بس میں سوار ہوگئی۔ آج چونکہ جمعہ تھا اس لیے بس میں رش بہت کم تھا۔ کیونکہ جمعہ کے روز بازار بند ہوتے تھے اس لیے گاؤں کے بہت کم لوگ شہر جانے کے لیے نکلتے تھے۔ ورنہ عام دنوں میں بامشکل ہی سیٹ ملتی تھی۔

آج سے ایک ڈیڑھ سال پہلے زندگی اتنی مشکل نہ تھی۔ وہ اپنی دو عدد چھوٹی بہنوں اور اماں ابا کے ہمراہ ایک سادہ مگر پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ ابا جان ایک پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ تینوں بہنیں زیر تعلیم تھیں۔

جس دن وہ بی اے فائنل کا آخری پیپر دے کر گھر لوٹی تو سامنے صحن کے بیچوں بیچ ابا کا بے جان لاشہ پڑا تھا۔ وہ اسکول میں ہی چکرا کر گرے تھے اور پھر کسی بھی طبی امداد ملنے سے پہلے ہی اس جہان فانی سے کوچ کرگئے۔ وہ اماں اور دونوں بہنوں کے ساتھ کئی دنوں تک صدمے سے بت بنی رہی۔ مستقبل ایک سوالیہ نشان کی طرح سامنے کھڑا تھا۔ پھر پتا نہیں کس طرح ان سب نے مل کر ایک دوسرے کو سنبھالا اور ایک دوسرے کے سہارے سے زندگی کا سفر شروع کیا۔ مالک مکان اچھے لوگ تھے۔ ابا جان کے گزر جانے کے بعد انہوں نے کئی ماہ کا کرایہ نہ لیا پھر اس کو ابا جان کے محکمے میں ہی ملازمت مل گئی۔

بس ایک جھٹکے سے رکی تو وہ اپنی سوچوں کے گرداب سے باہر آتے ہوئے اترنے لگی۔ لمبی پتلی گلی سے گزرتے ہوئے اس کا سامنا شجاعت سے ہوا۔ وہ اس کے مالک مکان کا بیٹا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی شرافت اور متانت کی قائل تھی۔ ایک ہی گھر کے دو پورشن میں اوپر نیچے رہتے ہوئے بھی کبھی سوائے ایک آدھ جملے کے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر یوں براہ راست سلام دعا کا تو قطعی رواج نہ تھا اس لیے دونوں اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے پاس سے گزر گئے۔

☆☆☆

جونہی شجاعت میں داخل ہوا تو سامنے ہی برآمدے میں اس کی ماموں زاد نائلہ اور چھوٹی بہن حمنہ سر جوڑے گفتگو میں مصروف تھیں۔

''کیا بتاؤں حمنہ! پتا نہیں کس طرح تیل کے چھینٹے اڑ کر میرے سوٹ پر پڑے اور تین ہزار کا سوٹ غارت ہوگیا۔'' نائلہ نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

''زیادہ پریشان نہ ہو کسی اچھے ڈرائی کلین والے کو دکھا کر دیکھ لو'' حمنہ نے ہمدردی سے مشورہ دیا۔

''آپی کی شادی سر پر ہے اور میرے دو دو پٹے ابھی تک رنگ ساز کے پاس ہیں، سینڈل میچ ہونی باقی ہیں۔'' حمنہ نے بھی اپنا دکھڑا رویا۔

''جو بھی سوٹ دل سے بناؤں۔ اسی کے ساتھ ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔'' نائلہ نے غمگین لہجے میں بتایا۔

''کیا ہو رہا ہے لڑکیوں! کیوں پریشان ہو؟'' شجاعت نے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بتائیں شجاعت بھائی! بس ٹینشن ہی ٹینشن ہے۔ ہمارے کپڑے جوتے سب ادھورے ہیں۔'' نائلہ نے اپنی نازک سی ناک چڑھا کر کہا۔

''تم لوگ اتنی چھوٹی سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔ خیر یہ بتاؤ کہ اماں جان کدھر ہیں؟'' اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ پچھلے کمرے میں موجود ہیں۔ اور تھوڑی دیر پہلے آپ کو ہی یاد کر رہی تھیں۔'' حمنہ نے اطلاع دی۔

شجاعت جب پچھلے کمرے میں داخل ہوا تو اماں کافی سامان پھیلائے بیٹھی تھیں۔ ایک طرف زیورات کے ڈبے بکھرے تھے اور دوسری طرف چمکتے دمکتے ملبوسات پلنگ پر قرینے سے رکھے تھے۔ اماں نہایت احتیاط سے سب کچھ سمیٹ رہی تھیں۔ اس کو آتا دیکھ کر شفقت سے مسکرائیں۔

''دیکھو! شجاعت! عالیہ کی شادی قریب ہے اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ سمدھن کے سوٹ لانے ہیں۔ سو طرح کے اور بھی کام ہیں۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے کام بتائیں۔ میں آج کل فارغ ہوں۔'' شجاعت نے پرخلوص پیشکش کی۔ ''جیتے رہو بیٹا! تم خود سال دو سال بعد تھکے ہارے نوکری سے آتے ہو۔ چند دن آرام کر لو۔'' اماں نے ممتا بھری فکرمندی سے کہا۔

''اور ہاں عالیہ کی شادی کے بعد میں تمہارے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہوں خاندان اور خاندان سے باہر کتنے ہی لوگ ہیں۔ اگر تمہارا جھکاؤ کسی طرف ہے تو بلا جھجک بتا دو۔ میں تمہارے انتخاب کو ہی ترجیح دوں گی۔'' اماں نے دوستانہ انا میں کہا۔

شجاعت نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈا سامنے ہی زیورات کے ڈبے کھلے نظر آئے۔ سو چاندی، اور مصنوعی زیورات جگمگا رہے تھے اور د والے کی نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ زیورات سو کے بھی تھے چاندی کے بھی اور کچھ مصنوعی بھی سونے چاندی سے بھی زیادہ پرکشش لگ رہے تھے

شجاعت نے ان زیورات کی چمک کو آنکھ میں سموتے ہوئے سوچا کہ انسان بھی تو ان زیورا کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ سونے جیسے، چاندی جیسے یا پھر بالکل مصنوعی، اس کی نظروں کے سا ثریا اور تائی حمیداں کے محنت کش چہرے لہرائے اپنی عزت نفس کو کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھالے رات مشقت کی چکی میں پستے ہیں اور ساتھ ہی اس سے تھکی ہاری واپس آئی سیاہ عبایا میں ملبوس لڑ سراپا بھی جو تن تنہا اپنی اور اپنے خاندان کی بقا کی جـ لڑ رہی تھی۔

اس کے خیال کی پرواز حمنہ اور نائلہ تک بھ جو انتہائی معمولی باتوں پر پریشان تھیں۔ جن کو کبھی ہوا نے بھی نہ چھوا تھا۔ وہ ''ٹینشن'' کا لفظ اتنی تکلفی سے استعمال کرتی تھیں حالانکہ ان کو ''ٹینش کے معنی بھی معلوم نہیں تھے ان کو تو حقیقت میں پتا نہیں تھا کہ ٹینشن کہتے کسے ہیں۔

☆☆☆

یہ قدرت کی تقسیم ہے۔ کسی کے لیے ز آزمائش اور کسی کے لیے کم۔ ان آزمائشوں سے گز رہی انسان سونا، چاندی، پیتل اور تانبا بنتے ہیں۔ اور سے بھی بڑی آزمائش ان کا انتخاب یہ۔ اب انسا مرضی ہے کہ وہ اپنے لیے سونا چنے، چاندی یا پھ انتخاب کا حق اس کا اپنا ہے۔ اور بہترین انتخاب ا ذہانت اور قسمت دونوں سے ملتا ہے۔

☆

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اورکہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ　　ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن　　عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

حسنہ حسین

عمر لاحاصل کا حاصل

''جنت خدا کے لیے۔''

ڈریسنگ ٹیبل کا سامان بکھر گیا۔ دیوار گیر الماری کے شیشے جھما کے سے ٹوٹ گئے۔ کانچ کا گل دان جو شدید نفرت اور انتقام سے فرش پر پھینکا گیا تھا، اس کے ٹکڑے یہاں وہاں بکھر گئے تھے۔

''جنت!!! ..... جنت ایسے نہ کرو..... جنت نہیں!! جنت میرا بچہ.....!! جنت خدا کے لیے۔''

اک تڑپ..... اک پکار..... اک التجا.....

اس نے پلکیں جھپکا کر دیکھا۔ منظر ایک لحظے کے لیے دھندلا ہوا تھا۔ شاید آنکھوں کی نمی بڑھی تھی۔ شاید روشنی ہی مدھم پڑی تھی۔

''برہان! برہان مجھے بچالیں۔''

دل خراش چیخ کے ساتھ ہی اس کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی تھی۔

بیڈ کراؤن کے ساتھ لگا اپنا سر اٹھاتے ہو۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ داہنا ہاتھ بے سا: مقام قلب پر آن ٹھہرا تھا۔

مقام قلب..... مقام ''الم'' تھا۔ مقام الم.. مقام ''ابتلاء''۔

تنفس بھاری، حلق خشک اور خوف کے آ شکنجے میں جکڑا دماغ ماؤف!

نائٹ اسٹینڈ کی زرکار روشنی میں، کام دار عرو جوڑے کے دامن پر نظر پڑتے ہی وہ اپنے خوا کے اثر سے باہر آ گئی۔ بے ساختہ سر اٹھا کر اس۔ متوحش نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔

سفید اور سیاہ رنگ کی تھیم میں خوب صورت ا نفاست سے سجے، ایک وسیع و عریض بیڈ روم میں جہازی سائز بیڈ پر گولڈن برائیڈل ڈریس میں ملبو بیٹھی تھی۔

مکمل ناول

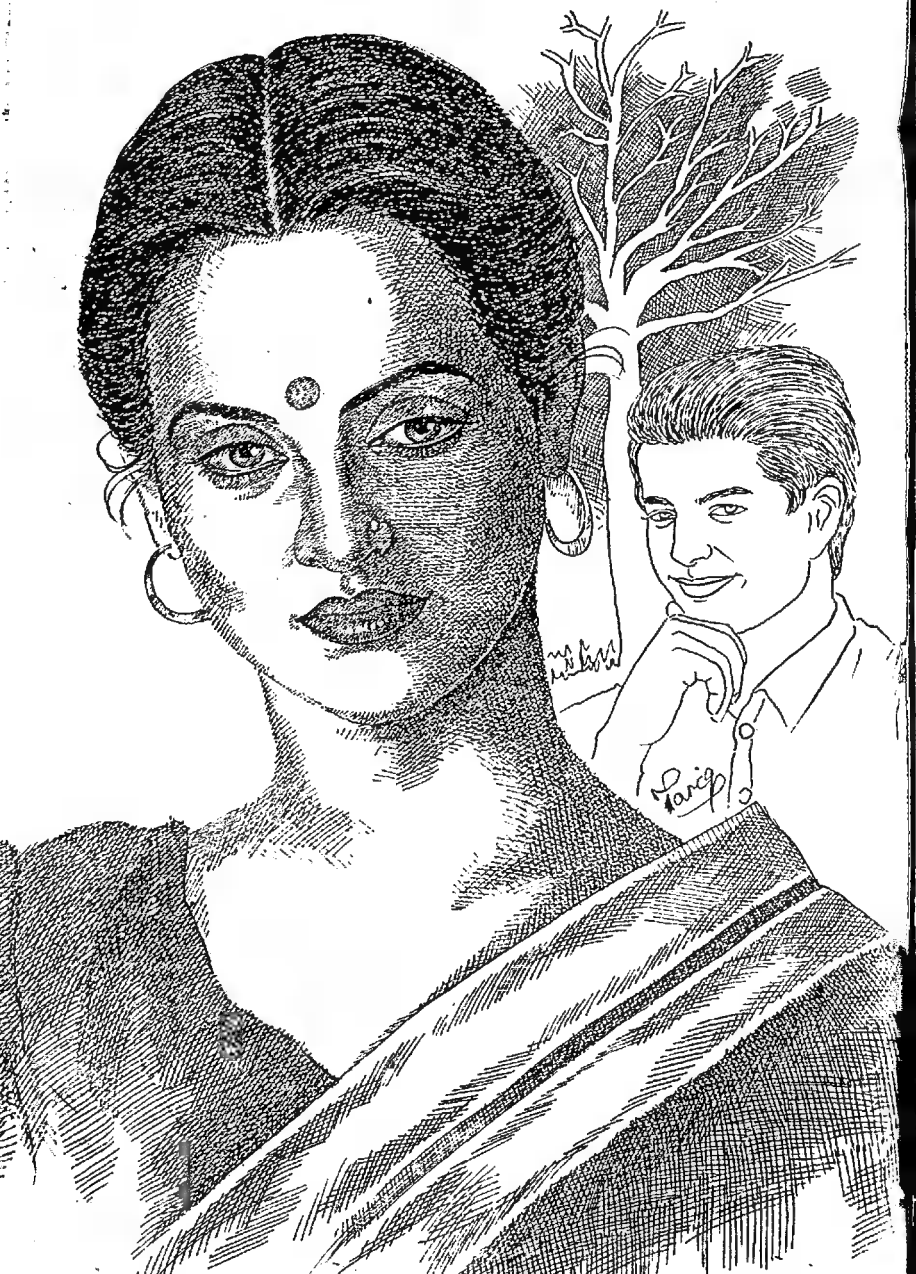

یہ گھر اس کا نہیں تھا۔ یہ کمرہ بھی اس کا نہیں تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں چند گھنٹے پہلے نکاح اور پھر رخصتی کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔

خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے عروسی جوڑے کا دامن اپنے ہاتھوں میں سنبھال کر وہ بیڈ سے اتر گئی۔ چوڑیاں کھنک اٹھیں، بندیا متحرک ہوئی، سونے کے نفیس آویزے اس کی صراحی نما گردن پر آگے پیچھے جھول جھول گئے۔ وہ انسان ہو کر ساکت تھی۔ لاکھوں کی جیولری بے جان ہو کر متحرک۔

کپکپاتی انگلیوں سے دروازہ کھول کر وہ کچھ خوف، کچھ گھبراہٹ کے ساتھ باہر آگئی۔ ماسٹر بیڈروم کی دائیں سمت، عین سامنے گول زینہ تھا جو نیچے کی طرف جاتا تھا۔ اسی زینے کی ابتدائی سیڑھیوں پر وہ اسے بیٹھا دکھائی دے گیا تھا۔

جنت کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے جیسے تھم سی گئی تھی۔

سر گرا ہوا، کندھے جھکے ہوئے، اور مٹھیاں اس سختی سے بھنچی ہوئیں جیسے وہ ضبط کے آخری مراحل سے گزر رہا ہو۔

دوران سفر اس کا موڈ خوش گوار نہیں تھا، وہ جانتی تھی۔ نکاح کے وقت بھی اس کے تیور ٹھیک نہیں تھے، وہ یہ بھی جانتی تھی۔

''بڑے عجیب ہیں یہ فارس بھائی۔'' سدرہ نے خاص طور پر نوٹس کیا تھا۔ ''نکاح کے پیپر پر ایسے سائن کر رہے تھے جیسے.....'' کچھ کہتے کہتے وہ یکا یک خاموش ہو گئی تھی۔

''جیسے.....؟'' اس نے گھنیری پلکوں کی جھالر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''جیسے..... کچھ نہیں۔'' لبوں پر مسکراہٹ سجا کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اور وہ ادھوری بات جیسے اب مکمل ہونے کو تھی۔

خود پر طاری اس جمود کو توڑتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کی طرف مڑا تھا۔ اس کی تیکھی گہری آنکھوں میں غیض و غضب کا بڑھتا ہوا تاثر جنت بنت کمال کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا گیا۔

''تم نے ابھی تک چینج نہیں کیا؟'' بھاری گمبھیر آواز، پتھریلا سخت لہجہ۔

لہنگے کا فال سنبھالے جنت کی مخروطی انگلیوں کی گرفت اتنی مضبوط ہوئی کہ موتی اور نگینے ہتھیلیوں میں چبھنے لگے۔

''یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جنت کمال! یہ صرف کاغذ تک محدود رہے گا۔'' ایک ایک لفظ نفرت سے ادا کرتے ہوئے اس کے اور اپنے مابین چند قدموں کے فاصلے کو اس نے ایک ہی لمحے میں پاٹ لیا تھا۔

''کاغذی رشتہ.....'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''می کو ایک بہو چاہیے تھی۔ صرف ایک بہو! بازو سے پکڑ کر خاصے جارحانہ انداز میں اسے راستے سے ہٹایا گیا۔ ''یہاں صرف بہو بن کر رہو! بیوی بن کر میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش بھولے سے بھی مت کرنا! ورنہ بہت برا کروں گا میں۔''

آنکھوں میں سختی سے دیکھتے ہوئے اس نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی تھی، پھر اسی سرعت سے کمرے میں چلا گیا تھا۔

صدمے سے ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ جنت نے مڑ کر اسے بے یقینی سے دیکھا تھا۔ وہ بہت عزت اور مان سے اسے رخصت کر کے اپنے گھر لایا تھا، وہ اب کچھ نفرت اور حقارت سے بیڈ پر بکھری گلاب کی پتیوں کو ہٹا رہا تھا۔ پھول بیلوں سے نوچ کھسوٹ کر پھینک رہا تھا۔ تازہ گلاب کے ہار اس نے فرش پر دے مارے تھے۔

وہ مشتعل تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کمرے کی ایک ایک چیز تہس نہس کر دے۔ آگ لگا دے۔ سب تباہ کر دے۔

جنت کی شہد آنکھوں میں ارمانوں کا خون ہو گیا۔ کپکپاتے لبوں پر سکوت ٹھہر گیا۔ وہ سراپا حیرت بنی آنکھوں میں حیرت، صدمہ اور بے یقینی لیے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

مغربی دیوار پر وکٹورین طرز کا اک آئینہ ایستادہ تھا۔ جو اس کا عکس خود میں سمائے پوشیدہ حقیقت کو اس کے چہرے پر لے آیا تھا۔ حقیقت..... سچائی کا روپ دھارے ایک بددعا تھی جو اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ یہاں تک۔

گھر چھوڑنے سے، شہر بدلنے سے، نئے رشتے بنانے سے اس کا نصیب نہیں بدلا تھا۔ نفرت اور دھتکار اب بھی اس کا مقدر رہی تھی۔ لعنت پھٹکار اب بھی اس کا نصیب ٹھہری تھی۔

''گیٹ لاسٹ۔'' دانت پیس کر، مٹھیاں بھینچ کر اس نے حکم دیا تھا۔ مگر وہ پتھر ہوئی کھڑی تھی۔

ذرا سا ارتعاش بھی اس کے وجود میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

''آئی سیڈ گیٹ لاسٹ ڈیم اٹ۔'' اب کی بار وہ حلق کے بل دھاڑا تھا۔

بھاری کامدار لباس کا پھیلا ہوا گھیرا دودھیائی ہتھیلیوں میں سنبھالے وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دروازہ عین اس کے منہ پر بند ہوا تھا، کھٹاک کی آواز کے ساتھ مقفل بھی ہوا۔ ایک ایک کر کے خوش گمانی کے تمام دیئے بجھ گئے۔ ایک ایک کر کے ساری امیدیں خاک ہوگئیں۔

''ہمیشہ اچھا سوچنا! سب اچھا ہوگا۔''

اس نے اچھا سوچا تھا مگر اچھا نہ ہوا تھا۔

''ہر ''عسر'' کے ساتھ ''یسرا'' ہے۔''

اور اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے..... ہر طرف عسر ہی عسر تھا۔ مشکل ہی مشکل..... آزمائش ہی آزمائش..... محرومی ہی محرومی..... سزا ہی سزا.....

وہ الٹے قدم پیچھے ہوتی گئی یہاں تک کہ دیوار سے جا لگی۔

راہداری کے ایک سرے پر سیڑھیاں تھیں تو دوسرے سرے پر چھوٹا سا لاؤنج۔ جس کی دیوار گیر کھڑکیوں سے پورا چاند نظر آرہا تھا۔

''تم نے ماہین کے ساتھ جو کیا ہے جنت! خدا تمہیں اس کی وہ سزا دے گا جو تم ساری عمر یاد رکھو گی۔''

سسکیاں سینے میں مچل گئیں۔ آنسو پلکوں پر لرز گئے۔

''ساری زندگی تم نے امی کو دکھ دیے ہیں۔ ساری عمر تم ان کے لیے عذاب بنی رہی ہو۔'' سینے میں درد اٹھا۔ تنفس بھاری ہونے لگا۔ نگاہ بند دروازے پر ٹھہر گئی۔

''ایسی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔'' لفظ نشتر تھے، روح گھائل ہوئی تھی۔

بمشکل قدم اٹھاتے اس نے لاؤنج کا رخ کیا تھا۔ پوری تاریخوں کے منور چاند کے سامنے وہ بے نور کرسٹل فانوس کے نیچے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اب وہ ایک ایک کر کے پنیں نکال رہی تھی۔ شور اب بھی تھا، آوازیں اب بھی گونج رہی تھی۔

وہ سر سے دوپٹہ اتار کر اپنے ہیئر اسٹائل کے بل کھولنے لگی۔ ہیئر اسپرے سے بال اکڑے ہوئے تھے۔ بمشکل سیدھے ہو پائے۔ اس نے پھر کانوں کے آویزے اتارے۔ گلے کو نیکلس کی گرفت سے آزاد کیا۔ بندیا اتار کر میز پر رکھی۔

''انہیں مت اتارو جنت! ابھی جی بھر کر دیکھنے دو مجھے۔''

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے اس نے لب بھینچ کر خیالات کو جھٹکنا چاہا... افکار کو بھٹکانا چاہا مگر ناکام رہی۔ آج کی رات کچھ بھی اس کے ذہن سے محو ہونے والا نہیں تھا۔ رہ رہ کر ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ، ایک ایک ساعت یاد آرہی تھی اسے۔

''خدا تمہیں اس کی وہ سزا دے گا جو تم ساری عمر یاد رکھو گی۔''

''سزا'' پلکوں کی دیواروں میں شگاف ڈالتے چند آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

''یہ بھی برہان کا احسان ہے کہ اس نے تم پر کیس نہیں کیا ورنہ سوچو! وہ کیا نہیں کر سکتا تھا۔''

ہاں تم سوچو!!!

اب تم سوچو!!

آج تم سوچو!!

کمرے کی ہر اک شے آواز بن گئی۔ قلب و جان کو آزار کر گئی۔

بددعا.....! بددعا.....! کھڑکیوں سے سرد ہوائیں سرسرا کر گزر رہی تھیں۔

سزا.....! جزا.....! لان میں آسٹر اور آرکٹوٹس کے بے شمار پھولوں سے ہوتی ہوئی صدا بیرونی دیواروں کے اس پار، سڑک پر جھکے املتاس کے درختوں پر ٹھہر گئی تھی۔

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارے جنت نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ آج کی رات ایک مشکل رات تھی اس کے لیے۔ اور اس کے لیے بھی جو بند کمرے میں اپنا سر تھامے خاموش بیٹھا تھا۔

☆☆☆

دیوار گیر کھڑکیوں سے جھانکتے سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پڑیں تو اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ آفتاب کا نور۔ اس کے اندر نہیں گیا تھا۔ غاروں کی طرح کچھ تاریکیاں اس کے وجود کا بھی حصہ تھیں۔

اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے شانوں پر آگے پیچھے بکھرے شہد رنگ کے بالوں کو سمیٹ کر داہنے کندھے پر ڈال دیا تھا۔ چہرہ ستا ہوا تھا، بے خوابی کا شکار سرخ و متورم آنکھوں میں نمی ٹھہری تھی۔ فرش پر قدم جماتے ہوئے اس نے بے خیالی میں سر اٹھایا تھا اور اگلے ہی لمحے اپنی جگہ گھم کر رہ گئی تھی۔

سیاہ جینز پر آسمانی رنگ کی شرٹ میں ملبوس وہ سنگل صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے خاصے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ دھوپ میں لائٹ براؤن ساشیڈ دیتے گھنے سیاہ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ رگیں تنی ہوئیں، جبڑے بھنچے ہوئے اور گہری ہیزل آنکھوں میں تو جیسے خون اترا ہوا تھا۔ اس نے داہنے ہاتھ میں ایک کتاب اٹھا رکھی تھی۔ سرد نگاہوں سے مطالعہ جاری تھا۔

جنت کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی، سانس تو پہلے سے رکا ہوا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح، اتنے سویرے وہ اس کے سامنے بیٹھا ہوگا۔ وہ تاخیر سے بیدار ہونے پر از خود شرمندہ ہوگئی۔

''کل رات جو کچھ ہوا اس کی بھنک ممی کو نہیں پڑنی چاہیے۔'' کتاب بند ہو چکی تھی بالکل دروازے کی طرح..... اب وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بے پروائی سے جیبوں میں ہاتھ ڈالے جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔

جنت نے بے ساختہ نگاہ اٹھائی تھی۔

فارس وجدان شیرازی! شیرازی انٹر پرائزز کا سی ای او!!

دراز قامت، چوڑے شانے اور ورزشی جسامت کا مالک ایک خوب صورت نوجوان۔ جو گول زینہ اترتا اب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ مگر اس کے قدموں کی آہٹ تھی کہ راہداری میں ہی ٹھہر گئی تھی۔ بند دروازے کی آواز بھی وہیں کہیں بھٹک رہی تھی۔ تلخ رویہ، سخت لہجہ اور نکاح کی حیثیت کی وضاحت کرتے بے رحم الفاظ متحرک ہوئے تھے پلٹ پلٹ کر اس پر وار کرنے لگے تھے۔ اور ساکت و صامت اپنے ٹوٹے بکھرے وجود سے لاپروا کچھ خوف، کچھ بے چارگی اور کچھ الجھن سے نصیب اور قسمت کی ان بھول بھلیوں کو دیکھنے لگی تھی جو ہر بار، ہمیشہ اسے ایک ہی مقام پر لے آتی تھیں

وہ مقام جس کا تعین کئی برس پہلے پتی ہو ایک دوپہر میں ہوا تھا۔ وہ مقام جو آگ کی طرح تھ سلگا سلگا کر راکھ کرتا تھا۔ پھر خاک کر دیتا تھا۔

وہ پیروں تلے روندی جانے والی اسی مٹی ایک بار پھر جنم لیتی تھی۔ ہر بار اس امید کے ساتھ کہ ا کچھ مختلف ہوگا۔ ہر بار اس یقین کے ساتھ کہ اب قبولی جائے گی۔ مگر ہر بار وہی ہوتا جس کی توقع ہوتی۔ ہر بار وہی ملتا جس کی چاہت نہ ہوتی۔

ایک مدھم سی مسکان اس کے سخت سے بھنچے لبو کو نرم کر گئی۔ پھر وہ ہنس دی۔ یونہی اچانک.. وجہ..... بلاسبب.....

وجدان ہاؤس کے در و دیوار میں اس کی ہنسی

جھنکاریوں گونجی جیسے کوئی ضبط کرتے کرتے اچانک رو پڑا ہو۔

☆☆☆

نکاح اور رخصتی جتنی سادگی سے ہوئی تھی، ولیمہ کی تقریب اتنے ہی شاندار طریقے سے منعقد کی گئی تھی۔

دولہا کے ہمراہ جب وہ اسٹیج پر آئی تو ہر ایک کی نگاہ میں ستائش ٹھہر گئی تھی۔ فارس وجدان اگر اپنی وجاہتوں میں بے مثال تھا تو جنت بنت کمال بھی اپنی پراعتماد شخصیت اور پرکشش نقوش کے باعث باکمال نظر آرہی تھی۔ اس کی شہد آنکھیں روشن اور کومل چہرہ منور تھا۔ گلاب کی نرم پنکھڑیوں جیسے لبوں پر مدھم سا تبسم ٹھہرا تھا۔ اس کے تاثرات مصنوعی نہ لگتے تھے۔ نہ ہی انداز میں بناوٹ نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے واقعتاً محبت کرنے والا رفیق حیات مل گیا ہو۔

رفیق حیات بھی ایسا جو اپنی آن بان میں شہزادوں جیسا ہو۔ نام کی لمرح میدان حیات کا کوئی شہسوار نظر آتا ہو! مگر وہ شہسوار..... شریک حیات بن کر زبان کی دو دھاری تلوار سے احساسات اور جذبات کو قتل کرنے والا بھی ہو تو۔۔۔

اس کا ذہن پھر سے بھٹکا تھا۔ سوچ اور خیالات پھر سے منتشر ہوئے تھے۔ اور اس نے ایک بار پھر وائٹ کلچ پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے اپنی کیفیت پر قابو پالیا تھا۔

سفید اور سرخ پھولوں سے ڈیکوریٹ کیے گئے خوب صورت ہال میں یہاں وہاں دیکھتے، پہلو میں بیٹھے فارس وجدان کے بلیک تھری پیس سوٹ سے اٹھتی مردانہ کلون کی خوشبو محسوس کرتے، وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دبانے کی سعی کررہی تھی۔

''تم خوش تو ہو نا جنت۔'' برابر میں بیٹھی سائرہ خالہ نے بہت محبت اور مان سے پوچھا تھا۔ جنت نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا، وہ جس احساس کے بارے میں استفسار کررہی تھیں وہ اس کے آس پاس، اس کے اندر، اس کے دل میں کہیں بھی نہ تھا۔ مگر وہ اس بار صحیح معنوں میں ان کے لیے مبہم رہنا چاہتی تھی۔ راز ہونا چاہتی تھی۔ وہ انہیں اور ان کی فیملی کے ایک ایک فرد کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ اسے اپنی ''جنت'' مل چکی، سزائیں ختم ہوئیں، وہ جہنم سے باہر گئی۔

''بہت۔'' اس نے کہا تھا۔ اس کی آواز کھوکھلی تھی۔ مگر لبوں پر ابھرتی خوب صورت مسکراہٹ ہر اذیت چھپا گئی تھی۔ آنکھیں بھی کمال کی اداکاری کرتی تھیں، تکلیف دہ تبسم میں ڈھل کر اس کے چہرے کو پرکشش بنا گئیں۔ سائرہ خالہ نے اس کے کندھوں پر بازو ڈالتے ہوئے اپنے قریب کرکے پیشانی کا بوسہ لے ڈالا۔ وہ اب بہت خوش اور مطمئن نظر آرہی تھیں۔ شیرازی خاندان کے ساتھ یہ رشتہ ان کی توسط سے سرانجام پایا تھا۔ یہ شادی بھی ان کی وجہ سے ممکن ہو پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جنت انہیں سکون بھری اس کیفیت سے محروم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لب بھینچ کر اور پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کو روکتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو نگاہیں مسز شیرازی سے ٹکرا گئیں۔

کامدار میرون ساڑھی میں بلبوس، لائٹ سا میک اپ کیے وہ الیکٹرانک وہیل چیئر پر براجمان تھیں۔ چہرہ نکھرا نکھرا سا تر و تازہ لگ رہا تھا۔ سیاہ آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرا رہی تھی۔ لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ سجی تھی گو کہ ہارٹ پیشنٹ تھیں، فالج کے باعث ٹانگوں سے بھی معذور مگر اپنے بیٹے کی شادی پر وہ بہت صحت مند، ہشاش بشاش اور خوش نظر آرہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرائیں تو جنت بھی مسکرا دی اور کوئی بھی دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ اس عورت کے لیے کتنے دل سے مسکرائی تھی۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا دھرتی پر پھیل چکا تھا۔ دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔ پندرہویں کا پورا چاند اس کے عقب میں تھا۔

وہ کچھ دیر پہلے مسز شیرازی کے ہمراہ گھر پہنچی تھی اور اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کچھ بے دردی اور جھنجلاہٹ سے اپنی جیولری اتار رہی تھی۔ آنکھوں

میں نمی تھی، چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔
ولیمہ ریسپشن کے دوران وہ کتنی پراعتماد رہی تھی اور اب جب تنہائی میسر ہوئی تھی تو کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی.....
''زندگی پھولوں کی سیج کسی کے لیے بھی نہیں ہوتی جنت۔'' مسز شیرازی نے کچھ دیر پہلے اسے اپنے پاس بٹھا کر کہا تھا۔ ''نئے ماحول، نئے رشتوں میں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ وہ وقت تحمل مزاجی کی طلب رکھتا ہے۔ صبر چاہتا ہے۔''
پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر، محبت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔
''دنیا کا سب سے حسین اور شفاف جذبہ محبت کا ہے، اس جذبے میں صلاحیت ہے نفرت کی ہر چٹان کو پاش پاش کر دینے کی۔''
جنت کی آنکھوں میں ایک کرب ٹھہرا تھا۔ وہ اس کی مسکراہٹ سے الجھا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرا تھا۔ گویا مسز شیرازی جانتی تھیں اپنے بیٹے کو..... اچھی طرح سے سمجھتی تھیں اسے.....
''تمہاری فارس سے شادی میری وجہ سے نہیں ہوئی ہے، نہ ہی تمہاری خالہ کی وجہ سے..... یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔''
بات گھوم پھر کر ایک بار پھر اس کے نصیب تک آ گئی تھی۔ ہر بار یہ لفظ اسے ڈرا دیتا تھا۔ ہر بار یہ سچائی اسے تڑپا دیتی تھی۔
اگر اب بھی نصیب ہی یہاں لایا تھا تو.....
وحشت کا سانپ گردن سے لپٹا تھا۔ ذات کے آئینے پر پتھر برسے تھے۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی تھی۔
نصیب!!
الجھے منتشر خیالات کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر آئینے میں اس جنت کو تلاشا جو دلہن تھی، مگر اس کے سامنے جو کھڑی تھی وہ تو کچھ بھی نہ تھی۔
قدموں کی آہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اس کی جھکے اتارتی انگلیاں ساکت ہوئی تھیں۔ بے ساختہ نظر اٹھا کر اس نے آئینے میں فارس کو ہی دیکھا تھا۔
ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا، کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹکاتا اب وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتار رہا تھا۔ رسٹ واچ، کف لنکس اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔ وہ عجلت میں اپنے کام کر رہا تھا اور جنت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پتھر ہوئی، اپنے جھمکوں میں ہی اٹکی کھڑی تھی۔ وہ فارس وجدان کو دیکھ رہی تھی۔ فارس وجدان نے بھولے سے بھی ایک غلط نگاہ اس پر نہیں ڈالی تھی۔
بے ساختہ ہی کوئی منظر ذہن کے پردوں پر لہرایا تھا، یکایک اس کی اذیت بڑھ گئی تھی۔ حال آئینہ بن کر ماضی کا عکس دکھلائے تو اذیت بڑھ ہی جاتی ہے۔
''یہ احساس کتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ آپ موجود ہوں اور کوئی آپ کو ''عدم'' کر دے۔ آپ ماورائی ہو جائیں..... نظر ہی نہ آئیں۔'' کوئی خیال چوٹ بن کر ذہن میں اترا تھا۔ آنکھیں جل اٹھی تھیں۔
کپڑے بدل کر وہ اٹیچڈ باتھ روم سے باہر آ گیا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر پر سفید رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں ملبوس وہ اپنے عام سے حلیے میں بھی جاذب نظر آ رہا تھا۔
اپنے اطراف سے یکسر بے نیاز اس نے کمرے کی لائٹس آف کر دی تھیں۔ اب صرف نیلگوں بلب ہی تھا جو اندھیرے میں مدھم سی روشنی تاثر دے رہا تھا۔
موبائل چارجنگ پر لگائے وہ سونے کے لیٹ چکا تو خود پر طاری اس جمود کو توڑتے ہوئے جنت نے مڑ کر براہ راست اسے دیکھا۔ اب آسرے کا سہارا درکار نہ تھا۔
''یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔''
حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے اس نے اٹیچڈ باتھ روم کا رخ کیا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ کافی تاخیر سے باہر آئی تھی۔ صوفے پر بیٹھ کر روئی روئی سی سرخ و متورم آنکھوں کے ساتھ کچھ

تک وہ اسے ہی دیکھتی رہی تھی۔

نصیب..... سفید شال خود پر پھیلائے وہ سسکتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔ کچھ تھکاوٹ کا اثر تھا اور کچھ گزشتہ شب کی بے خوابی تھی کہ آنکھیں بند کرتے ہی اسے نیند نے آلیا تھا۔ اور ایک بار پھر وہ اس بے رحم رات کے اَن کہی شکنجوں میں جکڑی گئی تھی جو باوجود کوشش کے بھی اس کے ذہن سے نکلتی نہیں تھی۔

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی سائرہ نے سر اٹھا کر اپنے بیٹے کو دیکھا جو نڈھال قدم اٹھاتا ان کے سامنے آکر رک گیا تھا۔ آنکھیں سرخ و متورم سی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سدرہ ایک نظر بھائی پر ڈالتی تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئی تھی مگر سائرہ ایسا نہیں کرسکی تھیں۔

''میں سمجھ رہا تھا اسے سزا مل چکی ہے، مگر اس کی سزا تو جیسے اب شروع ہوئی ہے مما۔''

''عمار۔'' سائرہ کا لہجہ کاٹ دار ہوا تھا۔ آنکھیں غم و غصے سے پھیلی تھیں۔ جنت کا ولیمہ اٹینڈ کرکے ابھی وہ کچھ دیر پہلے ہی لاہور پہنچی تھیں اور ابھی سے عمار کا یہ رویہ اور باتیں انہیں اشتعال دلا گئے تھے۔

''فارس وجدان کی بیوی ہے اب وہ! شیرازی خاندان کی بہو۔'' ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''اسی فارس وجدان کو سدرہ کا رشتہ کیوں نہیں دیا آپ نے؟''

سدرہ نے بے ساختہ مڑ کر اپنے بھائی کو دیکھا۔ دیوانہ تھا وہ جنت کے لیے۔ اب اس کی دیوانگی نے جیسے ہر حد کراس کر لی تھی۔ اپنے بھی اسے اب دشمن نظر آنے لگے تھے۔

''مسز شیرازی نے فارس کے لیے صرف جنت کا ہاتھ مانگا تھا۔'' سائرہ نے تحمل سے ایک بار پھر اپنے بیٹے کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں، اور وہ تھا کہ کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہ تھا۔

''اگر وہ سدرہ کا ہاتھ بھی مانگتیں تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ انکار کر دیتیں۔''

سائرہ نے لب بھینچ کر اپنے بیٹے کو دیکھا۔

''شاید آپ بھول رہی ہیں اس کے متعلق کس طرح کی خبریں گردش کرتی رہی ہیں۔''

''وہ صرف افواہیں تھیں۔ فارس ایسا نہیں ہے۔''

عمار ہنس دیا۔ اس کی ہنسی بھی طنزیہ تھی۔ پیشانی مسلتے ہوئے۔ الجھے بکھرے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے وہ جیسے ضبط کے مراحل پر تھا۔ ''شیرازی خاندان کو دھوکا دے کر آپ کیسے مطمئن ہیں مما میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''عمار۔'' اب کے انہوں نے سخت پتھریلی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ''تمہیں میری بھانجی کے معاملے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اب شادی شدہ ہے۔ بٹھالو یہ بات اپنے دماغ میں کہ وہ اب کسی کی عزت ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے اسے زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس کا ماضی تھا، میں اس کی پرسنل لائف مسز شیرازی کے سامنے کھولنے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی انہوں نے مجھ سے اس حوالے سے کوئی سوال پوچھا تھا۔'' انہوں نے ایک لمحے کا توقف کرتے ہوئے دوبارہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں نے جو بھی فیصلہ کیا ہے، سوچ سمجھ کر کیا ہے، تمہارے دماغ میں یہ جو محبت کا چند روزہ بھوت سوار ہے، یہ اترے گا تو تمہیں سب سمجھ میں آجائے گا۔''

''ہاں! میں تو جیسے بچہ ہوں، پاگل ہوں، ناسمجھ ہوں۔'' زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ شدید غصے کے عالم میں میز کو ٹھوکر مارتا گھر سے نکل گیا تھا۔

سائرہ بے بسی سے اسے جاتا دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

صبح جتنی روشن، صاف اور چمک دار تھی، اس کے اندر کی دنیا اتنی ہی تاریک، ویران اور سنسان سی تھی۔ سرخ رنگ کا قدرے ہلکے کام والا نفیس جوڑا زیب تن کیے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کچھ بے دلی سے اپنے بال بنا رہی تھی جب دروازے پر

دستک ہوئی تھی۔
''کم ان۔'' اس نے ہمت مجتمع کر کے کہا تھا۔
دروازہ کھل گیا۔ ملازمہ سامنے کھڑی تھی۔
''بیگم صاحبہ آپ کا ناشتے پر انتظار کر رہی ہیں۔''
''میں آرہی ہوں۔'' فریش نظر آنے کے لیے لائٹ سا میک اپ کیے، دوپٹہ سلیقے سے سیٹ کر کے وہ نیچے آگئی تھی۔
ڈائننگ ہال میں مسز شیرازی وہیل چیئر پر فارس وجدان کے ہمراہ موجود تھیں۔ انہوں نے براؤن رنگ کا سادہ سا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ سفید رنگ کی بڑی سی شال کندھوں پر تھی۔ میک اپ اور جیلوری سے عاری وہ اس روپ میں بھی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔
ان کی آنکھیں بہت نرم سا تاثر دیتی تھیں اور لبوں پر بکھری شفیق اور مہربان سی مسکراہٹ سیدھا دل میں اترتی تھی۔
''السلام وعلیکم۔''
مشترکہ سلام کر کے وہ بھرپور اعتماد کے ساتھ مسز شیرازی کے پاس آگئی تھی۔ انہیں سلام کیا تھا، ان سے دعا بھی لی تھی اور جب جھکی تھی تو انہوں نے بہت پیار سے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔ پھر انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر میں ہی بٹھالیا تھا۔
فارس وجدان اس کے عین سامنے جھکے سر کے ساتھ اپنے ٹیبلٹ کی اسکرین پر ہیڈ لائنز دیکھ رہا تھا۔ ناشتا شروع کر دیا گیا۔ دیسی اور بدیسی ناشتے کے لوازمات سے سجی ٹیبل سے مختلف ڈشز اٹھا اٹھا کر مسز شیرازی اس کے سامنے رکھنے لگیں۔
جنت نے نظریں اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ ضرور تھا مگر تاثرات سخت پتھریلے نہ تھے۔ مسز شیرازی جب جب اس سے مخاطب ہوتیں، وہ بہت آرام اور تسلی سے مختصر جواب دے کر اپنی نگاہیں ٹیب پر جمالیتا تھا۔
ناشتا کرتے ہوئے اس کے انداز میں عجلت نمایاں تھی جیسے وہ جلد از جلد یہاں سے اٹھ جانا چاہتا ہو۔ مگر مسز شیرازی اسے ایسا کرنے نہیں دے رہی تھیں۔ وہ اسے باتوں میں الجھا رہی تھیں، خبروں سے اس کا ذہن بھٹکا رہی تھیں۔
''تو پھر ہنی مون کے لیے کیا پلان کیا ہے تم دونوں نے؟'' انہوں نے باتوں کے دوران اتنا اچانک پوچھا کہ ٹوسٹ پر جیم لگاتے فارس کے ہاتھ یک دم رک گئے۔ جنت نے سر اٹھایا تو نگاہیں فارس سے دوچار ہوئیں۔ بس ایک لمحے کے لیے..... پھر وہ نظریں جھکا گئی۔
''ابھی کچھ سوچا نہیں اس بارے میں۔'' توقع کے برعکس اس نے بہت محتاط انداز میں جواب دیا تھا۔
''تو پھر سوچ لو! ایک مہینے کا بریک لو اور.....''
فارس نے اپنی ماں کے ہنستے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ اس کی شادی سے وہ کتنی فریش اور صحت مند لگ رہی تھیں۔ جیسے سارے بوجھ ان کے کندھوں سے اتر گئے ہوں۔ جیسے سارے قرض ادا کر دیے گئے ہوں۔
''ہاں کچھ پلان کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دے کر انہیں بھی حیران کر دیا۔ اندر ہی اندر شاید وہ یہ توقع کر رہی تھیں کہ وہ ٹال مٹول سے کام لے گا۔
''خوش رہو۔'' انہوں نے دعا دی۔
''اب میں چلتا ہوں، اپنا خیال رکھیے گا۔'' کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے اس نے مسز شیرازی کی طرف جھک کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا۔
''تم بھی اپنا خیال رکھنا۔''
وہ جانے لگا تو مسز شیرازی کے ساتھ ساتھ جنت کی نگاہوں نے بھی اس کا تعاقب کیا تھا۔
''شادی کے بعد آج اس کا آفس میں پہلا دن ہے، تمہیں اسے سی آف کرنا چاہیے۔''
جنت نے کچھ گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ اٹھالیا۔
وہ اٹھ کر باہر آگئی۔
سامنے ہی وہ سفید پتھروں کی روش پر کھڑا تھا۔ رک کر، مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ نروس ہو کر رک گئی۔

آنکھوں میں اضطراب ٹھہر گیا۔

وہ فارس سے تین چار انچ کی بلندی پر تھی مگر اس کی آنکھوں کے حقارت آمیز تاثر سے جیسے زمین کی تہوں میں اتر کر رہ گئی۔

نفرت، تحقیر، دھتکار! نظروں کے مفہوم جانتی تھی وہ۔ نفرتوں کی پہچان تھی اسے۔ تب ہی اس کا دل کٹا تھا۔ تب ہی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایسے انسان کے سامنے کھڑی تھی جس کی آنکھوں میں انسیت تو دور کی بات اس کے لیے عزت بھی نہ تھی۔

''آنٹی نے کہا تھا کہ.....'' انگلیاں مسلتے ہوئے اس نے اپنی موجودگی کی وضاحت دینا چاہی۔

''کہ کیا.....؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی، لہجہ حتی الامکان سخت ہی رہا۔ ''کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا بیوی بن کر میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش مت کرنا؟'' وہ پھنکارا۔

وہ چپ رہی۔ اعتراض اور شکوے کا اس کے پاس کوئی حق نہ تھا۔

اسے تند ہی سے دیکھتے فارس نے انگلی اٹھائی۔ لفظ ادا کیے بغیر آنکھوں کے تاثر سے ہی وہ اس پر واضح کر گیا تھا کہ آئندہ وہ اسے اپنے پیچھے صدر دروازے میں نظر نہ آئے۔

جنت نچلا لب دانتوں تلے کچلتی، اپنی گیلی آنکھوں کے ساتھ یہاں وہاں دیکھنے لگی۔ اسے بہت رونا آرہا تھا۔ حالانکہ..... یہ رویہ..... یہ دھتکار اور نفرت..... یہ کچھ نیا تو نہ تھا۔

سیاہ شیڈز آنکھوں پر لگائے وہ اسی وقت جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔ ضبط کر کے اس نے آنسو دبا لیے تھے۔

نئی زندگی کا آغاز، بھیانک انجام سے جڑا ہوا تھا، خوف کے آہنی شکنجے میں جکڑی وہ اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

مسز شیرازی اسے وجدان ہاؤس سے متعارف کرواتے ہوئے نچلی منزل پر ہی ہال نما ایک ایسے کمرے میں لے آئیں تھیں جو دیکھنے میں کسی آرٹسٹ کا اسٹوڈیو لگتا تھا۔ واٹر کلر، آئل پینٹ، اکریلک، ہر طرح کی پنسلز، مختلف برشز، کینوس پیپرز، ہیوی کارڈ اسٹاک۔ غرض کے ہر وہ میٹریل موجود تھا جو ایک آرٹسٹ کو اپنی تخلیق کے لیے درکار ہو سکتا تھا۔ اس نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔

قدرتی مناظر کی بے پناہ خوب صورت پینٹنگز دیواروں پر لگی تھیں اور کچھ پیک شدہ حالت میں دیواروں کے پاس ہی رکھی گئی تھیں۔ بیش قیمت پینٹنگز، آرائشی اشیاء، کرسٹل، لکڑی اور مٹی سے بنی منفرد اور مختلف ڈیکوریشن پیس..... جنت ایک ایک چیز اشتیاق کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔

''جب ہم یہاں شفٹ ہوئے تو میرے منع کرنے کے باوجود فارس شیرازی ہاؤس سے یہ سب لے آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا میں اس گھر کو اپنی پینٹنگز سے سجا دوں۔''

جنت نے چونک کر ان طرف دیکھا۔ الیکٹرانک وہیل چیئر پر براجمان وہ اس کے پاس آکر رک گئی تھیں۔ میک اپ سے عاری چہرہ نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔

''آپ..... آپ آرٹسٹ ہیں؟ یہ سب پینٹنگز.....'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''بس شوقیہ رنگوں سے کھیل لیا کرتی تھی۔'' ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

''شوقیہ اور کھیل؟ یہ کسی پروفیشنل آرٹسٹ کا کام ہے آنٹی۔'' جنت سراہے بنا نہ رہ سکی۔ کمال کی آرٹسٹ تھیں مسز شیرازی..... قدرتی مناظر کو دیکھ کر اصلی تصویروں کا گمان ہو رہا تھا۔

مسز شیرازی نے اس کی آنکھوں میں ابھرتے، حیرت، تجسس اور اشتیاق کے ملے جلے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا تھا۔

''ایک وقت تھا جب مجھے لگتا تھا اگر میں پینٹنگ چھوڑ دوں گی تو زندہ نہیں رہوں گی۔''

دیوار پر ہنزہ کی بلند و بالا پہاڑیوں کی تصویر پر

متحرک جنت کی انگلیاں ساکت ہوگئیں۔

''میں نے پینٹنگ چھوڑ بھی دی اور زندہ بھی رہی۔'' انہوں نے کہا۔ جنت نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کو اب بھی ذرا مشکل سے حرکت دے پاتی تھیں۔

''جن سے متعلق ہم یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم ان کے بغیر نہیں رہ پائیں گے، تو وقت اپنے طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ ان کے بنا بھی رہا جا سکتا ہے۔''

وہ سن ہوئی تھی اپنی جگہ۔ بھالا جیسے دل پر لگا تھا۔ وجود ماضی اور حال کے درمیان پینڈولم کی طرح جھولنے لگا تھا۔ اس نے اذیت بھرے احساس کے ساتھ مسز شیرازی کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی کرب کی نمی تھی مگر لبوں پر ایک زندہ مسکان ٹھہری تھی۔

الیکٹرونک چیئر کو متحرک کرتے ہوئے انہوں نے میز پر رکھا آرائشی قلم اٹھا لیا، پاس ہی پتھر پر نصب گھڑی رکھی تھی، لکڑی کا باکس بھی جس کے تختوں پر انتہائی خوبصورتی اور نفاست سے پھول تراشے گئے تھے۔

''وقت بہترین استاد ہے، ''محرومیوں'' کے ساتھ جینا سکھا دیتا ہے۔''

حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے ہوئے اس نے گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر اطراف میں نگاہ دوڑائی تھی۔ وہ اپنا ذہن بھٹکانا چاہ رہی تھی مگر ذہن تھا کہ اس ایک لفظ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

پینٹنگز کے ساتھ ہی سامان سے بھرے کارٹن پڑے تھے۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھ کر کرسٹل کے گل دانوں کو دیکھنے لگی جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ پاس ہی ایک اور باکس پڑا تھا۔ ادھ کھلا ہوا۔ وہ جھک کر اس کارڈ کو دیکھنے لگی جس پر تیسری کلاس کے فارس وجدان کی پہلی پوزیشن اسٹارز اور اسٹیکرز کے درمیان جگمگا رہی تھی۔

''یہ فارس کا سامان ہے، بچپن سے اس کی عادت ہے اپنی ہر ایک چیز کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کی تم یقین نہیں کرو گی اس کے کھلونے بھی نیچے کہیں پڑے ہوں گے، بیج اور سلامت۔'' اپنے بیٹے کے لیے مسز شیرازی کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

جنت نے رزلٹ کارڈ واپس رکھ دیا۔ نیچے ہی پلاسٹک شیٹ میں مرجھائے ہوئے پھولوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ ایک ڈرائنگ پیپر بھی تھا۔ فولڈ کیا ہوا..... اس نے کھول کر دیکھا۔

''گیٹ ویل سون۔'' بچے کی لکھائی میں بڑا بڑا لکھا تھا۔

مسز شیرازی نے ڈور کھینچ کر دیوار گیر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا دیئے تھے، کمرہ مزید روشن ہوا تو دیوار کے پاس گول میز پر سیدھی رکھی فریمڈ پینٹنگز اسے اپنی جانب متوجہ کر گئیں۔

''پرفیکٹ۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ مسز شیرازی نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

سب سے آخر میں زرکار فریم والی بڑی پینٹنگ رکھی تھی، بے حد احتیاط سے اسے سیدھا کیے وہ کچھ مبہوت ہو کر دیکھنے لگی تھی۔

وہ قرآن کی ایک آیت تھی جسے سیاہ پینٹنگ پیپر پر، قدرتی مناظر کی جھلکیوں میں انتہائی خوبصورتی اور مہارت سے لکھا گیا تھا۔

''ان مع العسر یسرا۔''

تمام حروف مختلف مناظر خود میں سموئے ہوئے تھے۔

پھول، آسمان، خزاں رسیدہ درخت، خار دار جھاڑیاں اور ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ، وسیع سبزہ زار۔

العسر لفظ میں خزاں کا منظر تھا۔ نوکیلے سیاہ درخت، کانٹے دار خار جھاڑیاں..... اور اس سے آگے یسرا..... سرسبز پھولوں، ہرے بھرے درختوں اور وسیع سبزہ زار کی جھلک دکھلاتا ہوا۔ مگر یسرا کا الف مختلف تھا..... حجم میں بھی۔ لکھائی میں بھی۔

حرف ''الف'' آسمانی رنگ کا، آسمان کی ہی طرف اٹھا، لہلہاتے بادلوں کی خوبصورت جھلک دکھلا

رہا تھا۔

پوری آیت ایک ہی لکھائی، ایک ہی انداز میں تھی..... آؤٹ لائن بھی ایک ہی رنگ..... مگر الف..... جو آسمان کی جھلک دکھلاتا تھا، وہ سب سے الگ، سب سے نمایاں، سب سے منفرد تھا۔

جنت کافی دیر تک ریلسٹک انداز میں بنائے گئے ان مناظر کو، حروف کے اتار چڑھاؤ اور سیاہ بیک گراونڈ پر سنہری روشنی کی طرح ابھرتی اس آیت کو دیکھتی رہی۔

''میں بھی یہی چاہتی تھی کوئی اسے دیکھے، پھر دوبارہ دیکھے، اور تب تک دیکھتا رہے جب تک اس کا راز نہ پالے۔''

''راز!'' اس نے چونک کر مسز شیرازی کو دیکھا تھا۔ ''کیا آرٹسٹ بھی اپنی پینٹنگز میں راز چھپاتے ہیں؟''

مسز شیرازی مسکرا دیں۔ ''وہ راز میرا نہیں، اس آیت کا ہے! اس آیت میں ہی چھپا ہے۔''

جنت کی آنکھوں میں ایک غیر مفہوم سا تاثر آ کر ٹھہر گیا۔

''قرآن کی ہر آیت ایک ''جواب'' ہے، اس ''سوال'' کا جو انسان کے اندر اٹھتا ہے..... جواب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک سوال سمجھ میں نہ آئے۔'' مسز شیرازی کہہ رہی تھیں۔ ''اب اس آیت کو دیکھ لو۔ یہ بھی ایک سوال کا جواب ہے۔ وہ سوال جو ایک وقت میرے اندر اٹھا تھا اور جواب کسی وجہ سے تمھارے اندر بھی ہوگا۔ کچھ سوال مختلف ہو سکتے ہیں، مگر ان کا جواب ایک ہی ہوتا ہے۔''

نا سمجھی کے عالم میں مسز شیرازی کو دیکھتے جنت کی مضطرب نگاہیں ''عین'' پر آ کر ٹھہر گئیں۔ اس کی تمام تر توجہ اب وہیں تھی۔ خزاں سے مرجھائے ہوئے درختوں اور پتوں پر.....

''آزمائش کی وادیوں میں بھٹکتے ہر انسان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے، ہر مریض کو، ہر سقیم کو، ہر علیل کو۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ فریم پر جنت کی مخروطی انگلیوں کی گرفت یکا یک مضبوط ہوئی تھی۔

''اس آیت کا صرف وہی مطلب نہیں ہے جو ہم اکثر پڑھ یا سمجھ لیتے ہیں، اس کا ایک اور مطلب اس کے حروف میں کہیں چھپا ہے۔'' ان کا لہجہ پراسراریت میں ڈھلا تھا۔

''دوسرا مطلب؟'' جنت کے لب ہلے۔

مسز شیرازی لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لیے اسے چند لمحوں تک دیکھتی رہیں۔ ''چلو میں تمہیں ایک ہنٹ دیتی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر یسرا کے الف کو نمایاں کیا ہے۔ تاکہ میری طرح کسی کو وقت کا سامنا نہ ہو اور اسے آغاز پکڑنے میں کچھ آسانی ہو۔''

اپنی بات کے اختتام پر دھیرے سے مسکراتے ہوئے انہوں نے الیکٹرانک چیئر کا رخ دروازے کی جانب موڑ دیا تھا۔

اور جنت کمال پینٹنگ ہاتھوں میں لیے اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''جنت خدا کے لیے!!! جنت..... جنت میرا بچہ.....!'' شور ایک دم سے بڑھا تھا۔ آوازیں تیز ہوئی تھیں۔ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا اور وہ لہرا کر کانچ کے ٹکڑوں پر آن گری۔

''امی!'' وہ روتے ہوئے دبی آواز میں چیخی تھی۔ ''امی.....! امی۔'' یکا یک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

''امی۔'' لبوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں میں شال بھینچتے ہوئے اس نے کسی احساس کے تحت سر اٹھایا تھا۔ اگلے ہی لمحے فارس وجدان کی شعلہ بار نگاہوں کی زد میں آتے ہی برف ہوگئی۔ اس کا دل رک گیا۔ آنسو تھم گئے۔ وہ جس طرح سے اسے دیکھ رہا تھا اسے لگا وہ سانس بھی نہ لے پائے گی۔

ایک بار پھر وہ اس کے آرام میں مخل ہوئی تھی۔ ایک بار پھر وہ اس کی آواز سے بیدار ہوا تھا۔ گزشتہ کئی راتوں سے یہی ہو رہا تھا۔ وہ سوتے میں اکثر ڈر

جاتی تھی، رو پڑتی تھی، چیخنے لگتی تھی۔
مجرموں کی طرح شرم ساری سے سر جھکا کر اس نے پیشانی پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا۔ بلینکٹ اور تکیہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔
لاؤنج میں ڈبل صوفے پر بیٹھتے ہی اس کا ضبط ختم ہوگیا۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔
سرخ اینٹوں پر پھیلتا خون، کریم ٹائلز پر ڈھیر ہوتا وجود۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں، وجود کپکپانے لگا۔ ماضی ایک بار پھر اس کے حواسوں پر سوار ہو چکا تھا۔
''خدا تمہیں اس کی وہ سزا دے گا جو تم ساری عمر یاد رکھو گی۔''
شور ایک بار پھر اٹھا تھا، آواز سماعتوں میں ہتھوڑے کی طرح لگی تھی، پیشانی گھٹنوں پر ٹکائے وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔
آہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھل گیا تھا۔ عجلت میں آنسو پونچھتے اس نے بے اختیار سر اٹھایا تھا۔
راہداری میں بیڈ روم کے دروازے میں کھڑا وہ قہر بار نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''اٹینشن سیکر۔'' اس کی بڑبڑاہٹ واضح تھی۔
ایک نفرت بھری نگاہ جنت پر ڈالتے وہ جھٹکے سے پلٹ گیا تھا۔
ہچکیوں کا گلا گھونٹے، سسکیاں لبوں تلے دبائے وہ اسے گیلی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر اب کوئی منظر نہ تھا، نہ سماعتوں سے کوئی آواز ٹکرا رہی تھی، ایک جامد سناٹا تھا جو ہر طرف چھا گیا تھا۔
نفرت بھری ایک نگاہ ہی کافی تھی اسے درد ناک ماضی سے کربناک حال میں پٹخنے کے لیے۔
''یہ تمہارا نصیب ہے جو تمہیں یہاں لایا ہے۔'' تاریکی میں عکس روشن ہوا تھا، آئینے پر دراڑیں پڑ گئی تھیں۔
موازنہ شروع ہو چکا تھا۔ دو چہرے ایک ہو گئے تھے۔ اذیت پھن پھلائے وجود سے لپٹ گئی تھی۔
''دنیا کا سب سے حسین اور شفاف جذبہ محبت کا ہے، اس جذبے میں صلاحیت ہے نفرت کی ہر چٹان کو پاش پاش کر دینے کی۔''
محبت! بہت بھاری اور مشکل تھا یہ لفظ اس کے لیے۔ جو لبوں سے ادا ہوتا تھا، نہ خوشی کا احساس دلاتا تھا۔ جو امید جگاتا تھا۔ نہ یقین دلاتا تھا۔
محبت!
آئینہ سامنے تھا۔ آئینہ واضح تھا۔ جنت نے آنکھیں میچ لیں۔ لب بھینچ لیے۔ گزشتہ کئی راتوں کی طرح وہ رات بھی اس نے آنکھوں میں ہی کاٹی تھی۔ اور دل ماضی کے اژدھوں سے لپٹا ساری رات روتا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ فارس وجدان کے لیے عدم تھی، ماورائی، نہ نظر آنے والی ایک ایسی تخلیق جس کے ہونے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ فرق پڑتا بھی تو کیوں؟ کیا وہ اس کی مرضی و منشا سے اس گھر میں لائی گئی تھی؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تو فرق پڑتا بھی تو کیوں؟
کمرے میں تو جیسے تیسے وہ اسے برداشت کر چکا تھا مگر اپنی ذاتیات میں نہ وہ کسی قسم کی مداخلت برداشت کرتا تھا اور نہ ہی اسے اپنی زندگی میں کوئی مقام دینے کو تیار تھا۔ غصے کا انتہائی تیز..... مشتعل..... یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی محتاط ہوگئی تھی اور اس گھر میں اس طرح سے رہنے لگی تھی جیسے وہ چاہتا تھا رہے۔ اجنبیوں کی طرح..... مسافروں کی طرح..... جنہیں چند روز یہاں ٹھہرنا ہے اور پھر چلے جانا ہے۔ مگر وہ مسافر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اجنبی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے بس میں تھا ہی کیا؟ وہ خود کو اتنا کمزور۔ اتنا لاچار محسوس کرتی تھی کہ حق کے لیے آواز تک نہ اٹھا سکتی تھی۔
فارس نے حدود کا تعین کیا تھا تو وہ بھی اپنے خول میں بند ہوگئی تھی۔ اس نے خاموشی کو پسند کیا تھا تو وہ بھی صامت (Mute) ہوگئی تھی۔ مگر یہ خاموشی

اب اسے اندر ہی اندر مٹانے لگی تھی۔ اس کی الجھن بڑھانے لگی تھی۔

ایک معین مدت تک وہ نکاح کا پابند تھا۔ ایک معین مدت تک ہی وہ اسے اپنے گھر میں رکھے ہوئے تھا۔ جب وہ مدت تمام ہوگی، جب وہ وجہ اختتام ہوگی، اس کے بعد؟ اس کے آگے کیا؟

طلاق کا تصور اس کی روح کھینچنے لگتا تھا۔ کانٹریکٹ کا خیال اذیت بڑھانے لگتا تھا۔ مگر وہ کرتی بھی تو کیا؟ نفرت کی اس دیوار کو ڈھاتی بھی تو کیسے؟ وہ تو خود خالی دامن تھی۔ حالات سے لڑنے کے لیے تو اب اس کے پاس ایک موہوم سی امید بھی نہ رہی تھی۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی؟''

پارک سے واپسی پر وجدان ہاؤس کے بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہوتے وہ چونک کر رک گئی تھی۔

مڑ کر دیکھا تو سامنے یزدانی ہاؤس کے مین گیٹ پر جینز اور سفید ٹاپ میں ملبوس لڑکی اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر کے عجلت میں قدم اٹھاتی اس کے پاس ہی آگئی تھی۔

بھنویں سکیڑ کر پہلے اس نے جنت کو دیکھا، سر سے پاؤں تک۔ پھر وجدان ہاؤس پر یوں نظر ڈالی جیسے تسلی چاہ رہی ہو کہ اس کی آنکھوں نے ہرگز دھوکا نہیں کھایا۔ اس کے بعد پیشانی پر بل اور آنکھوں میں شک لیے وہ سینے پر بازو باندھے اس کے قریب ہوئی۔ ''آپ کی تعریف؟''

جنت نے بھنویں اچکا کر اس لڑکی کو کچھ حیرت سے دیکھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' اس نے کہا تو لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی۔

''فارس بھائی کے آگے پیچھے پروانوں کی طرح پھرنے والی لڑکیوں میں سے ایک۔'' اس نے تمسخر اڑایا۔

''تو کیا تم بھی ان میں سے ہو؟'' جنت نے سوال اٹھایا۔

وہ جل سی گئی۔ تپ سی گئی۔ لیکن آگے سے کچھ نہ بولی۔

''کون ہو؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہی تفتیشی انداز!

''تم کون ہو؟ اور مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟'' جنت نے اب کے ٹھیک ٹھاک اس کی کلاس لینے کی ٹھانی۔

''آئمہ ظہیر ہوں میں۔ فارس وجدان میرے ڈیڈ کا بزنس پارٹنر ہے، شیرازی خاندان کے ساتھ ہمارے فیملی ٹرمز ہیں۔'' گردن اکڑا کر اس نے تعارف کروایا۔ ''اور تم۔'' رک کر ایک بار پھر سر تا پیر جنت کا جائزہ لیا گیا۔ ''تم کون ہو؟''

جنت نے چند لمحوں تک اسے بے تاثر نگاہوں سے دیکھا پھر اندر داخل ہوگئی۔ آئمہ ظہیر چونکی، پھر ٹھٹکی۔ اس طرح وہ پہلی بار نظر انداز ہوئی تھی۔ صدمہ گہرا تھا۔ نکلنے میں چند لمحے لگے۔ پھر وہ سرپٹ اس کے پیچھے بھاگی، سفید روش پر اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔

''آئم انگیجڈ۔'' اس نے ہاتھ لہرا کر اپنی انگوٹھی جنت کو دکھائی۔

''گوڈ ٹو نو۔'' ایک بار پھر جنت اسے مکمل نظر انداز کرتی مرکزی دروازے کی جانب بڑھی۔ آئمہ ظہیر اس کے برابر قدم اٹھانے لگی۔ کچھ دیر پہلے تک جو خفگی کے تاثرات تھے وہ اب ختم ہو چکے تھے۔ ''ویسے کیا چل رہا ہے؟ گھر تک آگئی ہو۔ کہاں تک بات بنی؟'' لہجے میں اشتیاق تھا۔ تجسس تھا۔ ایکسائٹمنٹ تھی۔

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''ویسے میں تم پر واضح کر دینا چاہتی ہوں، یہ کوششیں ان پر نہیں چلتیں۔'' وہ اس کے برابر قدم اٹھانے لگی۔

''کسی اور سیارے کی فضائی مخلوق ہیں۔ لڑکیوں سے یہ دس بیس تیس قدموں کی دوری پر رہتے ہیں۔ کھڑے کھڑے منہ پر بے عزتی کر دیتے ہیں۔ انتہا کے مغرور۔ لیکن میرے ساتھ وہ اچھے ہیں، کیونکہ میں

ان کی بہن ہوں۔ مطلب اصلی والی نہیں۔ لیکن وہ عذیر بھائی کے دوست ہیں، اس لیے وہ میرے بھی بھائی ہیں۔ جیسے ہی ہیں اور سچ پوچھو تو مجھے بھی بڑا ارمان ہے ان کی شادی کا۔'' وہ جنت کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

''میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ ان کی شادی پر خوب ہلا گلا کروں گی، آخر اتنا انتظار کروا رہے ہیں وہ، آنٹی تو بس ان کی نہ نہ سے عاجز آ چکی ہیں، ایک بار میں نے ان سے کہا تھا، یہ ایسے نہیں مانیں گے، کن پوائنٹ پر نکاح کروائیں۔ یا جذباتی بلیک میل کریں انہیں۔ یا پھر ایجنسی والوں سے بات کر کے پہلے انہیں اغوا کروائیں پھر رہائی کی شرط نکاح رکھیں۔ اور آنٹی اتنی معصوم ہیں، وہ میرے مشوروں سے ہی ڈر جاتی ہیں۔''

جنت کے پیچھے وہ امریکن طرز کے شاندار کچن میں آ گئی۔ زبان ابھی بھی چل رہی تھی۔ ''اصل میں خاصے مغرور واقع ہوئے ہیں، انہیں کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔ نہ وہ اپنی پسند بتاتے ہیں۔ بس یہی کہتے رہتے ہیں میں نے شادی نہیں کرنی۔ بھئی یہ ڈائیلاگ تو ہم لڑکیوں کے ہیں۔ فارس بھائی نے چرا لیے۔ اب بندہ وجہ پوچھے کیوں نہیں کرنی۔ تو کہتے بس۔ نہیں کرنی۔ یہ لائن بھی ہماری ہی ہے۔''

کیبنٹ کھول کر جنت نے دو گلاس نکالے، پھر ان میں لائم جوس انڈیلا۔ پشت آئمہ ظہیر کی طرف تھی۔ جو کاؤنٹر ٹیبل کے اس پار کھڑی ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔ ''ایسی ایسی لڑکیوں کے رشتے انہوں نے ٹھکرائے ہیں۔ ایسی ایسی لڑکیوں کے۔ کہ میں کیا بتاؤں۔'' جنت نے اسے لائم جوس کیک اور پیسٹری کے ساتھ پیش کیا۔

''تو..... تم یہاں کام کرتی ہو؟'' پوچھتے ہوئے اس نے یہاں وہاں بھی دیکھا کہ شاید وہ ہیڈ سرونٹ ہو۔ یا گھر کی منتظمہ۔ یا پھر مسز شیرازی کی کوئی اسٹوڈنٹ۔

جنت نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر؟''

''میں جنت کمال ہوں۔ فارس وجدان کی بیوی۔''

جوس پیتے ہوئے آئمہ کو زور کا اچھو لگا۔ گلاس رکھ کر بری طرح سے کھانستے ہوئے اس نے جنت کو دیکھا۔ کچھ حیرت، صدمے اور بے یقینی سے۔ پھر ہنسی اور بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ ''نائس جوک! آئی لائک اٹ۔'' ہنستے ہنستے بے حال ہی ہو گئی۔ پھر ہنسی ضبط کر کے بڑے ہی پروفیشنل انداز میں کاؤنٹر ٹیبل پر کہنیاں جما کر آگے ہوئی۔

''دیکھو اگر تم ان میں انٹرسٹڈ ہو تو میں تمہاری ہیلپ کر سکتی ہوں، فارس بھائی کو اس شادی پر آمادہ کرنے کے لیے باقاعدہ ایک پلاننگ کی ضرورت ہے، ہمیں ایک جال بچھانا ہوگا۔ ایسا جال جوان کے دل کو قابو کر لے۔'' سر جھکائے بڑے ہی پراسرار انداز میں بات کرتی وہ جنت کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گئی۔

''ارے ارے تم تو ابھی سے شرما رہی ہو۔''

آئمہ کے عقب میں سیڑھیوں پر نظر پڑتے ہی جنت کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''فکر نہیں کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، مل کر گیم کھیلتے ہیں فارس بھائی کے ساتھ۔ کوئی چال چلتے ہیں۔ دیکھنا خود سے ہاں کریں گے وہ شادی کے لیے۔''

سر پر چپت رسید ہوئی تو اسے یکا یک خطرے کا ادراک ہوا۔ لفظ گم ہو گئے، یقیناً وہ اس کی خفیہ گفتگو سن چکا تھا

''اللہ، فارس بھائی! ایک تو آپ بھی نا۔ پورے تین ماہ بعد واپس آئی ہوں۔ مگر مجال ہے جو آپ میرا ابھی اچھے سے استقبال کر لیں۔''

''کس کے ساتھ گیم کھیلنا ہے۔ اور کس کے لیے چال چلنی ہے؟'' اس کے تاثرات سخت نہ تھے۔ آنکھوں میں جنت نے پہلی بار نرمی دیکھی۔

''وہ..... میں..... اصل میں.....'' آئمہ ہکلائی۔

''ہاں۔ وہ کیا میں..... اصل میں.....؟'' ذرا سے سخت تاثرات کے ساتھ پوچھا گیا۔

''وہ میں ان سے ایک ناول ڈسکس کر رہی تھی۔'' اس نے جنت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

فارس نے نظر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ جو انہی تاثرات کے ساتھ خاموش کھڑی تھی۔ مزید کچھ

بھی کہے بغیر وہ سر جھٹک کر چلا گیا۔

''ڈڈیوسی دیٹ۔'' آئمہ نے بڑی اماؤں کی طرح فارس کی طرف اشارہ کر کے اپنی پیشانی کو چھوا۔

''ایسے ہیں یہ..... یہ نہیں کہ بہن تین ماہ بعد آئی ہے تو ٹھیک سے سلام دعا کر لیں۔ نہیں! بس ایسے ہی غصے میں ہی رہنا ہے۔'' ایک بار پھر ساری ہمدردیاں سمیٹ کر وہ جنت کی طرف مڑی جو گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔

''ایک بار پھر سوچ لو، چڑیا سی تو ہو، گزارا کر لو گی اس طوفان کے ساتھ؟''

''آئمہ!'' لاؤنج سے فارس کی آواز آئی تھی۔

''اب کیا کر دیا میں نے؟'' وہ وہیں سے چلائی۔ پھر لائم جوس ایک ہی سانس میں چڑھا کر اسٹول سے اتری۔ ''ابھی چلتی ہوں، پھر آوں گی، پھر مل کر ڈسکس کریں گے کہ اس دیو کو کیسے قابو کرنا ہے، اینڈ پلیز! اگر تم فارس بھائی کی کوئی ایمپلائی ہو تو اس کے رعب میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جسٹ ریلیکس! ٹھیک ہے نا۔ اور مسز شیرازی کہاں ہوں گی؟''

''وہ اس وقت سو رہی ہوں گی۔''

''انہیں بتا دینا آئمہ آئی تھی۔ ان سے پھر ملنے آؤں گی۔''

فلائنگ کس دے کر وہ فارس کے ساتھ مدافعانہ انداز میں لڑتی الجھتی باہر چلی گئی تھی۔ جنت کی خاموش نگاہوں نے گلاس وال کے اس پار فارس کا دور تک تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

''خوش ہو؟'' ہینڈ ریلنگ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتے اس کے قدموں کی حرکت تھم گئی تھی۔ نگاہیں سکرین پر ابھرتے میسج پر یوں ٹھہریں کہ آس پاس سے غافل ہو گئی۔ کچھ دیر پہلے ہی اس کی سائرہ خالہ اور سدرہ کے ساتھ ویڈیو کال ہوئی تھی۔ اور اب عمار کا میسج آ گیا تھا۔ نہ سلام نہ دعا۔ ڈائریکٹ سوال۔ وہ سوال جو سائرہ خالہ نے بھی اس سے نہیں پوچھا تھا۔

''ماما سے تو کافی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں تم۔'' دوسرا میسج۔

حلق میں ابھرتی گلٹی کو اس نے بمشکل نیچے اتارا۔

''یہ اتنا ہنسنا مسکرانا کب سیکھا تم نے؟'' تیسرا میسج۔ ''ایکٹنگ تو کمال کی ہے، بہت امپریس ہوا ہوں میں۔'' ساتھ ہی ہنسی کا اموجی۔

موبائل ہاتھ میں لیے وہ اپنی جگہ تھم کر رہ گئی۔

نہ نکاح میں شرکت کی تھی اس نے نہ ولیمہ اٹینڈ کیا تھا۔ اجنبیت تو نہ تھی کہ خالہ کا بیٹا تھا۔ مگر اس طرح کے چبھتے سوال۔ جو سوال کم جواب زیادہ لگ رہے تھے۔

وہ اس کے لیے بھائیوں جیسا تھا۔ شفیق۔ مہربان۔ احساس کرنے والا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کے لیے آپے سے باہر ہو جانے والا۔ سائرہ خالہ کی فیملی کا ہر ممبر اس کے لیے ایسا ہی تھا۔ مگر اس کے یہ چبھتے سوال! وہ اسے اتنا کیسے جان سکتا ہے؟ اس طرح سے کیسے جان سکتا ہے؟ اس کا ذہن الجھن کا شکار ہوا تھا۔

''کیسے ہو عمار؟''

اس نے سنبھل کر میسج ٹائپ کیا تھا۔

''کیا میں اسے اپنے سوالات کا جواب سمجھوں؟'' جواب آیا۔

وہ کچھ حیرت سے اسکرین کو دیکھ کر رہ گئی۔ اپنے پیچھے ڈھیر سارے سوالات چھوڑے اگلے ہی لمحے وہ آف لائن ہو گیا تھا۔ اور جنت کمال تشویش میں مبتلا اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''تم دعا نہیں مانگتیں جنت۔''

نماز مغرب کے بعد وہ مسز شیرازی کے برابر میں بیٹھی خاموشی سے قالین کے ریشوں کو چھیڑ رہی تھی جب انہوں نے سوال پوچھ کر اسے چونکا دیا تھا۔

دعا۔

ایک پکار!!

ایک امید!!

ایک یقین!!
ایک صدا!!
''معافی تو مانگتی ہوں'' وہ کارپٹ پر انگلی سے لکیر کھینچتی جھکے سر کے ساتھ آہستگی سے بولی تھی۔
''اور دعا؟'' اب کے جنت نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ کچھ حیرت، کچھ الجھن، کچھ گھبراہٹ سے۔
مسز شیرازی کی معیت میں رہتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اجنبیت یا کسی خوف کا احساس ہوا ہو۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ اتنی ہی شفیق، اتنی ہی مہربان، نرم مزاج، اخلاق حسنہ کی مالک.....
مگر اب وہ اس سے ایک ایسے راستے کی بابت استفسار کر رہی تھیں جس کے بارے میں خود وہ بھی ٹھیک سے کچھ جانتی نہ تھی۔ بھول گئی تھی وہ۔ چھوڑ دیا تھا سب اس نے۔
عسر یسرا کی پینٹنگ اب سامنے دیوار پر لگی نظر آ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں وہیں کہیں تھیں۔ عسر پر پھسلتی۔ یسر اپر بھٹکتی..... مگر ذہن کہیں اور تھا۔ توجہ کہیں اور تھی۔
''جنت۔'' اسے سوچوں میں غلطاں دیکھ کر انہوں نے پکارا تھا۔
''کیا مانگوں؟'' اسے اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
کتنی ہی دیر تک مسز شیرازی اس کی خالی آنکھوں میں دیکھتی رہیں۔ کوئی امید، کوئی یقین یا پھر زندگی کا ہی کوئی رنگ۔ کچھ تو نظر آئے۔ مگر وہاں کیا تھا۔ ایک مہیب تاریکی۔ ایک مہیب سناٹا۔
''جو تمہارا دل چاہے۔'' انہوں نے نرمی سے کہا تھا۔
''جو میرا دل چاہے۔'' کوئی شے پھانس کی طرح اس کے حلق میں اٹکی تھی۔ نگاہیں عسر پر جا ٹھہری تھیں۔ ''اگر جو اللہ نہ چاہے؟'' اس کے لب کپکپائے تھے،
''ایسا نہیں ہوتا کہ وہ نہ دے۔''
''کچھ دعائیں قبول نہیں ہوتیں آنٹی۔'' شکایت بے ساختہ ہی لبوں پر آئی تھی۔ ''کچھ چیزیں نہیں ملتیں، کچھ لوگ نہیں ملتے، کچھ خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ کچھ نقصان پورے نہیں ہوتے۔''
دیوار گیر کھڑکیوں کے اس پار شام کا منظر اس کی تاریکیوں سے الجھ گیا تھا۔
''دعائیں رد نہیں ہوتیں جنت! محفوظ کر لی جاتی ہیں، جو آپ مانگ رہے ہوں وہ نہ ملے تب بھی آپ کے ہاتھ خالی نہیں لوٹائے جاتے۔ اللہ ہمیشہ بڑھ کر عطا کرتا ہے، وہ آپ کو حیران کر دیتا ہے۔''
آنکھوں میں ابھرتی نمی کو دباتے ہوئے جنت نے سر جھکا لیا۔
کیا مانگے؟ ذہن شاید اب بھی یہیں اٹک جاتا تھا۔ جس کی طلب تھی یا چاہ رکھتی تھی۔ وہ اسے نہیں مل سکتا تھا۔ جو محرومیاں اس کا مقدر ٹھہری تھیں وہ ''عطا'' میں نہیں بدل سکتی تھیں۔ کچھ کام سحیل تھے۔ ناممکن..... اور کچھ معاملات میں وہ بےبس تھی..... قطعی بےبس۔
''آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں؟'' یونہی سر اٹھا کر اس نے پوچھا تھا۔ آواز رندھی ہوئی تھی۔
''ہاں ہوتی ہیں اور ایک خوب صورت دعا تو حال ہی میں قبول ہوئی ہے۔'' وہ مسکرائیں۔
''کون سی دعا؟'' وہی اشتیاق، تجسس سا سا ابھرا تھا اس کی آنکھوں میں۔
''یہی کہ مجھے فارس کے لیے ایک اچھی سی نیک سیرت لڑکی مل جائے۔''
جنت کی آنکھوں سے اشتیاق گم ہو گیا۔ تجسس کی جگہ اذیت نے لے لی۔ سر جھکا کر ایک بار پھر اپنے خول میں بند ہوئی اور قالین پر لکیریں کھینچنے لگی۔
مسز شیرازی گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔
''دعا مانگتے رہنا چاہیے، قبول ہو جائے تب بھی، نہ قبول ہو تب بھی، کہ دعائیں رد نہیں ہوتیں۔ جواب ضرور آتا ہے۔ جھولی خالی نہیں رہتی۔ اس میں کچھ نہ کچھ ضرور گرتا ہے۔''

وہ جنت کو دیکھ رہی تھیں اور جنت سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

☆☆☆

افق سے زمین پر اترتی شام کے رنگوں میں آج ستاروں کا راج تھا۔ جو امید کا روپ دھارے اس کی آنکھوں میں بھی جگمگا رہے تھے۔

ڈائننگ ٹیبل کو مختلف ڈشز سے سجانے کے بعد جب وہ پانی کا جگ لیے واپس آئی تھی تو فارس وجدان صدر کرسی سنبھال چکا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر پر، سفید شرٹ میں ملبوس وہ عام سے حلیے میں تھا۔ فراخ پیشانی پر بال بکھرے تھے۔ آنکھوں میں سختی تھی نہ ہی خفگی کا کوئی تاثر۔

مگر وہ جانتی تھی اگلے چند لمحوں میں اس کے چہرے کے تاثرات کیسے ہونے والے تھے۔

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھی تو فارس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ غالباً وہ شام کے کھانے پر اس کی موجودگی کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا۔

عموماً وہ بھی مسز شیرازی کے ساتھ جلد ہی کھانا کھالیا کرتی تھی، کیونکہ فارس کچھ تاخیر سے گھر آتا تھا اور انہیں وقت پر میڈیسن لینا ہوتی تھی۔ مگر آج اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ آج وہ فارس وجدان کی منتظر رہی تھی۔

''ممی کہاں ہیں؟'' اپنی پلیٹ میں پلاؤ ڈالتے ہوئے وہ ملازمہ سے پوچھ رہا تھا۔ آنکھوں میں اب بے نام سی خفگی لہرا رہی تھی۔

''صاب وہ اپنے کمرے میں ہیں۔''

''کھانا گل خان نے بنایا ہے؟'' اس نے پہلے چمچے کے ساتھ ہی اچانک سے پوچھا تھا۔

اس کے انداز، رویے اور لہجے سے کچھ خائف ہو کر جنت نے حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارا تھا۔

ملازمہ نے ایک نظر جنت پر ڈالی تھی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آج کا کھانا جنت میم۔'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ پلیٹ میں چمچہ پٹخ کر اٹھ گیا تھا۔ جنت کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

''گل خان کہاں ہے؟'' اب وہ انتہائی غصے کے عالم میں ملازمہ سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ آٹھ بجے اپنے کوارٹر چلا گیا تھا۔'' ملازمہ بھی ایک لمحے کے لیے جیسے اس کے غصے سے خائف ہوئی تھی۔

زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہ پاؤں پٹخ کر باہر نکل گیا۔

اب گل خان کی خیر نہیں۔ ملازمہ کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

جنت کمال اپنی جگہ پتھر ہوئی بیٹھی تھی۔ اتنی نفرت!!! اس کا سانس رکا تھا۔ نگاہیں میز پر سجی انواع واقسام کی ڈشز پر ٹھہر گئی تھیں۔

نفرت سے لڑنے کے لیے ''محبت'' اس کے پاس نہیں تھی۔ لیکن ایک کوشش۔ کہ شاید رویے سے کام چل جائے۔ اخلاق اور خدمت سے فرق پڑ جائے۔ لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ بالکل فرق نہیں پڑتا تھا۔

کپکپاتی انگلیوں سے گال پر پھسلتی لٹ کو پیچھے ہٹاتے وہ کرسی دھکیل کر اٹھ گئی تھی۔ مارے خفت، شرمندگی اور بے عزتی کے احساس کے تحت اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ عجلت میں سیڑھیاں چڑھتی وہ کمرے میں بند ہو گئی۔ کچھ وقت اس نے بالکنی میں بتایا تھا، کھلی فضا میں بھی اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

''یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جنت کمال!! یہ صرف کاغذ تک محدود رہے گا۔''

''ممی کو ایک بہو چاہیے تھی۔ صرف ایک بہو! یہاں صرف بہو بن کر رہو۔ بیوی بن کر میرے سر پر مسلط ہونے کی کوشش بھولے سے بھی مت کرنا ورنہ بہت برا کروں گا میں۔''

واش بیسن پر جھک کر اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر مارے تھے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھا تھا۔ پانی آنسوؤں کی

تمیز مٹا رہا تھا۔ روئی روئی سی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔

"وہ اس رشتے سے راضی نہیں ہے۔" واش بیسن پر ہاتھ جمائے وہ روتے ہوئے جھک گئی تھی۔

"بالکل بھی راضی نہیں ہے۔"

"کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ وہ سرے سے شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔" جنت نے بے ساختہ نگاہ اٹھائی تھی۔ کچھ حیرت سے اپنا عکس دیکھا تھا۔

"خالہ بھی یہ بات جانتی تھیں۔" اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ "انہوں نے پھر بھی....."

"تم ہر بار یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ اس وقت تمہارے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا، تمہارے چچا تمہارا رشتہ زمان سے طے کر رہے تھے، کیا وہ تمہیں منظور تھا؟" کاٹ دار لہجہ اسے چھلنی کر گیا۔ وہ کرب سے لب بھینچ کر رہ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے سکوت چھایا تھا۔

"میں اس گھر میں صرف اس کی ماں کی وجہ سے ہوں، آنٹی ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ خدانخواستہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو وہ مجھے اس گھر سے نکالنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگائے گا۔" اس کی آواز غم سے بوجھل ہو رہی تھی۔

"تو اس کی اس سوچ اور فیصلے کو بدلنا تمہارا کام ہے جنت۔"

"کیا سوچ اور فیصلے بدلنا آسان ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

"محبت ہر کام آسان کر دیتی ہے۔" یہ اس کی آواز تھی جو ماضی کا سفر طے کر آئی تھی۔

"محبت۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔ "محبت ہی تو سب مشکل کرتی ہے۔"

"تم نے اپنی غلطیوں سے کچھ بھی نہیں سیکھا! تم اب بھی وہیں ہو، اسی مقام پر۔" تضحیک اڑاتا ہوا لہجہ اس کی دھجیاں بکھیر گیا۔ کچھ تکلیف، بے بسی اور ازردگی سے وہ خود کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"وہی غلطی۔ وہی منزل۔ وہی راستہ....."

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے لرزا دیا گیا۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں۔" نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ واش بیسن پر جھک کر رونے لگی۔ "تم بھی نہیں سمجھ سکتی۔"

"کیا تم نے فارس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟"

وہ ایک لمحے کے لیے چونکی، ٹھٹکی پھر سسک پڑی۔ "بس کرو۔"

"برہان ابھی تک تمہارے حواسوں پر سوار ہے۔" اتنے اچانک سے کہا گیا وہ گنگ ہو گئی۔ ساکت ہو گئی، صامت ہو گئی.....

"ایسا ایسا نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد جب وہ بولنے کے قابل ہوئی تو لفظ بمشکل ادا ہوئے۔

"ایسا ہی ہے۔"

بیڈ روم کا دروازہ بند ہوا تھا۔ قدموں کی چاپ ٹیچڈ باتھ روم کے دروازے تک آ کر تھم گئی تھی۔

"برہان آج بھی تمہارے حواسوں پر ہے، اور تم اس کی ہی وجہ سے اپنے نئے گھر میں کوئی انٹرسٹ نہیں کر رہی ہو! تم ایک بار پھر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ رہی ہو! پچھلی بار خالہ آئی تھیں اور تمہیں وہاں سے نکال لائی تھیں... اس بار..... اس بار کون آئے گا؟ اللہ بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد کرنا چاہتے ہیں اور تم؟ تم نے ان پندرہ بیس دنوں میں کیا ہی کیا ہے؟"

جنت کا حلق خشک ہونے لگا۔ نچلا لب بیدردی سے رگڑتے ہوئے اس نے رونے پر قابو پانے کی سعی کی۔

"وہ اپنا ہر دروازہ بند کر رہا ہے اور تم اسے ایسا کرنے دے رہی ہو؟ وہ تمہیں عدم کر رہا ہے اور تم ہو رہی ہو!؟ وہی غلطی..... وہی خطا۔" اندر کا شور بڑھ گیا۔ شور ہمیشہ بڑھ ہی جایا کرتا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہرے پر مارنے لگی۔ پھر اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

وہی غلطی!

وہی خطا!!!

آواز بدستور گونج رہی تھی۔

☆☆☆

دوپہر کے وقت دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے صوفے پر نیم دراز میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور کھلی تب تھی، جب سماعت سے دل دوز چیخ ٹکرائی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے اس کی پہلی نظر آئمہ پر پڑی، جو صدمے سے گال پر ہاتھ رکھے اسے ہی دیکھے جارہی تھی۔

''یہ ابھی ابھی میرے کانوں نے کیا سنا ہے، تم واقعی میں۔ اوہ گاڈ۔ تم واقعی میں ان کی وائف۔ اوہ گاڈ۔'' اس نے چہرے کے آگے ہاتھ جھلایا گویا سانس لینے میں دشواری ہورہی ہو۔

جنت گھبراہٹ کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کندھے سے پھسلتے دوپٹے کو واپس جماتے اٹھنے ہی والی تھی کہ آئمہ اس کے برابر میں ٹک گئی۔۔

''مجھے ابھی ابھی آنٹی نے بتایا۔ بھائی اور بھابھی کو بھی علم تھا لیکن انہوں نے مجھ سے چھپائے رکھا۔ کہتے ہیں تمہیں سرپرائز دینا تھا۔ یہ سرپرائز ہے یا گولی! سیدھا دل سے گزر گئی۔ مجھے اتنا دکھ ہورہا ہے میں نے ان کی شادی مس کردی۔'' ساتھ ہی اس نے اپنی ہتھیلی مسلی۔ ''آئی کانٹ بلیو اٹ۔ انہوں نے شادی کرلی۔'' گردن موڑ کر اس نے جنت کو دیکھا۔ ''آخر سب نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' کندھے سے لگ کر اس نے رونا چاہا۔ پھر سر اٹھائے اسے ایک بار پھر دیکھا۔ ''کیا واقعی تمہاری آناً فاناً شادی ہوئی؟ ایک ہی دن میں رشتہ طے ہوا، شام میں نکاح اور پھر رخصتی؟ کیا واقعی میں ایسا ہی ہوا؟''

جنت نے نزل ہوکر اثبات میں گردن ہلائی۔

آئمہ نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ آنکھوں میں بڑوں کی سی شفقت اتر آئی۔ ''یعنی تم چند گھنٹے ان کی منگیتر رہیں۔ پھر منکوحہ ہوئیں۔ پھر بیوی۔''

اب کے جنت چپ رہی۔

''سچ کہتے ہیں۔ اللہ کے فیصلوں کے آگے انسان کی نہیں چلتی۔ فارس بھائی جیسے بندے کی شادی ایسے ہی ہوسکتی تھی۔ آناً فاناً۔ نکاح کی اسٹیپس تو ہوں گی۔ ذرا وہی دکھا دو مجھے۔'' سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر اس نے تصویریں دکھائیں۔

''اللہ! ماشاءاللہ! کتنی پیاری لگ رہی ہو، واقعی فارس بھائی کے ساتھ تم ہی جچ سکتی ہو، اور یہ فارس بھائی۔'' اب کے فارس کی تصویروں کو زوم ان کرکے دیکھا گیا۔ ''یہ ایسے کیوں بیٹھے ہیں جیسے مرچیں چبائے ہوئے ہوں۔ ہیں پورے طوفان ہی۔ ذرا سا مسکرا دیتے تو کون سا جان نکل جانی تھی۔''

تصویریں بدل بدل کر وہ تبصرے کررہی تھی اور جنت اسے خاموش نگاہوں سے تکتی بالکل چپ بیٹھی تھی۔۔

''جوڑی تو ویسے کمال کی ہے۔'' اشتیاق کے عالم میں ایک ایک تصویر کو دیکھتے وہ سراہ رہی تھی۔

''میں بھائی اور بھابھی سے سخت خفا ہوں، آنٹی سے بھی میری بول چال بند ہے، اور فارس بھائی آج سے میرے بھائی نہیں ہیں۔ ایسے کیسے کرسکتے ہیں یہ سب میرے ساتھ۔'' اس کا صدمہ، دکھ جا ہی نہیں رہا تھا۔ ''مجھے پتا ہوتا وہ میرے دبئی جانے کے بعد شادی کرلیں گے تو میں کبھی نہ جاتی۔''

''تم کب آئیں؟'' بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے جنت نے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے! بھائی بھابھی کے ساتھ آئی ہوں۔ سب نیچے ہیں۔ آنٹی نے مجھے تمہیں بلانے کے لیے بھیجا ہے۔''

''مہمان آئے ہوئے ہیں۔'' جنت کے ہوش اڑے۔ وہ بوکھلا کر اٹھی۔

''ارے کہاں مہمان۔'' آئمہ نے گویا اک مکھی اڑائی۔ ''ہمیں تم اپنا ہی سمجھو، ویسے تم صوفے پر کیوں سو رہی تھیں؟''

الماری سے اپنا سوٹ نکالتے جنت چونک کر مڑی۔ آئمہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے اسے ہی دیکھ رہی

تھی۔

''میگزین پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی تھی۔ تم جاؤ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔''

''یہ درست ہے فارس بھائی اب میرے بھائی نہیں رہے لیکن تم میری بھابھی ہی ہو، جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ تاکہ میں تمہارا اچھا سا میک اپ کرسکوں۔''

جنت نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر سر جھٹک کر اٹیچڈ باتھ روم میں چلی۔ مونگیا رنگ کے سنہرے کامدار اے لائن فراک میں ملبوس جب وہ باہر آئی تو آئمہ نے میگزین سے نگاہ ہٹا کر اسے ہی دیکھا۔

''تمہارے بال بہت پیارے ہیں جنت۔''

وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ ''اب تم بیٹھو میں تمہارا میک اپ۔''

''نہیں آئمہ! پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔''

مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اسے زبردستی کرسی پر بٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر نگاہ دوڑائی مگر وہاں فارس کی کریمز اور پرفیومز کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اس نے عجلت میں دراز کھینچے مگر میک اپ تو کہیں بھی نہ تھا۔

''وہ۔ ابھی میں نے اپنا سامان سیٹ نہیں کیا ہے۔'' اپنی شرمندگی پر قابو پاتی وہ تیزی سے اٹھی اور وارڈروب کے نچلے خانے سے میک اپ باکس نکال لائی۔

آئمہ نے پھرتی سے اس کا لائٹ میک اپ کیا۔ بال بنائے۔ پھر اپنی بھی کچھ نوک پلک سنواری۔

اس کے بعد وہ دونوں نیچے آ گئیں۔

لاؤنج میں تو گویا ایک محفل کا سماں تھا۔ آئمہ کے بھائی اور بھابھی اپنے تین بیٹوں کے ہمراہ موجود تھے۔ وہ ان سب سے خوش اخلاقی سے ملی۔ پھر مسز شیرازی کے ساتھ سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اصولاً تمہیں فارس بھائی کے ساتھ بیٹھنا چاہیے تھا۔'' آئمہ نے صوفے کے ہتھے پر ٹک کر سرگوشی کی۔ اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

آئمہ کی بھابھی آمنہ بہت ہی ملنسار اور خوش اخلاق تھیں۔ تین بیٹے تھے۔ ایک چھ سال کا تھا، دوسرا چار سال کا۔ جب کے سب سے چھوٹا والا گود میں تھا۔ گھر میں تو یقیناً بچے طوفان اٹھائے رکھتے ہوں گے مگر اس وقت وہ دونوں بہت مودب سے اپنے باپ کے ساتھ بیٹھے تھے۔

بڑا والا ذرا صحت مند تھا۔ سر اٹھائے جنت کو ہی دیکھتا رہا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نظروں کا زاویہ نہ بدلا۔ جب سلام کرنے آیا تب بھی ذرا شرمایا شرمایا سا لگا۔ جنت نے نام پوچھا تو نام بتا کر اپنی ماما کے پہلو میں منہ چھپا لیا۔

''لو جی۔ اسد کا تو کام ہو گیا۔ عذیر بھائی!! آپ کے بیٹے کو ایک اور لڑکی پسند آ گئی۔'' آئمہ نے باقاعدہ اعلان کیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ڈنر باہر لان میں کیا گیا جہاں باربی کیو کا انتظام کیا گیا تھا۔ رات گئے تک خوب محفل جمی رہی تھی۔

مسز شیرازی اپنی میڈیسن لے کر سو گئی تھیں مگر فارس اور جنت نے مہمانوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔

آئمہ کی جنت کے ساتھ ان چند گھنٹوں میں صدیوں پرانی دوست ہو چکی تھیں۔ جاتے وقت دونوں کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ آمنہ بھابھی نے تو خاص طور پر اسے اپنی طرف آنے کا کہا تھا۔

مہمان جا چکے تو گھر میں ایک بار پھر خاموشیاں راج کرنے لگیں۔ وہ کمرے میں آئی تو فارس کی موجودگی میں بھی تنہائی ایک بار پھر اسے ڈسنے لگی۔

واش روم کے آئینے میں اس نے خود کو دیکھا۔ آئمہ نے اسے بہت اچھے سے تیار کیا تھا۔ مگر جس کے لیے اسے تیار کیا گیا تھا اس نے تو نظر بھر کر بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ جیولری اتارتے، چہرہ دھوتے اس کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

دروازے پر دستک ہوئی، قدموں کی آہٹ

کے ساتھ ہی ملازمہ کی آواز ابھری۔ ”صاحب! بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔“

فارس کی مدھم آواز کے ساتھ قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ واش روم سے باہر آئی تو کمرہ خالی تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے، صرف اس خیال کے تحت کہ مسز شیرازی کی طبیعت خراب نہ ہو، وہ عجلت میں قدم اٹھاتی نیچے آگئی تھی۔

”جو مر چکا ہے، اس کے ساتھ مرنا چاہتی ہیں، جو زندہ ہے، اس کے ساتھ جینا نہیں چاہتیں۔“ بھاری گمبھیر آواز..... کسی پوشیدہ درد کی عکاسی کرتی ہوئی..... مسز شیرازی کے بیڈ روم کے سامنے جنت ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ دستک کے لیے اٹھا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔

”وہ تمہارا خون ہے۔“ مسز شیرازی کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔

”وہ میرا کچھ نہیں ہے۔“ فارس کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

اس نے ادھ کھلے دروازے سے اندر دیکھا۔ سامنے ہی بیڈ پر وہ مسز شیرازی کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے فارس۔“ مسز شیرازی نے منت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

”آپ مجھ سے میری جان کیوں نہیں مانگ لیتیں ممی!“ فارس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ آواز میں درد۔

آنکھوں میں نمی لیے مسز شیرازی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اگلے کئی لمحوں تک ان کے مابین سکوت حائل رہا۔

”جب تک اس کی نانی زندہ تھیں میں کچھ مطمئن تھی۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولیں..... ”مگر اب.....“

فارس خاموش رہا۔

”چھوٹا سا یتیم بچہ ہے وہ! تم اسے آخر کس بات کی سزا دے رہے ہو فارس!! کیا تمہیں رحم نہیں آتا اس پر؟“

فارس نے جن نگاہوں سے انہیں دیکھا وہ اندر تک کٹ کر رہ گئیں۔

”مت کریں میرے ساتھ ایسے..... پلیز!“ وہ بے بسی سے کہہ اٹھا تھا۔ ”آپ نے کہا واپس آجاؤ میں آگیا۔ آپ نے کہا شادی کرلو میں نے کرلی۔ مگر یہ نہیں۔ اللہ کے لیے یہ نہیں۔“

”وہ تمہارا بھتیجا ہے فارس! تم اس کے لیگل گارجین ہو۔“

”کچھ نہیں ہے وہ میرا۔“ اس کی آواز یکایک بلند ہوگئی تھی۔

مسز شیرازی کرب سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا... جنت عجلت میں دروازے سے ہٹ کر پلر کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔

کمرے سے باہر آکر وہ ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔ اس کا تنفس بھاری تھا، آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اور جنت کمال دم سادھے اگلے کئی لمحوں تک اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

اپنے بے جان کھلونوں کو سنبھال سنبھال کر رکھنے والا جیتے جاگتے انسانوں کے معاملے میں اتنا بیرحم..... اتنا سفاک!

سگا یتیم بھتیجا جسے وہ اپنی گڈی میں لینے کو تیار نہیں؟

اس نے سر اٹھا کر بند دروازے کو دیکھا۔ مسز شیرازی کا چہرہ آنکھوں میں سما گیا۔ کتنی تکلیف میں لگ رہی تھیں وہ۔

گہرا تنفس لے کر وہ الجھے ذہن کے ساتھ کمرے میں آگئی تھی۔

فارس بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے موبائل اٹھائے بیٹھا تھا۔ تیزی سے کچھ ٹائپ کرتا ہوا۔ جنت کی آمد سے اس کے اعصاب تناؤ کا شکار ہوئے

تھے۔ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتی وہ وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی۔ اپنا بلینکٹ اور تکیہ نکال کر جب سیدھی ہوئی تو موبائل سائڈ ٹیبل پر پٹخ کر وہ سر سے پیر تک لحاف تانے سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔

آنکھوں میں تفکرات کی پرچھائیاں لیے وہ اب اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

فارس کا بھائی! یتیم بھتیجا؟ جسے وہ اپنی کسٹڈی میں لینے کو تیار نہیں؟

مسز شیرازی اپنے پوتے سے ملنا چاہتی تھیں مگر فارس انہیں ملنے نہیں دے رہا تھا۔ وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھیں مگر فارس انہیں ایسا کرنے نہیں دے رہا تھا۔ ماں سے شدید محبت کے باوجود وہ انہیں کتنی بڑی اذیت سے دوچار کیے ہوئے تھا۔

ایسی بھی کیا بے بسی۔ ایسی بھی کیا بے حسی۔

کیسا انسان ہے یہ؟ دل نام کی چیز اس کے سینے میں ہے بھی یا نہیں؟

''تم بھی اس سے مختلف نہیں ہو جنت۔''

اس کی سوچ کو یک دم ہی بریک لگی تھی۔ خیال جامد ہوئے تھے۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا عکس یکا یک ہی اس کی کیفیت پر مسکرانے لگا تھا۔ آواز اندر سے آئی تھی۔ آواز ہمیشہ اندر سے آتی تھی۔ کبھی ماضی کی شہ پر..... کبھی ضمیر کی صدا پر..... اور وہ کتنی ہی دیر تک ساکت و جامد کھڑی رہ جاتی تھی۔

☆☆☆

دستک دے کر اس نے ادھ کھلے دروازے کو اندر کی جانب دھکیل دیا تھا۔ مسز شیرازی کھڑکی کے سامنے قرآن ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھیں۔ ملازمہ ان کے لیے سیب کاٹ رہی تھی۔ اسے بھیج کر وہ خود ہی ان کے پاس بیٹھ کر سیب کاٹنے لگی۔ گاہے بگاہے ان کی آنکھوں میں بھی دیکھ لیتی۔ گزشتہ شب فارس کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی کا کوئی تاثر ان کے چہرے پر نہیں تھا۔ ناشتے پر بھی دونوں ماں بیٹا معمول کی طرح بات چیت کرتے رہے تھے جیسے ان کے مابین کوئی اختلاف رہا تھا نہ کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔

گلاس اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہوں نے قرآن بند کر دیا۔ چند لمحوں تک وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔

''تمہیں راز ملا جنت؟'' کچھ یاد آجانے پر انہوں نے نرمی سے پوچھا تھا۔

''کون سا راز؟'' بے ساختہ ہی سوال لبوں پر آیا تھا۔

''عسر یسرا کا راز۔''

ایک کمحے کو رک کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا پھر آہستگی سے گردن نفی میں ہلا دی۔

''راز اتنی آسانی سے منکشف نہیں ہوتے آنٹی! ہم جیسے گناہ گاروں پر تو شاید..... شاید بالکل بھی نہیں۔''

''اگر راز منکشف نہ ہوتے تو کوئی گناہ گار تائب نہ ہوتا، کافر مسلمان نہ ہوتا، بھٹکے ہوئے راہ نہ پاتے، مومنین کا خطاب نہ پاتے۔''

کافی ٹیبل پر پلیٹ رکھ کر وہ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ سجائے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''غور کرنے کے لیے، تدبر پانے کے لیے، چھپے ہوئے معانی کو واضح کرنے کے لیے وقت چاہیے، ہمت چاہیے، یقین چاہیے، طلب چاہیے۔ اپنے اندر کے سوال کو سمجھو جنت! یو ویونٹ ریگریٹ اٹ۔'' انہوں نے سیب کی قاش اٹھائی تھی۔

جنت خاموش رہی۔ سر جھکا رہا۔ انگلیاں مسلتے ہوئے اب وہ کچھ مضطرب نظر آرہی تھی۔

''تم نے دعائیں کیوں چھوڑ دیں؟'' کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا تھا۔

اور جنت نے بھی جواب دینے میں کچھ وقت لیا تھا۔

''میں جو مانگتی رہی ہوں اللہ نے وہ مجھے نہیں

دیا۔" اس کی آواز غم سے بوجھل تھی۔
"کب تک مانگتی رہی ہو؟"
جنت کو ان کا سوال سمجھ میں نہ آیا۔ سر اٹھا کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
"کب تک؟ سال..... دو سال..... تین سال..... چار سال..... دس سال..... بیس سال؟ سو سال؟"
وہ دم سادھے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔
"زکریا علیہ السلام نے تو ہمت نہیں ہاری تھی جنت! بوڑھے ہو گئے تھے، بیوی بانجھ تھی تب بھی انہوں نے اولاد کی دعا مانگنا ترک نہیں کی تھی۔"
جنت سن ہوئی تھی۔ کون سی بات کہاں آ کر واضح ہوئی تھی۔ کون سا پیغام کہاں آ کر ملا تھا۔
"انبیاء کی ایک خاصیت یہ بھی تھی۔ وہ دعائیں ترک نہیں کرتے تھے، صبر کرتے تھے اور مانگتے رہتے تھے۔"
جنت نے کچھ نہ کہا۔ وہ کچھ کہنے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔
"سوال تمہیں اس آیت تک لائے گا جنت! سوال ہی تمہیں اس کے معانی سمجھائے گا۔"
کون کہہ سکتا تھا وہ اس کی ساس تھیں۔ ایک معلمہ تھیں جو اس کے اندر کی گتھیاں سلجھانے میں جت گئیں تھیں۔

☆☆☆

خواب بھیانک تھا..... آوازیں تکلیف دہ.....
"امی! امی!" وہ چیختے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ سر سے پیر تک پسینے میں شرابور، لرزتا کانپتا وجود..... اور بھاری نفس۔
"یہ روز روز کا کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔"
اگلے ہی لمحے وہ اس کے سر پر دھاڑا تھا۔ کچھ خواب کی وحشت تھی اور کچھ فارس کی دہشت..... وہ سہم کر رہ گئی۔
جانے وہ اب کیا کہہ رہا تھا۔ کس بات پر چلا رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا۔ یاد تھا تو بس یہی کہ بازو سے پکڑ کر اس نے اسے کمرے سے نکال باہر کیا تھا۔ ہاں یاد تھی تو دروازہ بند ہونے کی وہ آواز جو کافی دیر تک اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔
وہ ابھی تک اپنے خواب کے اثر میں تھی۔ لرز رہی تھی۔ کپکپا رہی تھی۔ وحشت و بے سکونی کی دلدل میں اترتی جا رہی تھی۔
وہ رات! وہ اس کی زندگی سے نکل کیوں نہیں جاتی؟
ننگے پیر، ٹھنڈے فرش پر بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے گرد بازو باندھ لیے۔ سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔
"جنت نہیں! جنت پلیز! جنت میرا بچہ۔"
"مجھے بخش دو اللہ کے لیے۔" اپنے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی ساری برداشت اسی آواز پر ختم ہو جاتی تھی۔ یہی چیخ..... یہی پکار اس کی دھجیاں بکھیر دیتی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ خود کو نوچ کھسوٹ ڈالے، زخمی اور لہولہان کر لے۔
"ساری زندگی تم نے امی کو دکھ دیئے ہیں..... ساری زندگی تم ان کے لیے مصیبت بنی رہی ہو جنت، اور اب یہ....." آوازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔
"امی! امی!!! امی دروازہ کھولیں۔"
وہ حواس باختہ ہو کر دروازہ بجانے لگی۔
"فارس دروازہ کھولو پلیز۔"
راہداری کا ملگجا اندھیرا روشنی میں بدل گیا تھا۔ مارچ کی وہ شب اپنی تمام تاریکیوں کے ساتھ اس کے دماغ میں حلول کر گئی تھی۔
"پلیز دروازہ کھولو فارس!!! خدا کے لیے۔" وہ گڑگڑائی۔
"بی بی جی ماہین بی بی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" گاڑی کا ہارن کہیں دور سے بجا تھا۔
"فارس۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگی۔ مگر دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اس رات بھی نہیں کھلا تھا۔

"ماہین..... برہان واصف کی دوسری بیوی۔"

وہ دروازے سے گھسٹ کر نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اپنی چیخوں کا گلا بس وہ ایسے ہی گھونٹ سکتی تھی۔

تمام مناظر فلم کی طرح دماغ کی سکرین پر چلنے لگے۔ وہ ہانپتی، کانپتی، شدت سے روتی سٹڈی روم میں بند ہوگئی۔

ٹھنڈے فرش پر ٹانگوں کو سینے سے لگائے وہ ساری رات ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی تھی۔

☆☆☆

اور بند دروازہ صبح کے سات بجے کھلا تھا۔

ہمیشہ کی طرح نک سک سے تیار وہ آفس ٹیبل کی جانب بڑھا تھا۔ جنت دروازے کی بائیں طرف فرش پر گھٹنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ سر اٹھائے سرخ و متورم آنکھوں سے اب اسے دیکھنے لگی تھی۔

"یہ کاغذی رشتہ ہے، کاغذ تک محدود رہے گا۔"

اطراف سے یکسر بے نیازی برتتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ کیس میں لیپ ٹاپ رکھا، اپنی فائل اٹھائی۔ کچھ ضروری ڈاکومنٹس اور پرنٹ آؤٹس کا سرسری سے جائزہ لیا اور پھر اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتا اسٹڈی سے چلا گیا۔

"یہ احساس کتنا اذیت ناک ہوتا ہے کہ آپ موجود ہوں اور کوئی آپ کو "عدم" کر دے۔ آپ ماورائی ہو جائیں، نظر ہی نہ آئیں۔" آنسو بہت پہلے خشک ہو چکے تھے۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ عادتاً اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی بائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے پتھر ہوئی بیٹھی تھی۔

"ٹوٹا ہوا انسان یا تو سانس کی طرح ساکن ہو جاتا ہے یا پھر سمندری لہروں کی طرح سرکش۔"

کس قدر کوشش سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ الجھے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر اسٹڈی سے باہر آ گئی۔ اس کا رخ بیڈ روم کی طرف تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واش بیسن پر جھکی ہوئی تھی۔ پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے بال بنا رہی تھی۔ فریش ہو کر نیچے آئی تو ڈائننگ ہال میں مسز شیرازی اور فارس موجود تھے۔

اس کی روئی روئی سی آنکھیں سوجی ہوئی اور متورم لگ رہی تھیں مگر چہرے پر بشاشت تھی... لبوں پر مسکراہٹ۔

ایک ایکٹنگ فارس کر رہا تھا۔ ایک وہ کر رہی تھی۔ دونوں کمال کے اداکار تھے۔

"وہ تمہیں عدم کر رہا ہے، اور تم اسے ایسا کرنے دے رہی ہو!"

اس نے فارس کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری تھا۔

کوئی انسان اتنا بے حس، اتنا بے رحم کیسے ہو سکتا ہے؟

"جب کوئی اپنے لیے خود بے رحم اور سفاک ہو جائے تو اسے دوسروں کی سفاکیت پر سوال نہیں اٹھانا چاہیے۔" وہی آواز.....

حلق میں ابھرتے آنسوؤں کے پھندے نیچے اتارتے ہوئے وہ پلیٹ پر جھک گئی۔ چھری کانٹے کی مدد سے چیز آملیٹ کھاتے ہوئے اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ وہ فارس کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر نگاہیں تھیں کہ بار بار اس کے پرسکون اور مطمئن سے چہرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

وہ اپنے یتیم بھتیجے کو اپنی سرپرستی میں لینے کو تیار نہ تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں کوئی مقام دینے کو آمادہ نہ تھا۔ ایسے انسان سے محبت تو دور کی بات..... رحم کی امید بھی نہیں رکھی جا سکتی تھی اور وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ اس کا دل نرم ہو جائے گا؟ وہ اسے صرف اذیت صرف برداشت کر رہا تھا، اور جنت اس کی برداشت میں گنجائش دیکھ رہی تھی؟

"پچھلی بار خالہ آئی تھیں، اس بار کوئی نہیں آئے گا۔ اس بار تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔"

اس نے چائے کے گھونٹ کے ساتھ کئی آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔

ناشتے کے بعد وہ مسز شیرازی کے ساتھ لان میں آ گئی تھی۔ لان چیئرز پر ان کے سامنے وہ دھوپ میں بیٹھی تو وہ اسے بغور سے دیکھنے لگیں۔

''تم ساری رات روتی رہی ہو؟'' انہوں نے اتنے اچانک سے پوچھا کہ لمحے بھر کے لیے وہ کمزور پڑ گئی۔ آنکھوں کے کنارے نم ہوئے، ہونٹ کپکپا کر رہ گئے، دل چاہا وہ سب کچھ ان کے گوش گزار کر دے مگر۔

''نہیں اصل میں سر درد کی وجہ سے میں ٹھیک سے سو نہیں پائی! نیند پوری نہ ہو تو میری آنکھیں ایسی ہو جاتی ہیں۔''

مسز شیرازی نے اس کے وضاحتی جواب کو خاموشی سے سنا پھر وہ سامنے املتاس کے ان درختوں کو دیکھنے لگیں، جو بیرونی دیواروں پر جھکے ہوئے تھے۔ معمول کے برعکس وہ کچھ خاموش سی تھیں۔

''فارس تمہارے ساتھ کیسا ہے؟''

چند روز قبل انہوں نے پوچھا تھا۔ آج دوبارہ پوچھ رہی تھیں۔ چند روز قبل آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تھا۔ آج آنکھیں چرا کر پوچھ رہی تھیں۔

''بہت اچھا ہے۔'' ہمیشہ کی طرح اس کی مسکراہٹ آنکھوں تک نہیں پہنچی تھی۔ اس نے ابھی تک فارس کے جارحانہ رویے کی بھنک انہیں نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھیں، بیمار رہتی تھیں۔ اسے احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سامنے فارس بھی کس قدر محتاط ہو جاتا تھا اور کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' جنت کو تشویش ہوئی تھی۔

انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر ہنس دیں..... جانے انہیں ہنسی کس بات پر آئی تھی مگر اس ہنسی میں بھی ایک بے بسی تھی۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' جنت کے گال پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولیں۔ ''تمہاری طرح میں بھی ٹھیک سے سو نہیں پائی۔''

جنت نم آنکھوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ دونوں کا اپنا ایک درد تھا، اور دونوں ہی ایک دوسرے سے چھپانا چاہ رہی تھیں۔

جنت نے گہرا سانس کھینچ کر ہیئر مان جیسے کی کتاب کھول لی تھی۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں وہ اب مطلوبہ صفحہ تلاش رہی تھی۔

جو انسان اپنے یتیم بھتیجے کے لیے بے رحم ہو وہ اس کے لیے رحمدل کیسے ہو سکتا ہے؟ جو نکاح جیسے مضبوط رشتے کا مذاق بنا دے۔ اس انسان سے وہ کسی اچھائی کی امید رکھ بھی کیسے سکتی ہے؟ اس نے سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا، وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھیں، نگاہیں دور کہیں بھٹک رہی تھیں۔ چہرہ کسی پوشیدہ درد کی عکاسی کر رہا تھا۔

''تم ایک بار پھر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ رہی ہو جنت! تم ایک بار پھر وہی غلطی دہرا رہی ہو۔''

کتاب پر اس کی انگلیوں کی گرفت یکا یک مضبوط ہوئی تھی۔

''ٹوٹا ہوا انسان یا تو سانس کی طرح ساکن ہوتا ہے یا پھر سمندری لہروں کی طرح سرکش۔'' نانا اکثر کہا کرتے تھے۔

مگر جو ساکن ہوتا ہے، اسے سرکش ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی۔ یہ بات اب وہ فارس وجدان کو بتانے والی تھی۔

☆☆☆

آفس سے واپسی پر کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

کھڑکیوں کے پردے، بیڈ شیٹ، دیواروں کی پینٹنگز، ڈیکوریشن پیس حتیٰ کہ وہ صوفہ تک بدل چکا تھا جو اس کے بیڈ روم کی مشرقی دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کا سمیٹک کے سامان سے سجی تھی۔ بیڈ سائڈ اور کافی ٹیبلز پر تازہ پھولوں کے گلدان

رکھے تھے۔ زندگی سے بھرپور فضا معطر سی تھی۔ مگر یہی معطر فضا اس کے تنفس پر کتنی بھاری پڑ رہی تھی یہ صرف وہی جانتا تھا۔

سامنے ہی جنت وارڈ روب کھولے، اس کی کچھ شرٹس ہاتھوں میں لیے اپنے کام میں مگن کھڑی تھی۔

لیپ ٹاپ کیس بیڈ پر پٹختے ہوئے وہ انتہائی غصے کے عالم میں اس کی جانب بڑھا تھا۔ بازو سے پکڑ کر اپنے کپڑے اس کے ہاتھوں سے جھپٹ کر درشتی سے اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔

''یہ کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہو تم۔'' اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

''اپنا کام۔'' فارس وجدان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جب وہ بولی تو اس کے لہجہ ہموار تھا۔

''میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟''

''ایسے ہی! سوچا شوہر کو اپنے حقوق و فرائض کا خیال نہیں ہے تو میں ہی کرلوں،'' اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا تھا۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

نہ خوف کا تاثر تھا۔ نہ وحشت تھی آنکھوں میں اور نہ گھبراہٹ!

''میرے معاملات میں دخل اندازی بند کرو ورنہ.....'' فارس نے وارڈ روب سلائڈ کر کے زور سے بند کر دی تھی۔

''ورنہ کیا؟'' سوالیہ ابرو اٹھا کر اس نے پوچھا۔

فارس کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے کے لیے بدلے تھے۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سوال دہرانے والی یہ وہ لڑکی تھی جو سر اٹھا کر اس سے بات تک کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔

''میں نے تمہارے جوتوں کا سٹاک بھی سیٹ کر دیا ہے۔ تمہاری ٹائیز اس ڈرا میں ہیں، تمہری پیس سوٹ یہاں لٹکا دیئے ہیں۔ کف لنکس اور رسٹ واچ.....''

اگلے ہی لمحے اس کی گردن فارس کے آہنی شکنجے میں تھی اور چوڑیوں سے بھری داہنی کلائی اس کے بائیں ہاتھ میں..... جنت کا دماغ بھک سے اڑا۔ وہ اس حملے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں تھی۔

''ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' اس کی سخت پتھریلی آواز اور آنکھوں کا تاثر جنت کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا گیا۔

''چھ..... چھوڑو..... مجھے.....'' اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس رکنے لگا۔

''ذرا دوبارہ کہیے میں نے سنا نہیں۔'' فارس کی گرفت بڑھتی گئی۔ کلائی پر بھی، گردن پر بھی۔ اسے لگا وہ بس مرنے کو ہے۔

''ہو کون تم؟ اوقات کیا ہے تمہاری؟''

جنت کا چہرہ تکلیف کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور سانس..... سانس تو جیسے اسے آ ہی نہیں رہا تھا۔

''آخری بار۔'' اس کی خوف سے پھیلی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے فوکس میں لیتے ہوئے وہ غرایا ''آخری بار تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کر رہا ہوں اگلی بار تم نے ایسا کچھ بھی کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

ایک جھٹکے سے اسے چھوڑتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ گیا۔ جنت کھانستے ہوئے نیچے گر گئی تھی۔

غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے پھولوں کے گلدان فرش پر دے مارے تھے۔ پھر وہ اسی طیش کے عالم میں کمرے سے نکل گیا تھا۔ جنت کا منہ پھولا ہوا تھا، داہنا ہاتھ گردن پر ٹھہرا تھا، چہرہ رنگ اڑا ہوا، آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں

کچھ ہی دیر میں ملازمہ اندر آئی تھی، ذرا گھبرائی ہوئی سی عجلت میں صفائی کرنے لگی تھی۔ اس بھولے سے بھی جنت کی طرف نہیں دیکھا تھا، نہ بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ آرڈر سخت تھا۔ فارس کے ملازم صرف فارس کی ہی سنتے تھے۔

انتہائی کوشش سے اٹھ کر وہ سیدھا ٹیرس پر چلی آئی تھی۔ بادلوں بھری شام..... کچھ اداس..... کچھ ویران سی تھی۔ دور کہیں بجلی چمکی تھی۔ بادل بھی گرجے تھے۔ ریلنگ پر جھک کر اس نے خود پر قابو پانے کی سعی کی تھی.. آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پلکیں جھپکا جھپکا کر روکا تھا۔

وہ آج رونا نہیں چاہتی تھی۔ تنہائی میں بھی نہیں۔ اگر وہ پہلی چوٹ پر ہی خود کو زمین بوس ہونے سے نہ بچا پائی تو پھر کبھی اٹھ نہیں پائے گی۔ اگر آج بھی وہ خوف میں آ گئی تو کچھ بھی بدل نہیں پائے گی۔

اسے ہمت نہیں ہارنی تھی۔ حوصلہ نہیں چھوڑنا تھا۔ ایک بار پھر اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اس نے سرخ پڑتی آنکھوں کو بیدردی سے رگڑ ڈالا تھا۔ سسکیوں کو دبا لیا تھا۔ اذیت کو چھپا لیا تھا اور تب ہی کسی احساس کے تحت اس نے اپنی چوڑیوں بھری کلائی کو چھوا تھا۔

تیز ہواؤں کے ساتھ بارش کی پہلی بوند اس کی پیشانی پر گری۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

طلوع آفتاب سے پہلے رات کتنی تاریک ہوتی ہے۔

اور طوفان سے پہلے خاموشی کتنی مہیب لگتی ہے۔

''کچھ لوگ اپنی کشتیاں خود جلاتے ہیں۔ کچھ کی جلا دی جاتی ہیں۔''

''جن کی جلا دی جائیں انہیں کیا کرنا چاہیے؟''

''انہیں زیادہ ہمت، زیادہ صبر، زیادہ قوت دکھانی چاہیے۔''

بارش شروع ہو چکی تھی۔

زیادہ ہمت۔ زیادہ صبر۔ زیادہ قوت!

وہ ٹیرس کی سیڑھیاں اتر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اپنی اسٹڈی سے باہر نکلتا فارس بھی اسی طرف آ رہا تھا۔

بیڈ روم کے سامنے ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے فارس کو دیکھا پھر اندر داخل ہوتے ہی دروازہ زور سے بند کر دیا۔ عین اس کے منہ پر۔

فارس کا دماغ بھک سے اڑا۔ وہ اس کی جرأت پر شاکڈ رہ گیا تھا۔

شدت سے دھڑکتے دل اور پھولے تنفس کے ساتھ وہ دبے قدم پیچھے ہٹ گئی تھی، مٹھیاں سختی سے بھینچے اب سر اٹھائے کھڑی تھی۔

فارس نے شدید غصے کے عالم میں دروازہ دھڑ دھڑایا، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلی تھی۔ اب وہ اپنے کسی ملازم پر برس رہا تھا۔

جنت تکیہ اور بلینکٹ اٹھائے صوفے کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل گیا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' آندھی طوفان کی طرح وہ اس کے سر پر پہنچ کر دھاڑا تھا۔

''تم کرو تو حق ہے تمہارا۔ میں کروں تو بدتمیزی۔'' وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ فارس شعلہ بار نگاہیں اس پر جمائے کھڑا رہا۔

بادل کچھ شدت سے گرجے تھے۔ بجلی بھی چمکی تھی۔ دیوار گیر کھڑکیوں پر بارش کے قطرے اب کچھ زیادہ ہی روانی سے گرنے لگے تھے۔

''خیر لگی ہو تم، چابی ہے تمہارے پاس! جن کے پاس نہیں ہوتی انہیں پھر کسی دھتکارے ہوئے انسان کی طرح کسی تاریک کمرے کے ٹھنڈے فرش پر رات گزارنی پڑتی ہے۔''

سر اٹھائے، اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ جس انداز اور لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی، وہ کچھ بھی تھا مگر نرم نہیں تھا۔ لفظ جیسے مشتعل تھے۔ آگ پکڑے ہوئے... ضبط کے مراحل سے گزر کر تحمل سے ادا کیے ہوئے۔

''میں تمہیں وارن کر رہا ہوں.....''

''وارن میں تمہیں کر رہی ہوں۔'' انگلی اٹھا کر اس نے فارس کی بات درستی سے کاٹ دی تھی۔

مٹھیاں سختی سے بھینچے، لب باہم پیوست کیے فارس برداشت کی انتہا پر کھڑا تھا۔

''آخری بار میں تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کر رہی ہوں۔ اگلی بار تم نے ایسا کوئی بھی سین کریئیٹ کیا، یا مجھے اپنے معاملات سے دور رکھنے کی کوشش کی تو میں خاموش نہیں رہوں گی۔ میں آنٹی کو سچ سچ میں اس نکاح کی حیثیت سے آگاہ کردوں گی جو تمہارے نزدیک فقط ایک کانٹریکٹ ہے۔'' اس نے سخت لہجے اور صاف لفظوں میں اس پر اپنے ارادے واضح کر دیئے تھے۔ ''میں انہیں بتادوں گی تم ان کی موت کا انتظار کر رہے ہو تا کہ مجھ سے جان چھڑا سکو۔''

''جسٹ شٹ اپ۔'' وہ حلق کے بل دھاڑا۔

''کیوں؟ کیا تم ایسا نہیں چاہتے؟ میں اس گھر میں آنٹی کی وجہ سے ہوں، کیا تم نے مجھ سے یہ نہیں کہا؟'' وہ چلائی۔

فارس ضبط کر گیا۔

''کیا تم نے مجھ سے یہ نہیں کہا یہ نکاح صرف کاغذ تک محدود رہے گا؟ ہاں یا نہیں۔''

دوسری طرف خاموشی تھی۔

''یہ آخری وارننگ ہے! میں بتا رہی ہوں میں خاموش نہیں رہوں گی۔''

صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اس نے بلینکٹ اپنے وجود پر پھیلا لیا۔ دوبارہ اس نے فارس وجدان کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

جنت کمال اپنے ارادوں میں کتنی سنجیدہ ہے اس کا اندازہ فارس وجدان کو اگلے دن ہی ہو گیا تھا جب مسز شیرازی نے اسے جنت کو شاپنگ پر لے جانے کا کہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک تو وہ صدمے کی کیفیت میں کھڑا رہا تھا۔

میٹنگ، کاروبار، اور کمپنی سے متعلق حیلے بہانے اس کے کسی کام نہیں آسکتے تھے کہ آج چھٹی کا دن تھا۔ اور چھٹی کا دن وہ زیادہ تر مسز شیرازی کے ہمراہ گھر پر گزارتا تھا۔

اس نے خونخوار نگاہوں سے جنت کو دیکھا جو رائل بلیو ڈریس میں اس کے ساتھ شاپنگ پر جانے کے لیے مکمل تیار کھڑی تھی۔

مسکراہٹ تو مسز شیرازی کے سامنے وہ ہمیشہ لبوں پر سجائے رکھتی تھی مگر آج فارس وجدان کو اس کے لبوں کا تبسم اپنا مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آنکھوں میں تضحیک نظر آئی۔ انداز طنزیہ لگا۔ مگر وہ ضبط کر گیا۔ اسے اب ضبط ہی کرنا تھا۔ مزید کوئی بدمزگی وہ نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی وہ چاہتا تھا کہ وہ مزید باغیانہ انداز اپنا لے۔

گاڑی کی چابی اور موبائل سنبھالتے ہوئے اٹھا تو جنت بھی مسز شیرازی سے مل کر اس کے پیچھے باہر آگئی۔

پیسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے ہینڈ بیگ گود میں رکھ لیا تھا اور اس کے چہرے کے طوفانی تاثرات کو نظر انداز کرتی کھڑکی سے باہر ہی دیکھتی رہی تھی۔ دوڑتے بھاگتے مناظر کے ساتھ وہ بھی کسی دوڑ میں شامل ہو گئی تھی۔

لب بھینچے، دانت پیستے اور اسٹیرنگ وہیل پر خطرناک حد تک گرفت مضبوط کیے وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ رفتار بڑھائے اور گاڑی کسی ٹرک میں دے مارے... خود بھی مر جائے اور اس جنت کو بھی مار ڈالے۔

پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ شہر کے بہترین مال کی پارکنگ میں گاڑی روک چکا تھا۔ جنت فوراً سے باہر نکل گئی تھی مگر وہ گاڑی میں ہی بیٹھ رہا تھا۔

''میرے خیال سے تم مجھے یہاں شاپنگ کے لیے لائے ہو۔''

اس نے جذبات کی شدت سے سرخ ہوتی آنکھوں سے جنت کو دیکھا... وہ کھڑکی میں کہنیاں جمائے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''یا پھر چاہتے ہو کہ میں آنٹی کو فون کر کے کہوں کہ تم میرے ساتھ مال کے اندر جانے کو تیار نہیں ہو؟''

وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بھی اسے دیکھتی رہی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ مسکرا رہی تھی اور وہ دانت کچکچا رہا تھا۔

''تو یہ تمہارا اصلی رنگ ہے۔''

اور جنت ہنس دی۔ پھر کافی دیر تک ہنستی ہی رہی۔ وہ مٹھیاں بھینچے اسے سرد نظروں سے دیکھتا رہا۔

''تم اپنی ماں کے حوالے سے جانے کتنی بار مجھے اس رشتے کی نوعیت جتا چکے ہو، اور جب میں جتانے پر آئی ہوں تو بات میرے روپ پر آ گئی ہے۔'' وہ ایک بار پھر ہنسی.. جیسے فارس کے سوال نے اسے کافی محظوظ کیا ہو۔

ناچار اسے گاڑی سے باہر آنا پڑا۔ پھر بگڑے تیوروں کے ساتھ وہ لیدر جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مختلف شاپس میں اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ وہ اس کا صبر آزما رہی تھی۔ گھوم رہی تھی اور کچھ خرید بھی نہ رہی تھی۔

وہ بار بار کلائی موڑ کر وقت دیکھتا تھا، موبائل نکال کر اسکرولنگ کرتا تھا اور جب سر اٹھا کر اسے دیکھتا تھا تو وہ تب بھی اسے خالی ہاتھ ہی نظر آتی تھی۔ اسے غصہ تو بہت چڑھا ہوا تھا مگر وہ ضبط کیے رہا۔

پارہ تو اس کا اس وقت ہائی ہوا جب وہ بچوں کی شاپ میں داخل ہو گئی تھی۔ اور اب اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی منی منی سی اشیا اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ بچوں کے پورشن میں کچھ رش تھا۔ وہ بچوں کے پورشن میں کھڑی تھی۔ اور چیزیں پسند کر کے اب ٹرالی میں رکھ رہی تھی۔

فارس کی رگیں پھول گئیں... وہ ضبط کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔

موزے، کپڑے، فیڈر، کھلونے اور جانے کیا کچھ خرید کر وہ کاؤنٹر پر آ گئی۔

پے منٹ کے لیے اس نے فارس کو دیکھا جس نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے والٹ سے کریڈٹ کارڈ نکال کر سیلز بوئے کو دیا۔

''بس ہو گئی میری شاپنگ۔'' پے منٹ ادا کر کے جب وہ باہر نکلے تو وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ فارس اس لمحے کیسا نظر آ رہا تھا یہ دیکھنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے تھا اور وہ اس کے پیچھے، لبوں پر تبسم تھا، آنکھوں میں شرارت۔

اس کی توقع کے عین مطابق وہ سامنے لیڈیز گارمنٹس کی شاپ میں داخل ہو چکا تھا۔ اسٹینڈ پر لٹکے چند ریڈی میڈ برانڈ کے جوڑوں کا آرڈر دے کر اس نے کریڈٹ کارڈ نکالا تھا۔

جنت گلاس وال کے اس پار کھڑی تھی اور اپنے لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو بار بار دبانے کی سعی کر رہی تھی۔

سیلز بوئے نے ڈریسز پیک کر کے دیئے تو وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ باہر آ گیا۔

''پکڑو انہیں۔'' انداز منہ پر مارنے والا تھا، جنت بروقت نہ پکڑتی تو شاپنگ بیگز فرش پر ڈھیر ہو جاتے۔

''اس کی کیا ضرورت تھی فارس!'' اس نے بہت لاڈ سے پوچھا۔

''ضرورت تو تھی۔'' فارس نے دانت کچکچائے۔ (ظاہر ہے گھر پہنچتے ہی اس کی ممی نے شاپنگ سے متعلق پوچھنا تھا اور جنت نے بچوں کے کپڑے دکھانے تھے!)

اور تب ہی۔ ہاں شاید تب ہی جیولری شاپ سے نکلتی جینز اور ٹاپ میں ملبوس ایک سٹائلش سی لڑکی ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔ شاپنگ بیگ پر اس کی گرفت یک دم مضبوط ہوئی تھی۔ آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر ابھر آیا تھا۔

اس نے پہلے فارس کو دیکھا تھا۔ اب وہ جنت کو دیکھ رہی تھی۔

صدمہ۔ حیرت۔ بے یقینی۔ شاک!

فارس جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔ لبوں پر شرارتی مسکراہٹ سجائے جنت بھی عجلت میں قدم اٹھاتی اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اور تب ہی اسے اپنے

وجود پر بے نام سی تپش کا احساس ہوا تھا۔
فارس کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے یونہی مڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ جینز اور اورنج رنگ کی ٹاپ شرٹ میں ملبوس لڑکی نے فوراً سے رخ بدل لیا تھا۔
سر جھٹک کر جنت فارس کے ہمراہ ایلیویٹر کی جانب بڑھ گئی۔
واپسی کا سفر بہت خاموشی سے کٹا تھا۔ اتنی خاموشی سے کہ جنت کو لگا فارس سانس بھی نہیں لے رہا۔
''ممی کو یہ سب دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس نے خاموشی کا قفل توڑا تھا.. تیور زیادہ بگڑے ہوئے تھے مگر وہ متحمل لگ رہا تھا۔
''اور جب وہ پوچھیں کہ شاپنگ دکھاؤ تب کیا کروں؟'' اس نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ مانگا۔
''کچھ بھی دکھا دینا مگر یہ نہیں۔'' فارس نے جیسے وارن کیا تھا۔
کتنی عجیب بات تھی کہ ان کے درمیان جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ پورے ایک ماہ بعد خاموشی ٹوٹی بھی تھی تو کیسے!!
''کیوں؟ یہ کیوں نہ دکھاؤں؟ میری طرح وہ یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔''
''آئی سوئیر اگر تم نے ایسی کوئی بھی حرکت کی تو میں.....'' وہ ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔
''اوکے اوکے فائن۔'' جنت نے جیسے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''وہی شاپنگ دکھادوں گی نا جو تم نے اپنی پسند کی کروائی ہے۔'' ایک ادا سے گاڑی کا دروازہ کھول کر وہ باہر تھی اور اندر ٹھنڈا ہوتا فارس مزید شعلوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔
''آج شام کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔'' قدم بڑھاتے ہوئے وہ کہنا نہیں بھولی تھی۔
فارس وجدان نے شدید غصے کے عالم میں اپنا داہنا ہاتھ اسٹیرنگ پر دے مارا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن آفس سے واپسی پر صدر دروازہ کھلتے ہی اسے جو پہلا چہرہ نظر آیا تھا وہ جنت کمال کا چہرہ تھا، نک سک سے تیار، فریش اور نکھرے وجود کے ساتھ وہ اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ فارس کی پیشانی پر بل آگئے۔
مسز شیرازی لاؤنج میں ہی موجود تھیں تبھی اپنے تاثرات نرم رکھتا وہ دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا تو ملازمہ کو ڈائننگ ہال میں کھانا لگانے کا حکم دیتے ہوئے جنت کمال بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ ضبط کر کے وہ مسز شیرازی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان سے بات چیت کرنے لگا۔ اس دوران جنت زبردستی کی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالتی رہی۔
ڈائننگ ٹیبل پر تو اس نے انتہا کر دی۔
''فارس یہ فش کباب ٹرائے کرو، میں نے خاص کر تمہارے لیے بنائے ہیں۔'' اس کے برابر میں بیٹھ کر، اس کی پلیٹ میں خود سے کھانا نکالتے ہوئے وہ اس سے یوں مخاطب ہو رہی تھی جیسے ان کے مابین اس طرح بات چیت ہوتی رہتی ہو، فارس کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ سامنے مسز شیرازی موجود تھیں اب نہ تو وہ غصہ دکھا سکتا تھا، نہ ہی اس کے ہاتھ جھٹک سکتا تھا۔
''بریانی کیسی لگی؟''
چمچے کو سختی سے دباتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔ ''ٹھیک ہے۔''
''صرف ٹھیک ہے؟ میں نے اتنی محنت سے بنائی ہے۔''
مسز شیرازی نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا۔
''اور یہ پاستا بھی لو نا۔''
''نہیں بس کافی ہے۔'' اس نے ضبط کرتے جنت کو روکا۔ لیکن وہ نہیں رکی۔ اپنی من پسند ڈشز اس کی پلیٹ میں زبردستی ڈالتی رہی۔
شام کے کھانے کے بعد وہ مشتعل اعصاب

کے ساتھ لان میں کافی دیر ٹہلتا رہا تھا۔ گہری سانسیں لیتے ہوئے خود پر، اپنے غصے پر کنٹرول پانے کی ہر کوشش کرتا رہا تھا۔ رات گئے تک جب وہ کچھ حد تک اپنے اعصاب پر قابو پا چکا تو اس نے کمرے کا رخ کیا تھا۔ اور ایک بار پھر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

بیڈ پر درمیان میں کشن رکھ کر حد بندی کیے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے جنت کمال آرام سے بیٹھی تھی۔ کمفرٹر ٹانگوں پر پھیلا رکھا تھا۔ موبائل ہاتھوں میں تھا۔

''یہاں کیا کر رہی ہو تم۔'' وہ دبی آواز میں غرایا تھا۔

جنت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مشتعل نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ لان میں ٹہلتے وقت اس کے تاثرات اتنے خوفناک تو ہرگز نہ تھے۔

''مجھے صوفے پر ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔''

''یہ میرا مسئلہ نہیں۔'' درشتی سے بازو سے پکڑ کر فارس نے اسے بیڈ سے اٹھا دیا تھا۔

پھر انگلی دکھا کر اسے وارن کرتے ہوئے پہلے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر دروازے کا راستہ دکھا دیا۔

کہ سونا ہے تو وہاں سو جاؤ ورنہ اس کمرے سے نکل جاؤ۔

جنت لب بھینچے اپنی جگہ کھڑی رہی۔

وہ بیڈ سے کشن ہٹا کر یہاں وہاں پھینکنے لگا۔

وہ کچھ دیر تک اندھیرے میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آنکھوں میں ابھرتی نمی کو پیتے ہوئے یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو کوئی بات نہیں۔ پھر کشن وغیرہ اٹھائے اپنے صوفے کی جا سوئی۔

☆☆☆

''مجھے تمہارا فون نمبر چاہیے۔'' صبح سویرے وہ بیگ اور مطالبے کے ساتھ حاضر تھی۔

کف لنکس لگاتے ہوئے فارس وجدان نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ سفید پر نٹڈ ٹیس پر زرد رنگ کے ٹراؤزر میں ملبوس، وہ نکھری نکھری سی بہت فریش لگ رہی تھی۔ بالوں کا اوپر سے پف بنا کر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ ہونٹوں پر لپ گلوز کی گلابی چمک۔

نظر ہٹا کر اس نے رخ بدلا اور ٹائی کی ناٹ باندھنے لگا۔ وہ گھوم کر سامنے آ گئی۔ ''کچھ کہا ہے میں نے۔''

وہ سنی ان سنی کیے رسٹ واچ کلائی پر چڑھانے لگا۔

''اب کیا میں آنٹی سے تمہارا فون نمبر مانگتی اچھی لگوں گی؟ کیا سوچیں گی وہ تمہارے بارے میں؟''

فارس کی آنکھوں کی سرخی گہری ہوئی۔ موبائل اس کے ہاتھوں سے کچھ سختی سے جھپٹ کر تیزی سے نمبر ٹائپ کر کے اس نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

''شکریہ! ویسے میں پہلی بیوی ہوں جسے اپنے شوہر کا نمبر شادی کے پورے ایک ماہ بعد ملا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے یوں کہا جیسے یہ بڑے اعزاز کی بات ہو۔

ٹائی کی ناٹ لگاتا وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

زیر لب مسکراتے ہوئے وہ بھی نیچے آ گئی تھی۔ ناشتے کی میز پر وہ مسلسل بولتی رہی۔ مسز شیرازی کے سامنے اسے بھی مجبوراً جواب دینا پڑ رہا تھا۔ تاثرات کچھ بہتر تھے مگر اس کی آنکھوں میں غصہ تھا، نفرت تھی، حقارت تھی۔

وہ آفس کے لیے اٹھا تو جنت بھی اس کے پیچھے باہر آ گئی۔ اب کی بار وہ سیڑھیوں پر نہیں رکی تھی۔ بلکہ اس کی گاڑی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ بیٹھ رہا تھا تو غصہ ناک پر ہی دھرا تھا۔ مگر جانے کیوں۔ وہ اپنے ان تاثرات کے ساتھ بھی اسے ہرگز برا نہ لگا۔

''اپنا بہت خیال رکھنا۔'' اس نے کہا۔ سنی ان سنی کیے وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ جنت تب تک وہاں کھڑی رہی جب تک وہ گاڑی نکال کر وہاں

سے چلا نہیں گیا تھا۔

اس دن پہلی بار اس نے فارس کو واٹس ایپ پر میسج کیا تھا۔

''کیسے ہو؟''

''کیا کر رہے ہو؟

''کیا خیال ہے آج شام کا ڈنر کہیں باہر کریں؟''

''تمہاری پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟''

''تم کافی زیادہ پسند کرتے ہو یا چائے؟''

''پسندیدہ کلر کون سا ہے تمہارا؟''

''تم اپنی بیوی میں کس طرح کی خوبیاں دیکھنا چاہتے ہو؟''

شام تک وہ فارس وجدان کے واٹس ایپ پر بلاک ہو چکی تھی۔

وہ گھر آیا تو ایک بار پھر وہ اسے اپنے انتظار میں صدر دروازے پر کھڑی ہوئی ملی تھی۔

''اب کیا میں آنٹی کو یہ بتاتی اچھی لگوں گی کہ تم نے مجھے واٹس ایپ پر بلاک کیا ہوا ہے؟'' مصنوعی خفگی کے ساتھ اس نے تیوری چڑھا کر اس سے پوچھا تھا۔

فارس ایک بازو پر کوٹ ڈالے، دوسرے ہاتھ میں ٹشوز کا پیک پکڑے پیشانی پر بل ڈالے کھڑا تھا، سفید شرٹ شکن لیے ہوئے تھی۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی۔ آج اس کی کچھ فارنرز کے ساتھ میٹنگ تھی تبھی وہ تاخیر سے گھر پہنچا تھا۔ کچھ تھکا ہوا بھی لگ رہا تھا۔

جنت کو محسوس ہوا جیسے اسے زکام کی شکایت ہو رہی ہو تبھی ٹشوز کا پیک بھی ہاتھوں میں ہی تھا۔

وہ اسے کوئی بھی جواب دیے بغیر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ ڈنر وہ باہر سے ہی کر کے آیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو کپڑے بدلے وہ بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ چھینکوں سے کچھ عاجز ہو کر کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔

پانی کا گلاس اور ٹیبلٹس سائڈ ٹیبل پر دھرے تھے۔

''تم ٹھیک ہو؟'' فکر مندی سے پوچھتے ہو۔
اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے ٹیبلٹس کی شیٹ
اٹھانا چاہی مگر فارس نے کہنی کے بل اوپر ہو۔
ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''اپنے کام سے کا
رکھو۔'' اس کی آواز نزلہ سے متاثر لگ رہی تھی۔

جنت نے اس کی سرخ پڑتی آنکھوں میں دیکھ
جن میں نمی تیر رہی تھی۔ پپوٹے بھاری اور سو۔
ہوئے لگ رہے تھے۔

''تمہارے لیے چائے یا قہوہ بنا لاؤں؟''

''اب مجھے تمہاری آواز نہ آئے۔'' اس۔
انگلی اٹھا کر متنبہ کیا پھر کمفرٹر کھینچتے ہوئے اپنا سر
میں گاڑ لیا۔

کچھ دیر تک تو وہ چھینکوں سے الجھا رہا۔ لیکن
پھر اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ پرسکون نیند سو رہا تھا
ادھر صوفے پر جنت کمال بے سکون بیٹھی تھی۔

اس نے خاموشی کا قفل توڑ دیا تھا۔ مگر فار
وجدان کی سرد مہری، نفرت اور حقارت تھی کہ کم ہو۔
میں نہیں آ رہی تھی۔ کتنا مشکل تھا وہ۔ سمجھ سے
باہر۔ نہ نفرت کی وجہ بتلاتا تھا۔ نہ اپنا کوئی نرم ر
دکھلاتا تھا۔

گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کمبل اور
اٹھایا اور سیٹنگ ایریا میں جا سوئی۔ وہ ہرگز نہیں چا
تھی اس کی وجہ سے آج فارس کی نیند خراب ہو۔

☆☆☆

''آئمہ کی کال تھی، اس کی فرینڈ کی انگیجم
ہے، مجھے بھی انوائٹ کیا ہے۔'' اپنی بات کے اختت
پر اس نے فارس کے تاثرات جانچے۔ شاید وہ م
دیر تک اپنا کام موقوف کر کے اس کی ذات کو اپنی تو
اور عنایت کے حصار میں لے لے۔ شاید وہ انکار
دے تو اور اس کا یہ انکار اس کے خیالات کی نفی
دے۔ یا پھر کھلے دل سے اجازت دے کر اپنی زند
میں اس کی موجودگی کو اہم کر دے۔ مگر دوسری طرف
ایک مکمل خاموشی تھی۔ نہ انکار۔ نہ اقرار۔ اس۔
جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ آفس ٹیبل کے سامنے کھڑ

رہی۔ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔ خاموشی ہی رہی۔

پھر وہ بھاری دل کے ساتھ اسٹڈی سے باہر آ گئی۔ مسز شیرازی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر کے آئمہ کو ڈن کا نج بھیج دیا۔ تیاری کرتے وقت بار بار اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ایسا کب تک چلے گا؟ آخر کب تک! کب تک وہ اپنی ''عزت'' کو ''ذلت'' کی نگاہ سے دیکھے گا؟

سیاہ اور گولڈن کنٹراسٹ میں نفیس کام والا فینسی ڈریس۔ جس کے گھیر، بازو اور گلے پر گولڈن کام ہوا تھا۔ میچنگ جیولری۔ سیاہ ہیلز۔ شہد بالوں کی پونی ٹیل بنائی۔ اطراف میں کچھ لٹوں کو نکالا۔ خود کو مضبوط کیے، خیالات جھٹلا کر اس نے مکمل تیاری کی۔ نو بجے اسے آئمہ لینے آ گئی تھی۔ جاتے وقت لمحے بھر کے لیے وہ اس کی اسٹڈی کے سامنے رکی تھی۔ پھر سر جھٹک کر باہر چلی گئی۔

شادی کے بعد وہ پہلی بار کوئی فنکشن اٹینڈ کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ نروس تھی۔ نہ تو اس طرح کے آزادانہ ماحول کی عادی تھی اور نہ ہی اس طرح کے ملبوسات پہنے تھے جن میں بیشتر خواتین اس کے سامنے گھوم رہی تھیں۔

یہ جگہ..... ماحول..... اور لوگ سب اس کے لیے نئے تھے۔

آئمہ نے اپنی دوستوں سے اس کا تعارف کرایا تو سب کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔

''تو یہ تھی وہ لڑکی جس سے فارس نے شادی کی ہے؟'' جنت کو فارس کی وجہ سے گفتگو کا مرکز بننا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔

دلہن کی بہن نیشا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آئمہ سے معذرت کرتی اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اسے ڈریسنگ روم میں لے آئی تھی جہاں دیوار گیر آئینے کے سامنے لڑکیوں کا ٹولا موجود تھا۔ کوئی لائنر لگا رہی تھی تو کسی کو اپنی لپ اسٹک سے مسئلہ تھا۔ کسی کو گہرے گلے نے تنگ کر رکھا تھا تو کوئی اپنے بالوں کو نئے سرے سے سیٹ کر رہی تھی۔

''گیس واٹ یہ میرے ساتھ کون ہے؟'' نیشا نے کھڑے کھڑے اعلان کیا۔ لڑکیوں کی گردنیں گھومیں۔ سب نے سرتاپیر اس کا جائزہ لیا۔ کچھ نروس ہو کر جنت نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''فارس کی بیوی! جنت!''

وہاں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں کھڑی تھی، وہی کھڑی رہ گئی۔

ان سب کے چہروں پر ایک سے تاثرات تھے۔ رشک اور حسد کے ملے جلے تاثرات۔ وہ سب کی سب ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا لباس، زیبائش، اطوار سب مختلف تھا۔ جنت کو یک دم اپنا آپ عجیب لگا۔ وہ ان میں مس فٹ تھی۔

''اوہ۔ تو یہ ہے وہ۔'' ساعت سے کھنکتی ہوئی خوب صورت آواز ٹکرائی۔ جنت نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ وہ اس کے دائیں طرف بالکل سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھی تھی۔

سرخ رنگ کا میکسی نما سلیولس لباس، سنہرے براؤن بال ہلکا سا کرل لیے اطراف میں بکھرے، دمکتی ہوئی سفید رنگت، نیلی کانچ سی آنکھیں۔ متناسب سراپا۔ وہ اتنی خوب صورت اور اسٹائلش تھی کہ ایک لمحے کے لیے جنت بھی اس کے چہرے پر سے نگاہ نہ ہٹا سکی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تمسخر اڑاتی نگاہوں سے جنت کا جائزہ لیتی آگے بڑھی۔ ''تو اس پینڈو سے شادی کی ہے فارس وجدان نے۔''

لفظ ''پینڈو'' نے ان ماڈرن لڑکیوں کو بڑا محظوظ کیا۔ مسکراہٹ سب کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

''اور لڑکیوں کو تو ایسے ریجکٹ کرتا تھا جیسے کوئی حور بیاہ لائے گا۔''

دبے دبے قہقہے چہار سو گونج اٹھے۔ گویا اس تبصرے کو بھی خوب انجوائے کیا گیا۔

جنت کی آنکھوں میں اضطراب آ ٹھہرا۔ رنگت سرخ پڑ گئی۔ وہ نروس تھی۔ گھبراہٹ کا شکار بھی ہو گئی۔ فارس کے حوالے سے آج پہلی بار اس کا اعتماد متزلزل ہوا تھا۔ وہ سر اٹھا کر جواب دینے کے بجائے اپنے آپ میں ہی سمٹ گئی تھی۔ کندھے پر اس کا ہاتھ جو نہ تھا۔ پہلو میں وہ اس کے ساتھ جو نہ تھا۔ نہ محبت ہمراہ تھی۔ نہ عزت کا احساس تھا۔ اعتماد آتا بھی تو کیسے۔ وہ مقابلہ کرتی بھی تو کیسے۔

''فائنلی تمہیں بھی دیکھ لیا۔'' سہج سہج قدم اٹھاتی وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''ویسے ابھی بھی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا فارس وجدان کو تم میں کیا نظر آیا؟ تم بتا دو گی تو ہمیں آسانی ہو گی۔''

ایک بار پھر سب ہنسے تھے۔ اس پر، اس کے لباس پر، اس کی شکل و صورت پر۔

''وہی جو اسے تم سب میں نظر نہیں آیا۔''

سب کی ہنسی تھم گئی۔ دوٹوک اور کٹیلے لہجے میں جواب دے کر وہ اسی وقت ان کے چنگل سے نکل کر باہر آ گئی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے آئمہ ظہیر کے ساتھ کوئی بھی فنکشن اٹینڈ کرنے سے توبہ کر لی تھی۔ وہ فارس کی وجہ سے نظروں میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ جج نہیں ہونا چاہتی تھی۔ نہ اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے۔ نہ کلاس اور لباس کے حساب سے۔

☆☆☆

''تم آخر اتنے جتن کس لیے کر رہی ہو؟'' وہ آس پاس پر کافی کا مگ رکھ کر پلٹ رہی تھی جب فارس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نگاہ ہٹا کر کہا تھا۔ وہ رک کر، کچھ حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

وہ خود سے مخاطب ہو جائے ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا اور ان ڈیڑھ ماہ میں تو شاید دو تین بار ہی ہوا ہو گا۔

''اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے۔'' اس نے بلا کسی تمہید کے، بلا کسی کنفیوژن یا گھبراہٹ کے فارس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''کس رشتے کو قائم کرنے کے لیے؟ جسے میں سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا؟''

''تسلیم نہ کرتے تو نکاح بھی نہ کرتے۔'' اس کے وہ مسکرائی۔ وہ بھی مسکرایا۔ بخدا اس کی مسکراہٹ۔ اگر طنزیہ نہ ہوتی تو کتنی خوب صورت ہوتی۔

''تسلیم کرنا کچھ اور ہے..... نکاح کرنا کچھ اور۔''

''خدا کی مقرر کردہ حدود کی درجہ بندی کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟'' وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

کس چیز نے اسے اتنا نڈر اور بہادر بنا دیا تھا فارس بھی سوچتا ہو گا۔ کس چیز نے اسے اتنا قوی کر دیا ہے۔ وہ بھی سوچا کرتی تھی۔

''تم اس گھر میں میری ماں کی وجہ سے ہو'' فارس نے یاد دلایا تھا۔

''غلط! میں اس گھر میں تمہاری وجہ سے ہوا میرا نکاح تم سے ہوا ہے۔''

فارس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک دیکھ اسے اندازہ ہوا وہ اس کے خراب موڈ کا ٹریگر دبا ہے۔

''ممی کو بہو چاہیے تھی..... وہ اپنی مرضی پسند سے تمہیں یہاں لے بھی آئیں.....'' ایک لمحے رک کر اس نے سر اٹھایا۔ ''مجھے لائف پارٹنر چاہ ہوتا تو میں کم از کم تمہارا انتخاب نہ کرتا۔''

''کیوں مجھ میں کیا کمی ہے؟'' اس نے سو ابرو اٹھائی۔

''میں جواب دینے کا پابند نہیں۔'' لیپ ٹ بند کر کے وہ فرصت سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھ

''جب تمہیں اچھی طرح سے اندازہ ہو ہے کہ میں اس رشتے میں سیریس ہوں اور نہ ہی ہو سکتا ہوں تو پھر یہ سب کس لیے؟ کون بے و تمہیں پٹیاں پڑھا رہا ہے کہ تم اس طرح میر آگے پیچھے پھرو گی تو مجھے تمہاری عادت ہو جائے اس کے بعد میں اس رشتے کو ختم کرنے کا یہ فضو آئیڈیا اپنے ذہن سے نکال دوں گا اور ہم دونو

PakistaniPoint

خوشی رہنے لگ جائیں گے۔"

وہ اس کی ذات کی دھجیاں بکھیر کر تمسخر اڑاتی نگاہوں سے اب اسے دیکھ رہا تھا اور جنت لبوں پر ہلکا سا تبسم لیے بمشکل ہی اپنے جذبات پر قابو رکھ پائی تھی۔

"ویسے تمہاری یہ ادائیں تمہارے پہلے شوہر کے کام نہیں آئیں؟ میرا مطلب ہے تم اس کے ساتھ پانچ سال رہی ہو۔ پانچ سال کا عرصہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس کے باوجود تمہیں طلاق ہوئی۔"

روح پہلے سے گھائل تھی۔ وجود کے پرخچے اب اڑے تھے۔ وہ حیران تھی وہ اس کے سامنے اب تک کیسے کھڑی تھی۔ اپنے قدموں پر..... اس استحقاق کے ساتھ..... کیسے ڈٹی ہوئی تھی۔ کیسے سن رہی تھی وہ اس کے زہر میں بجھے ان لفظوں کو جو اندر ہی اندر اسے چھلنی کرتے جا رہے تھے۔

"تمہاری ایک مشکل آسان کر دیتا ہوں۔" میز پر کہنیاں جما کر وہ آگے ہوا۔ "جس دن میں تمہیں اس گھر سے باہر کا راستہ دکھاؤں گا اس دن تمہارے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہو گی کہ تم اگلے دس پندرہ سالوں تک گھر میں بیٹھ کر بھی اڑاؤ گی تو ختم نہیں ہو گی۔ سو یہ سوچنا چھوڑ دو کہ طلاق کے بعد تمہارا کیا بنے گا! دولت ملے گی تو تم بھول جاؤ گی برہان کون تھا..... فارس کون ہے۔"

لفظ تھے یا برچھی۔ اسے کاٹ کر گزر گئے تھے۔

اس کے لب کپکپائے اٹھے، آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ مگر اس نے فارس سے مزید کچھ نہ کہا تھا۔ بے حد خاموشی سے جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

ایک آسودہ سی مسکراہٹ فارس وجدان کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی۔ یہ احساس ہی تسلی بخش تھا کہ جو لڑکی اس کا سکون برباد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اسے بے سکون کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

☆☆☆

مگر یہ سکون بھی اس کی خوشیوں کی طرح وقتی ہی تھا کہ اگلے روز جب وہ جاگنگ کے لیے اپنے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

دل ایک گلشن

رضیہ جمیل

300

چلمن

نادرہ خاتون

قیمت -/300 روپے

بندِ دی

نسیم سحر قریشی

قیمت -/400 روپے

دستِ کوزہ گر

نوزیہ یاسمین

قیمت -/750 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

گارڈ کی معیت میں گھر سے نکلا تھا تو ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

فارس نے مڑ کر اسے تب دیکھا تھا جب گارڈ نے توجہ اس کی طرف دلوائی تھی۔

''سر آپ کی مسز.....''

سیاہ ٹراؤزر پر سفید کاٹن کے قمیص پر گلابی رنگ کا لمبا سا سویٹر زیب تن کیے، گلے میں دوپٹے کو مفلر کی طرح بل دے کر ڈالے، بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنائے وہ چمکتی ہوئی روشن آنکھوں کے ساتھ اس کے پاس آ کر مسکرائی۔ ''گڈ مارننگ۔''

''واٹ نان سینس۔'' اس نے دبی آواز میں جھاڑا۔

''حیران کر دیا نا میں نے تمہیں؟ کہتے ہیں انسان ناراض بھی صرف ان سے ہوتا ہے جن سے کوئی تعلق ہو..... بھلا میں کیوں تمہاری باتوں کو مائنڈ کرنے لگی؟''

وہ لب بھینچے سختی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ گزشتہ شب کی تلخ کلامی کے بعد بھی اس لڑکی میں اتنی سکت تھی کہ وہ اگلے روز ہی یوں مخاطب ہوگی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ تو یہ توقع کیے ہوئے تھا کہ اگلے چند دنوں تک تو وہ بات بھی نہیں کرے گی اور یہاں.....

''نفرت بھی ایک تعلق ہوتا ہے۔ نظر انداز کرنے کے لیے کسی کو محسوس کرنا ضروری ہے۔ میں حیران ہوں تم پچھلے ڈیڑھ ماہ سے مجھے نظر انداز کر رہے ہو! یعنی تم پچھلے ڈیڑھ ماہ سے مجھے محسوس کر رہے ہو۔''

''کسی روز تمہیں تمہاری یہ خوش فہمیاں لے ڈوبیں گی۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''میں بہت اچھی تیراک ہوں فارس۔''

''بہترین تیراک بھی شارک کی خوراک بن جایا کرتے ہیں۔''

''شاید اس لیے کہ وہ بروقت ساحل پر نہیں پہنچ پاتے۔''

''تم پہنچ جاؤ گی ساحل پر؟''

''ساحل پر ہی تو کھڑی ہوں میں۔''

ماتھے پر تیوری چڑھائے وہ جاگنگ ٹریک پر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

''کیا تمہیں اس بات کی فکر ہے کہیں مجھے میری خوش فہمیاں نہ لے ڈوبیں؟'' وہ بھی اس کے پیچھے آنے لگی۔

''تمہاری فکر اور مجھے ہوگی؟'' سوالیہ ابرو اٹھا کر اس نے جن نظروں سے جنت کو دیکھا، وہ کڑھ کر رہ گئی۔

''ویسے سیلف ریسپکٹ کیا اپنے ایکس ہزبنڈ کے گھر بیچ کھائی ہے تم نے؟'' فارس کے قدموں کے ساتھ قدم ملاتی، اپنا تنفس قابو میں کرتی جنت کے قدموں کی حرکت مدھم پڑ گئی..... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رک گئی تھی۔ وہ بھی رک گیا تھا۔ محض ایک لمحے کے لیے۔

''تمہیں عجیب نہیں لگتا؟ مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔ اس طرح اپنی سیلف ریسپکٹ کی بھینٹ چڑھا کر، میری توجہ حاصل کرنے کے لیے میرے آگے پیچھے پھرنا۔''

تمسخر اڑاتا ہوا نرم لہجہ تھا اس کا۔ مگر جنت کے گال پر جیسے کسی نے طمانچہ دے مارا تھا۔ وہ ہل کر رہ گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ بہت سے علاقے لاک ڈاؤن کی زد میں ہیں جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔ ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو مارچ یا جون کا پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/70 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکائنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 03172266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ 840 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام ''عمران ڈائجسٹ، اکاونٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030''، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو 500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک 500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ 18,000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 20,500 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 03172266944 پر رابطہ کریں

رخسانہ نگار عدنان

شام کی حویلی میں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر وا سے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آفی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کردیا ہے۔
کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔
زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔
ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔
سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔
آزر جہان سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، رداغصے سے باہر نکل جاتی ہے۔
کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آکر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔
ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔
میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔
کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔
کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔
کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آجاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔
حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آجائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔
ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔
موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آجائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے۔ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آجاتی ہے۔
موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دیتی اپنے بچے کے ساتھ جورات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آجاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔
آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئر پورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی

پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ اس غیر متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کرلیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہوجاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کررہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر وجیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مرجائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوتی ہے۔

موحد کو ایمانے کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہوجاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کردی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آذر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو نا گوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروالیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آپی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پچھتاتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔ فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔

کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

چوبیسویں قسط

کچھ چائے رمشا کے پاؤں پر بھی گر گئی۔

سلیمان چونکہ تھوڑا قریب بیٹھا تھا، فوراً اس کی طرف جھکا۔
''ایک منٹ، دھیان سے۔ رکو، مجھے دیکھ لینے دو، چائے گرم تھی۔'' جھک کر اس کا پاؤں دیکھنے لگا۔ رمشا کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ رہے تھے۔
وہ بے اختیاری میں سلیمان کو ہاتھ سے پرے دھکیلتی اندھا دھند اندر کی طرف بھاگ گئی۔
لمحہ بھر سلیمان شرمندہ سا جھکا بیٹھا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔
سب بالکل خاموش تھے، اپنی جگہ گنگ۔
''خالہ! کیا کہتی ہیں پھر آپ؟'' شائستہ کو یاد تھا۔ اتنی گمبھیر خاموشی سے پہلے انہوں نے بات کہاں ختم کی تھی۔
''شائستہ! یہ بات ابھی کرنے والی تو نہیں۔'' طاہرہ متذبذب تھیں، بظاہر آزر کو جتانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولیں۔
''میرے خیال میں تو خالہ یہی وقت ہے اس بات کو کرنے کا۔ سب کے دل غم سے بوجھل ہیں۔ یہ چھوٹی سی خوشی اس غم کی کرچیوں کو چن لے گی۔ میرا دل کہتا ہے خالہ!'' وہ بڑی مہارت سے پتے کھیل رہی تھیں۔
''پلیز مما!'' سلیمان اپنی جگہ جز بز ہوا۔
آزر نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔
شاید سلیمان کی اس پروپوزل میں مرضی شامل نہیں تھی۔
''بیٹا! اب آئے ہیں تو بات کرنے میں کیا حرج ہے۔'' شائستہ اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں بولیں۔
سلیمان ماں کو بے بسی سے دیکھ کر رہ گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مہار شائستہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ خود جیسے معذور ہو چکا ہے۔
وہ اس اضطراب میں اٹھا اور باہر نکل گیا۔
آزر اسے باہر تک جاتا دیکھتا، کچھ سوچتا رہا۔
''میرے خیال میں سلیمان کی اس میں مرضی شامل نہیں ہے۔'' اسے آخر کار کہنا ہی پڑا۔
''اگر ایسا ہوتا بھائی صاحب! تو کیا میں یوں منہ کھول کر اپنی بات کر سکتی تھی۔ کبھی نہیں۔'' وہ پورے اعتماد سے کہہ گئیں۔
''مگر شائستہ! یہ مناسب نہیں۔ ابھی رمشا چھوٹی ہے۔'' طاہرہ نے اٹک اٹک کر کمزور سا بہانا گھڑا۔
''خالہ! لڑکیوں کو بڑے ہوتے کون سا وقت لگتا ہے۔ پھر اگر رشتہ اچھا ہو تو شادی کے بعد سب لڑکیاں ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ آپ کے زمانے میں، ہمارے وقت میں بھی کون سا تعلیم، جاب کے چکر میں لڑکیاں بیٹھی رہ جاتی تھیں اور سچ کہوں خالہ! جتنی دیر ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی کمپلیکیشنز ہوتی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے جب تعلیم، جاب کے لیے لڑکیاں گھر سے باہر نکل کر جائیں گی تو کہیں نہ کہیں تو الجھیں گی، ایسی الجھن سے اچھا نہیں پہلے ہی مناسب رشتہ آنے پر رخصت کر دیا جائے۔''
شائستہ نے اللہ جانے کس رو میں یہ بات کی تھی۔ آزر کے تو جیسے دل میں اتر گئی۔ وہ گنگ سا بیٹھا سوچتا رہ گیا تھا۔ شائستہ کب کی اٹھ کر چلی بھی گئیں۔ وہ وہیں بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ طاہرہ بھی کچھ بولتی اٹھ کر جا چکی تھیں۔ مگر آزر کے دماغ کی سوئی شائستہ کی بات پر اٹک گئی تھی۔
''ظاہر ہے جب تعلیم اور جاب کے لیے لڑکیاں گھر سے باہر نکل کر جائیں گی تو کہیں نہ کہیں تو الجھیں گی، ایسی الجھن سے اچھا نہیں پہلے ہی مناسب رشتہ آنے پر رخصت کر دیا جائے۔''

اس کی نظروں کے سامنے ردا کے ساتھ ہونے والی ساری بلیک میلنگ آنے لگی۔ فرحان کا گھٹیا پن، اس کی کمینگی، ردا کا خوف اور پھر دلہن بن کر منوں مٹی تلے اتر جانا۔

اسے جھرجھری سی آ گئی۔

''نہیں..... میں رمشا کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں ردا والی کہانی اپنی اس بیٹی کے ساتھ دہرانے نہیں دوں گا۔ رمشا کی تعلیم پوری ہو یا نہیں، میں اسے جاب کے لیے گھر سے نکلنے نہیں دوں گا۔ میں ایک اور ردا پیدا نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

منصور کی بات پر زینب اور سونیا جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئیں۔ ان دونوں کو منصور سے اس حد تک جانے کی امید نہیں تھی۔

''کس کی اولاد ہوں میں اور کیوں ان کے ساتھ مجھے منسوب کیا آپ نے آنی!'' کشف اس سے زیادہ برداشت کر بھی نہیں سکتی تھی۔

اندر آ کر شدید صدمے، دکھ اور نفرت سے بولی تھی۔

''کشف..... میری بچی!'' زینب تڑپ کر آگے بڑھی تھی۔

''دور رہیں مجھ سے آنی..... دور.....'' وہ رنج میں ہاتھ دیوار کی طرح اٹھاتے ہوئے چلائی تھی اور زینب انہی قدموں پر ساکت ہو گئی۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کشف!'' سونیا ملتجی لہجے میں کچھ گھگھیا کر بولی۔

''یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ بہتر ہے آپ بیچ میں دخل نہیں دیں۔'' وہ نفرت اور رکھائی کی انتہا پر تھی۔

سونیا بے بسی سے زینب کو دیکھ کر رہ گئی۔

''بہتر ہے مزید جھوٹ در جھوٹ بولنے کے بجائے جو سچ ہے، وہی کہا جائے۔''

صرف منصور تھا جس کے لہجے میں اطمینان اور سکون تھا۔

''کاش تم نے بھی یہ سب بولنے سے پہلے سچ کا سہارا لیا ہوتا۔'' زینب کی آنکھوں میں شدید دکھ اور نفرت تھی۔

''بہتر ہے، تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی اور اسی وقت۔'' وہ غصے میں دانت پیس کر بولی تھی، جواباً منصور کی آنکھوں میں تمسخر جھلکنے لگا۔

''تم مجھے میرے گھر سے نکالنے کا حق نہیں رکھتیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

''منصور بھائی! ابھی آپ کو یہاں سے جانا ہوگا۔'' سونیا کے لہجے میں کچھ تھا۔ منصور اسے بس دیکھ کر رہ گیا اور جانے کے لیے پلٹا۔

''یہاں سے کوئی کہیں نہیں جائے گا۔ جب تک مجھے بتایا نہیں جائے گا کہ میں کون ہوں، ورنہ یہاں سے سب سے پہلے جانے والی میں ہوں گی۔'' کشف کے لہجے میں ٹھہرا ہوا دکھ اور سرد مہری تھی۔

جانے کیسے اس نے اپنے آنسو کو ضبط کی راہ دکھائی تھی۔

ذرا ذرا سی بات پر رو دینے والی کشف بہت مضبوطی سے تینوں کے سامنے کھڑی تھی۔

''کشف ایسا کچھ نہیں ہے بیٹی!'' سونیا بوجھل سے لہجے میں بولی تھی۔

''آنی! میں کون ہوں؟'' اس نے سونیا کی بات سنی تک نہیں تھی۔

''میری بیٹی ہو، کشف..... میری جان!'' زینب تڑپ کر رہ گئی۔

''میرا باپ کون ہے؟'' وہ زور دے کر بولی۔
''منصور احمد!'' وہ منصور کو دیکھے بغیر مضبوط لہجے میں بولی۔
''منصور احمد..... کون؟'' وہ لمحہ بھر کو چونکی تھی۔
''تمہارا باپ..... جواب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' وہ رک رک کر بولی۔ سچ چھپانے کا شاید اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔
منصور نے چونک کر زینب کو دیکھا، جس کے لہجے میں مضبوطی تھی۔
''تو یہ شخص کون ہے جسے آپ میرا باپ کہہ کر متعارف کرا رہی ہیں؟'' منصور کو دیکھتے ہوئے اس کے لہجے میں حقارت تھی۔
''یہ شخص کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ کوئی بھی رشتہ جوڑنے کے قابل نہیں ہے۔'' زینب نے منصور پر نظریں جما کر تندی سے کہا۔
''تو آپ نے میرے ساتھ ان کا رشتہ کیوں جوڑا..... کیوں؟'' وہ احتجاجاً بولی تھی۔
''تمہاری ضد کی وجہ سے۔ مجھے لگا شاید.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ گئی۔
''میری ضد کی وجہ سے آپ کسی بھی راہ چلتے کو میرا باپ بنا دیں گی.....؟'' وہ تلخی سے بولی۔
زینب کی نظریں جھک گئیں۔
سونیا بالکل چپ تھی۔ جیسے اس کے پاس اب بولنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔
''میر منصور! تم یہاں سے جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔'' اسے منصور کی موجودگی بری طرح سے کھل رہی تھی۔
''میں جا رہا ہوں مگر مجھے اس مہینے ہی یہ گھر سیل آؤٹ کرنا ہے۔ بہتر ہوگا مجھے یہ بات پھر سے نہ کہنی پڑے۔'' وہ بدلحاظی کی انتہا پر تھا۔ کہہ کر رکا نہیں، تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔
کشف زینب کو شک بھری شکایتی نظروں سے دیکھتی، تیز تیز چلتی اندر چلی گئی۔ سونیا اور زینب ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں چرا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''تم تیار ہو ایما سے شادی کے لیے۔'' ثمینہ پر تو شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔
وہ بے یقینی سے کہہ گئی، اس کی خوشی سے آواز کانپ رہی تھی۔
اور اندر آتے حیدر کے قدم وہیں رک گئے۔
''بلال!'' حیدر نے تنبیہی انداز میں بلال کو پکارا۔
بلال حیدر کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ وہ ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔
''تو ہم آج ہی پروپوزل لے کر جاتے ہیں۔ حیدر! تم اچھے ٹائم پر آئے ہو۔ میں آج پروپوزل لے کر جاؤں گی اور ''ہاں'' کروا کے ہی آؤں گی۔'' وہ جوش میں بولتی گئی۔
بلال کا چہرہ بے تاثر تھا۔
''یہ جلد بازی ہے۔ بلال ایسا فیصلہ مت کرو جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔'' وہ اس کے قریب آ کر قدرے محتاط لہجے میں بولا۔
''میں نے فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے بابا!'' وہ ماں کی طرف دیکھتا لفظوں کو جما کر بولا۔
''تمہارے باپ کو شاید ابھی بھی لگ رہا ہے، میں نے یہ فیصلہ تم سے زبردستی کروایا ہے کیونکہ اس نے

ساری زندگی قسم کھا رکھی ہے کہ جس بات میں میری خوشی ہوگی، وہ اسے نہیں ہونے دے گا۔'' وہ بھی حیدر کی آنکھوں میں نفرت سے دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

اور حیدر اس کی طرف متوجہ ہی کب تھا، وہ تو بلال کا ستا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''میرے جیتے جی یہ سب نہیں ہوسکتا۔'' سونیا سنتے ہی چلا اٹھی تھی۔

آزر کو۔ ایسے ردعمل کی توقع تو ضرور تھی مگر اتنا شدید.....

''میں فیصلہ کر چکا ہوں اور یہ ہوگا۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔

''میری ایک اولاد چھین کر بھی آپ کو چین نہیں ملا۔ میری گود ہی اجاڑ دیں گے۔'' وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''احمق عورت! میں باپ ہوں رمشا کا۔ کوئی غلط فیصلہ تو اس کے لیے نہیں کرسکتا ناں۔'' وہ جھلا کر رہ گیا۔

''وہ عورت مجھے یاد ہے جب ردا تیار تھی، دلہن بنے اس پر کتنا حسین روپ آیا تھا۔ وہ شائستہ کسی ڈائن کی طرح اس سے ملنے گئی تھی اور تھوڑی دیر میں میری بیٹی اپنی آخری سانسیں لے چکی تھی۔''

وہ کہتے کہتے جیسے ضبط ٹوٹنے سے پھر رو پڑی۔

''اب تم نئی کہانی مت گھڑو، میری ضد میں آ کر۔'' وہ غصے میں چلا اٹھا۔ سونیا آنکھوں میں آنسو لیے نڈھال سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں کیا کہانی گھڑوں گی آزر! میری زندگی تو خود جیسے کہانی سی بن گئی ہے۔ میری گود میں کھیلتی میری پریوں جیسی بیٹی چلی گئی اور اب ان ہی ظالموں کے ہاتھوں میں اپنی دوسری گڑیا بھی دوں نہیں..... کبھی نہیں۔ میری زندگی میں نہیں ہوسکتا۔'' وہ آنسو پونچھ کر مضبوط لہجے میں آزر کو جیسے فیصلہ سنا کر بولی۔

آزر دیکھ کر رہ گیا۔

اولاد کی محبت اگر عورت کو کمزور کر دیتی ہے تو یہی محبت اسے بہت طاقت ور بھی کر دیتی ہے کہ وہ شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی بھی فیصلہ کرسکتی ہے۔

اس وقت یہی حالت سونیا کی بھی تھی۔

ردا کی معصومیت نے اسے سہا دیا تھا مگر رمشا کی خاطر وہ پھر سے ٹکر لینے کے لیے تیار تھی۔ حالات کے سامنے کھڑی تھی سینہ تان کر۔

آزر کو لگا یہ وقت غصے اور رعب جمانے کا نہیں ہے شاید اس طرح بنتا کھیل بگڑ نہ جائے۔

ورنہ وہ تو طے کر چکا تھا، چاہے اسے زبردستی کرنی پڑے یا نرمی۔ اسے ہر حال میں رمشا کی شادی سلیمان سے کرنی ہی تھی۔

''کیا کرو گی تم پھر سونیا؟'' وہ ایک دم سے نرم پڑ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

اس نے سونیا کا یخ بستہ ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیا۔

''ایک دو سال میں جب رمشا کی تعلیم مکمل ہوگی۔ وہ جاب کے لیے ضد کرے گی اور وہیں کہیں کوئی اور شیطان فرحان کے روپ میں اس کے جذبات کھیلنے کے لیے پہنچ گیا، ہم کیا کریں گے پھر سونیا۔''

وہ بظاہر جذبات سے کھیلتا مظلوم بنا ہوا تھا مگر اس بار وہ کوئی غلطی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

''تم جانتی ہو ناں، ہماری بیٹی نے کتنی تکلیف اٹھائی۔ کس قدر اذیت کے دن گزارے تھے اس نے اس بلیک میلر کی وجہ سے۔''

سونیا اسے سن رہی تھی۔ آزر کے لیے یہی کافی تھا۔

''صرف اپنی بیٹی کی بھلائی اس کی بہتری کے لیے میں یہ سب سوچنے پر تیار ہوا ہوں سونیا!'' وہ نرمی سے بولا۔

''نہیں آزر! میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے شائستہ پر اب بھروسا نہیں ہے۔ وہ کسی بھی طرح یہ سب سوچنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

آزر نے اسے بے بسی سے دیکھا۔

''شائستہ بھابھی نے کیا کیا۔ محض ردا سے رشتہ ہی جوڑا تھا نا، یہ تو ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اس کی موت کی وجہ.....''

وہ ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے منع کرنے لگی۔

''آخری وقت میں یہی شائستہ تھی جو اس کے پاس تھی۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''اب تم غلط بات کر رہی ہو، وہ ردا سے محبت کرتی تھی ورنہ رسماً کون اتنے مہینوں انتظار میں بیٹھا رہتا ہے جس طرح انہوں نے پھر سے رمشا کے لیے جھولی پھیلائی۔'' وہ نرمی سے سمجھانے لگا۔

''میرا دل نہیں مانتا آزر! آپ انہیں انکار کر دیں۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی۔

''انہیں تو میں انکار نہیں کروں گا، تمہیں ہی ماننا ہوگا کیونکہ ہفتہ وس دن تم سوچ بھی لو تو بھی تمہیں اس رشتے پر ماننا ہی ہوگا۔''

آزر کہہ کر رکا نہیں تیزی سے باہر نکل گیا۔

سونیا افسردہ سی کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆

''یہ آدھا سچ ہے آنی! اور میں اس کو نہیں مانتی۔ آپ کا کیا ہے، آپ کسی بھی منصور احمد کو میرا.....'' وہ تیز تیز بولتی جا رہی تھی۔

''کشف!'' زینب کا غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''کیا سوچ کر تم نے اتنی بڑی بات کی ہے۔'' وہ غصے میں کانپتی آواز میں بولی۔

''جو کچھ آپ مجھ سے کہتی آئی ہیں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

کشف کی آنکھوں میں جو بے اعتباری تھی، زینب اس سے سچا ہتے ہوئے بھی نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ مان لیں آنی! یہ بات وہ نہیں ہے جو آپ کو مجھے بتانا ہے۔'' وہ اس کے قریب دوسری کرسی کھینچ کر لے آئی تھیں۔

''کشف! جو کچھ تھا سب میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔'' وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔ وہ نفی میں سر ہلاتی رہی۔

''تو آپ نے جھوٹ کیوں بولا مجھ سے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ ''اور اب یہ نہیں کہیے گا میری ضد کی وجہ سے۔''

وہ اسے وارن کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے ایسا کرنے کے لیے منصور نے ہی کہا تھا۔'' اس کے دماغ میں یہی بات آ سکی۔

''کیا..... کیا مطلب انہوں نے آپ سے کہا کہ مجھ سے یہ جھوٹ بولیں؟'' وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

''میں کینیڈا میں منصور سے ملی تھی۔'' زینب کو اعتراف کرنا پڑا۔

''تو موحد نے ٹھیک کہا تھا۔'' وہ بڑبڑائی۔

''کیا مطلب موحد کا یہاں کیا ذکر؟'' زینب بے اختیار چونکی تھی۔
''مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ آپ میر منصور سے وہاں ملی تھیں۔''
''موحد نے تمہیں یہ کب بتایا؟'' زینب چونک کر رہ گئی۔
''اس بات کو چھوڑیں۔ آپ نے کسی کے کہنے پر مجھ سے جھوٹ کیوں بولا اور آپ کی اور ان کی تصویر.....؟''
''وہ صرف منگنی کی تصویر تھی۔'' زینب کے منہ سے پھسلا۔
''تو پھر میرے باپ کی تصویر، ان کی فیملی، خاندان سب کچھ آپ کو مجھے بتانا ہوگا ابھی۔'' وہ تیز تیز بولی تھی۔
''کوئی نہیں تھا ان کی فیملی میں۔ ایک بوڑھی ماں تھی، وہ تھوڑے دنوں میں فوت ہوگئی اور منصور احمد کی بھی تمہاری پیدائش سے پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی۔''
زینب رٹے ہوئے سبق کی طرح اسے بتاتی چلی گئی۔
کشف تیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''اب تو تمہاری تسلی ہوگئی یا نہیں؟'' وہ اس سے نظریں چراتی اٹھ کر جانے لگی۔ ''آجاؤ، میں کھانا لگا رہی ہوں۔''
''آپ کو یہ کہانی گھڑنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا ہے ناں آنی!'' وہ پیچھے سے بولی تھی۔
زینب ٹھٹک کر رہ گئی۔
''اب کیا الجھن ہے کشف!'' وہ جھنجلا کر رہ گئی۔
''آپ کی کہانی میں کہیں بھی سچ نہیں ہے۔'' وہ مایوسی سے کہہ گئی۔ زینب اسے وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔
''میری بیٹی! کیا میں کافی نہیں ہوں تمہارے لیے۔'' وہ اسے اپنے ساتھ ہلکا سا لگا کر بولی۔
''اگر صرف ماں کافی ہوتی بچے کے لیے تو پھر اللہ باپ کا وجود ہی کیوں بناتا آنی!'' وہ آہستہ سے ماں سے الگ ہوگئی۔
''سب تو تمہیں بتا چکی ہوں۔'' وہ بے چارگی سے بولی۔
''آپ کو لگتا ہے، میں اس پر یقین کرلوں گی۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔
''تو بتاؤ پھر میں کیا کروں؟''
''کچھ ہے ایسا جو ابھی بھی آپ مجھے نہیں بتا رہیں۔ بتانا نہیں چاہ رہیں، چھپا رہی ہیں۔''
''اُفوہ۔ میں تھک گئی ہوں تمہاری اس انکوائری سے۔ پلیز اب آجاؤ کھانے کے لیے۔ مجھے صبح اسکول جلدی جانا ہے۔'' زینب جیسے پیچھا چھڑا کر باہر نکل گئی۔
''آپ مجھ سے جتنا بھی پیچھا چھڑا لیں، میں بھی سچ جان کر رہوں گی۔''
زینب دہلیز پر پہنچی تو کشف پیچھے سے بولی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

☆☆☆

''میں آپ جیسی زندگی نہیں گزارنا چاہتا بابا!''
بلال کی بات پر حیدر کا دل لمحہ بھر کو دھڑکتے دھڑکتے جیسے تھم سا گیا تھا۔ جوان، گھبرو بیٹے کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے اس چھوٹے سے جملے میں باپ کی پوری زندگی کی کہانی بیان کردی تھی اور حیدر چاہتے ہوئے بھی

تردید نہیں کر سکا۔
''تم بہر حال ایمان سے محبت نہیں کرتے۔'' اسے کچھ وقت لگا تھا سنبھلنے میں۔
''زندگی محبت کے بغیر تو گزر سکتی ہے بابا! لیکن سمجھوتے بہت کچھ آسان بنا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں یہی سیکھا ہے۔'' وہ شاید باپ کے سارے سوالوں کے جواب پہلے سے تیار کیے ہوئے تھا۔
''کیوں کرو گے تم سمجھوتے؟'' باپ کی غیرت نے جوش مارا۔
''کیوں نہیں کروں میں سمجھوتہ۔'' وہ بل اٹھا، باپ سے الجھا۔
''بلال! دیکھو، یہ سب آسان نہیں ہے، اپنی خوشی، اپنی محبت سے دست بردار ہونا۔ پل پل جیو گے، مرو گے۔'' وہ نرمی سے رک رک کر اسے سمجھانے لگا۔
''پل پل کے جینے مرنے سے اچھا ہے، ایک ہی بار کیوں نا اس خود فریبی کو مار ڈالوں۔'' وہ دوبدو بولا۔
''صرف ماں کی ضد میں۔'' حیدر نے عاجزی سے کہا۔
''ضد تو اس کی بھی ہے بابا!'' وہ افسردگی سے بولا۔
''میں بات کروں گا۔'' وہ حوصلہ بڑھانے کو بولا۔
''بات کرنے سے دل نہیں بدلا کرتے۔ میں نے اس سے بات کی تھی، اس کے لہجے میں، اس کے دل میں اب میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کوئی آس، امید بھی نہیں تو ایسے میں اگر پھر سے بات کروں گا تو شاید اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کروں گا۔''
اس نے تفصیلاً باپ کی تشفی کرنی چاہی۔
''کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟'' حیدر نے کچھ جھجک کر پوچھا۔
بلال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''پسند ہے اس کی یا وہ بھی ضد میں.....'' وہ اٹھ کر بولا۔
''پتا نہیں۔ اب لہجوں کے فرق معلوم نہیں ہوتے۔ پسند کو ضد بننے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ اگر ان کو راضی نہیں کر سکا تو کوئی بات نہیں۔ ماما تو خوش ہو جائیں گی۔'' وہ پھیکی سی بے جان مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا تھا۔
حیدر کا دل کٹ سا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بھی سمجھوتہ بھری زندگی گزارنے جا رہا تھا۔
''ایسا مت کرو بلال!'' وہ تڑپ کر بولا۔
''اب آپ مجھے منع نہیں کریں گے بابا! میں جو کر رہا ہوں، مجھے کرنے دیں۔ بار بار روکیں گے تو کہیں میں رک ہی نہ جاؤں پھر سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا پھر مجھ سے بھی کچھ نہیں سنبھلے گا۔''
وہ اٹھتے اٹھتے باپ کو تنبیہہ کرتے ہوئے بولا۔
''میں ثمینہ کو سمجھا لوں گا بلال!'' وہ آخر میں کمزور لہجے میں بولا۔
''اب کوئی فائدہ نہیں۔ میں ایمان سے وعدہ کر چکا ہوں۔ چاہوں بھی تو پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں۔ مبادا حیدر اسے پھر سے نہ کوئی اور دلکش بہانہ بنا کر روک لے۔
حیدر اسے جاتا دیکھ کر کچھ اور بھی افسردہ ہو گیا۔
''میں نے تمہارے لیے یہ سب کچھ نہیں سوچا تھا میرے بیٹے۔''
اس نے افسردگی سے کتاب کھولتے ہوئے سوچا۔

☆☆☆

''کیوں کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں۔ کیوں میں اتنا خود غرض اور بے حس ہو جاتا ہوں، جو میرے منہ

میں آتا ہے۔ میں کہہ گزرتا ہوں۔'' منصور کا گھر جانے کو بلکہ کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔
وہ شام سے بادشاہی مسجد کے عقب میں بنے اس گھاس بھرے اندھیرے قلعہ میں بیٹھا تھا۔
وہ یہ تک بھول گیا تھا کہ وہ کب اور کیسے یہاں تک پہنچا تھا۔ زینب نے اس بری طرح سے اسے ہرٹ کیا تھا کہ وہ سب کچھ بولنے پر مجبور ہو گیا تھا۔
اور وہ جو اتنا کچھ سوچ کر یہاں آیا تھا کہ اب زینب کو چھوڑ کر وہ کبھی بھی واپس نہیں جائے گا، سب کچھ خاک میں مل گیا۔
زینب اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔
زرین تو ضرورتاً اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔
وہ سوچتے سوچتے بہت دور نکل گیا۔
جب ایک ہوٹل میں بیرا گیری کرتے اس کی ملاقات زریں اور اس کے دوست مائیکل سے ہوئی تھی۔
وہ دونوں اکثر شام میں رنگین بنانے اس ہوٹل میں آیا کرتے تھے جہاں منصور کام کرتا تھا۔
اور جانے کب اور کیسے زریں کی پسند جو اکثر ہی جلد بدل جایا کرتی تھی مگر اس بار تو مائیکل کے ساتھ جو اس کی دل لگی شروع ہوئی تھی تو وہ سال بھر میں بھی اس میں کچھ کمی نہ ہوئی تھی۔
مگر منصور میں کچھ ایسا تھا کہ مائیکل کی سنگت اسے اب بیزار کرنے لگی تھی۔
وہ اب مائیکل کے بغیر دوسرے اوقات کار میں میر منصور جب اپنی شفٹ سے فارغ ہو کر جانے لگتا تو چپکے سے آ جاتی۔
چند ہی دنوں میں اس نے میر منصور کی بے وطنی اور اکیلے پن کو اپنی سوکالڈ محبت اور دوستی کے شیشے میں اتار لیا تھا۔
منصور جو زینب کے دل کو اپنے پیار کی ہتھکڑی میں باندھ گیا تھا، کچھ فراموش تو نہیں کر سکا مگر اسے زریں کی شکل میں ایک شارٹ کٹ نظر آ گیا تھا جو اس کی مشکلات دور کر سکتا تھا۔
اس کا فون زور زور سے بجنے لگا تھا۔

☆☆☆

''پاپا!'' رمشا ششدر سی باپ کی شکل دیکھ رہی تھی۔
سلیمان کے پروپوزل کے بارے میں تو اس نے خواب میں نہیں سوچا تھا۔
''کوئی زبردستی نہیں ہے مگر میری نظر میں اس سے اچھا رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ دیکھے بھالے لوگ ہیں پھر جس چاہت اور محبت سے انہوں نے تمہارا رشتہ مانگا ہے.....''
آزر ناپ تول کر بولتے ہوئے بھی اپنی پسندیدگی کی مہر لگانا نہیں بھولا تھا۔
اور سر جھکا کر بیٹھی رمشا کی آنکھیں پانیوں سے بھیگنے لگیں۔
''تمہاری ماں جذباتی عورت ہے۔ وہ ابھی بھی ردا کی وجہ سے یہ سب کچھ قبول نہیں کر رہی مگر میں جانتا ہوں، میری رمشا بہت سمجھ دار ہے۔ وہ وہی فیصلہ کرے گی جو اس کے پاپا کریں گے۔''
وہ آخر میں اسے بچوں کی طرح چمکار کر بولا۔
''بابا! مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ میری اسٹڈیز.....!'' وہ بمشکل کمزور لہجے میں احتجاجاً بولی تھی۔
''میری جان! اسٹڈیز تو بعد میں بھی کی جا سکتی ہیں۔ تم اس کے لیے پریشان نہیں ہو۔ میں سلیمان سے بھی بات کر لوں گا۔ وہ بہت کوآپریٹو لڑکا ہے۔ تم اپنی اسٹڈیز وہاں جا کر بھی مکمل کر سکتی ہو۔''

وہ اسے تسلی دیتے ہوئے انداز میں بولا تھا۔
''تم سوچ لو، اچھا طرح۔ صبح تمہارا جواب لوں گا۔ کل وہ لوگ رسم کرنے آرہے ہیں۔ اپنی طرف سے ہمیں بھی کچھ تیاری تو کرنی ہوگی۔ اب تم ریسٹ کرو۔''
وہ ششدر سی باپ کی شکل دیکھتی رہ گئی۔
اگر کل وہ رسم کرنے آرہے تھے تو پھر اسے کس بات کو سوچنے کے لیے کہا گیا تھا۔
اس کا جی چاہا وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخے۔ وہ روا نہیں رمشا ہے، وہ اس خاموشی سے نہیں مرنا چاہتی تھی جس خاموشی سے اس کی بہن سرخ دوپٹہ اوڑھ کر چلی گئی۔
وہ باپ کے جاتے ہی بھاگتی ہوئی ماں کے پاس آئی۔
سونیا جو پہلے ہی اپنی کنپٹیاں دبائی شدید دباؤ میں بیٹھی اس نئے مسئلے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رمشا نے جاتے ہی ماں سے لپٹ کر رونا شروع کردیا۔
''رمشا! میری جان! کیا ہوا ہے..... کیوں ایسے رو رہی ہو؟'' وہ اس کے یوں رونے سے ایک دم گھبرا گئی تھی۔
''آپ پاپا کو منع کریں ماما!'' وہ روتے ہوئے بولی۔
''کس بات سے منع کردوں کیا کہا ہے انہوں نے تم سے؟'' سونیا کو پتا تو تھا مگر پھر بھی ہلکا سا گمان تھا شاید آزر نے کسی اور متعلق بات کی ہو۔ وہ اتنی جلدی رمشا سے بات نہیں کرسکتا۔
''مجھے یہ شادی نہیں کرنی ہے۔ آپ سلیمان بھائی کو منع کردیں۔'' وہ رو رہی تھی۔

☆☆☆

رات بہت بھاری تھی۔ اس کی آنکھوں کو ایسے رت جگوں کی عادت تھی لیکن پھر بھی آج جیسے کسی نے آنکھوں پر پتھر چن دیے تھے۔
اس کے پاپا ایک کالے بنگالی باپ کے اسی رنگ و شکل کے بیٹے جن کی محنت نے بابا ابراہیم کے کاروبار کو چار چاند لگادیے تھے۔
مگر پھر بھی محمود الحسن اپنی حسین و طرح دار بیوی زریں کے دل تک رستہ بنانے میں ناکام رہا تھا۔
ان دونوں میں ایک خاموش دو طرفہ سمجھوتہ طے پا چکا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔
مگر اس طرح بھی نہیں رہیں گے جس طرح ایک بیاہتا جوڑا رہتا ہے۔ بابا ابراہیم جتنے زریں سے نالاں تھے اور محمود کو کہتے کہ ایک شوہر والا حق استعمال کرے۔ زریں پر سختی کرے، وہ ایک بچے کی ماں ہے۔
اور محمود الحسن جانتا تھا جس دن اس نے شوہر والا حق استعمال کرلیا وہ دن زریں اور محمود کی دنیا دکھاوے کی اس شادی کا آخری دن ہوگا۔
وہ اس بچے کو جسے وہ اپنے پیروں کی زنجیر کہتی تھی، ایک پل میں توڑ کر آگے بڑھ جائے گی۔
وہ ایسی ہی خودسر، ضدی اور اڑیل تھی۔
محمود نے اگر اسے آدھی راتوں کو گھر آنے کی اجازت نہیں دی تھی تو روکنے کا حق بھی اس کے پاس نہیں تھا۔
زریں کے دل پر عاشق چڑھتے اترتے رہتے۔
ایک دل میں نہیں سمایا تو محمود نہیں سمایا۔
یہ شادی اس کے کاروباری باپ کے فائدے کے لیے کی گئی تھی اور اس فائدے کی وجہ سے وہ دونوں ایک

دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ زریں کو نہ محمود سے کوئی دلچسپی تھی نہ موحد سے۔
محمود کاروبار کے ساتھ بچے کو بھی پال رہا تھا۔
باپ ہی اسے نرسری اور پھر اسکول چھوڑنے لینے جاتا۔ وہی اسے لنچ، بریک فاسٹ، ڈنر اور ہوم ورک کرواتا۔ وہی اس کے یونیفارم اور اسکول شوز کا خیال رکھتا۔
زریں اس کے لیے ایک اجنبی عورت تھی، جس نے کبھی آتے جاتے، خوشبوئیں لٹاتے، اس کے گالوں کو ذرا سا چھو کر پیار کرنے کے سوا کوئی رشتہ نہیں جوڑا تھا۔
کبھی گلے سے لگایا نہ گود میں بھرا۔
موحد کے دل میں بھی ماں کی طلب والی ہڑک نہیں اٹھتی تھی۔ اس کے لیے ماں اور باپ دونوں محمود الحسن ہی تھے۔
ان دنوں زریں کا دوست مائیکل تھا۔
جواب بابا کی غیر موجودگی میں ان کے گھر بھی آنے لگا تھا۔
جس کے منہ سے دور سے ہی شراب کی بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے۔ موحد اسے دیکھتے ہی گھر کے کونوں کھدروں میں چھپ جایا کرتا تھا۔
اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد اس کے ماں باپ کے درمیان ایک بڑا جھگڑا اس مائیکل کے گھر آجانے پر ہوا تھا۔
زریں نے ضد میں اب ہر بار مائیکل کے ساتھ آنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں گھر میں داخل ہوتے تو محمود موحد کو لے کر باہر چلا جاتا مگر یہ بھی ایک مستقل حل نہیں تھا۔
اکثر وہ آدھی رات کے بعد آتے تو محمود موحد کو کمبلوں کے ڈھیر میں گویا چھپا دیتا کہ ان دونوں کے اونچے اونچے بے خوف قہقہے کہیں اس معصوم بچپن کی نیند نہ توڑ دیں۔
پھر شاید کچھ عجب ہوا تھا۔
مائیکل کا آنا جانا پہلے کم ہوا پھر ختم ہو گیا۔
اس کی جگہ کچھ دنوں بعد ایک اسپینش شکل وصورت کے شخص میر منصور نے لے لی۔
مگر موحد کو اس سے بھی شدید نفرت تھی۔
وہ اپنے ماں باپ کے بیچ آنے والے ہر تیسرے شخص سے شدید نفرت کرتا تھا۔
اس کی ماں جب بھی اس تیسرے شخص کے ساتھ گھر میں آتی تو جیسی بے بسی اور اضطراب اسے باپ کی آنکھوں میں نظر آتا موحد کو اس سے شدید تکلیف ہوتی تھی۔
پھر یہ تکلیف بڑھنے لگی۔
محمود اور زریں میں اکثر جھگڑے ہونے لگے، جن کی وجہ وہی میر منصور تھا جو شکل سے ہی انتہا کا خود غرض شخص لگتا تھا۔
پھر وہ اندوہناک واقعہ ہو گیا جس نے موحد کی زندگی بدل دی۔

☆☆☆

کشف کروٹیں لے لے کر تھک گئی تھی۔
جو کچھ ہو رہا تھا۔ جو ہونے جا رہا تھا، اس نے کبھی بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔
اس کا دل کہتا تھا زینب نے جو کچھ اسے بہلانے کے لیے کیا ہے، وہ محض بہلاوا ہی ہے۔ وہ اصل میں کس

کی بیٹی ہے، کوئی بھی اسے سچ نہیں بتانا چاہتا۔
''تو کیا میں اپنی ماں کے کسی گناہ کا نتیجہ ہوں۔''
دور کہیں فضا میں ''اللہ اکبر'' کی مدہم آواز خاموش فضا میں ابھری تھی۔ اپنے خیال سے ہی اس کا دل کانپ اٹھا۔
''اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ اپنی جان لے لے گی اپنے ہاتھوں سے۔''
زینب بھی شاید رات بھر جاگتی رہی تھی۔
کشف نے سرسراہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا، زینب نے نماز کے انداز میں دوپٹا لپیٹ رکھا تھا شاید وہ تہجد پڑھ کر آئی تھی۔
''کیا بات ہے کشف! ایسے کیوں بیٹھی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری۔'' وہ اس کے قریب آ کر تشویش سے اس کی پیشانی چھو کر بولی۔
زینب لمحہ بھر اس کے پاس کھڑی رہی پھر اس کے بال سمیٹتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔
''آنی! میں پوری رات نہیں سوئی۔'' وہ جیسے ٹرانس میں تھی۔
زینب ہلکا سا سر ہلا کر رہ گئی۔
''آپ سو گئی تھیں۔''
زینب نے بھی نفی میں سر ہلایا۔
''ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتائیں گی۔''
وہ چند لمحوں کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد بولی۔
''میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ اسے نرمی سے دیکھ کر بولی۔
''آپ نے کبھی سچ بھی نہیں بولا۔'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔
''میں کسی منصور احمد کو اپنا باپ نہیں مان سکتی، جب تک آپ مجھے کوئی سولڈ پروف نہیں دیں گی۔'' وہ بڑا حوصلہ کر کے بولی تھی۔
زینب ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔
''میری ممتا کا ثبوت کافی نہیں۔ ایک ماں اپنے بچے سے کبھی جھوٹ نہیں بولتی کشف!'' وہ کمزور سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
''بولتی ہے آنی! جب اسے ایک بنائے ہوئے باپ کے بجائے کسی اور کو پیش کرنا ہوتا ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔
زینب کے پاس اس کے اس تلخ جملے کا کوئی جواب نہیں تھا۔
''میں اتنی دکھی اپنی پوری زندگی میں نہیں ہوئی آنی! جس طرح کل آپ نے..... میں جس شخص کو باپ سمجھتی رہی.....'' اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا، وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔
''میں جانتی ہوں کشف! اور بہت شرمندہ بھی ہوں تم سے۔ مگر اس وقت یہ سونیا اور منصور کی خواہش تھی کہ تمہیں.....''
وہ رک رک کر بتانے لگی۔
''وہ کون ہوتے ہیں میری زندگی سے کھیلنے والے۔''
وہ غصے اور رنج میں چیخ اٹھی۔

''میری زندگی کوئی کھیل ہے جس کے ساتھ ہر کوئی کھیلنا چاہتا ہے۔'' اس کا دل بری طرح سے ٹوٹا تھا۔
''میں شرمندہ ہوں بیٹا! بہت زیادہ۔ میں شاید غلطی پر تھی کہ..... میں تمہیں بہلالوں گی۔'' زینب دل سے شرمندہ تھی۔
اور جن نظروں سے کشف نے ماں کو دیکھا، وہ کٹ کر رہ گئی۔
''ہو سکے تو مجھے معاف کر دو میری بیٹی!'' زینب نے بے اختیار ہی اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
وہ آنسو بہاتی ماں کو دیکھتی رہی۔
''آئی! کہیں اور چلیں..... یہاں سے دور..... بہت دور..... اس شہر سے بھی دور۔'' وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔
اور زینب کو اس سارے میں پہلی بار بہت شدت سے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کر رہی ہے کشف کے ساتھ۔
''ایسا نہ ہو میری بچی دل سے مجھ سے روٹھ جائے یا کوئی غلط قدم اٹھالے۔'' یہ سوچ کر ہی اس کا دل کانپ سا گیا۔
''تم مجھ سے کیا سچ سچ جاننا چاہ رہی تھیں؟'' اس کا دھیان بٹانے کو یونہی پوچھنے لگی۔
''میں کسی گناہ کا نتیجہ.....'' وہ جھجکی۔
''کشف.....!'' زینب کی آواز غصے میں اونچی ہو گئی۔
''میں ابھی خدا کے حضور سے اٹھ کر آئی ہوں۔ تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ ایسا کوئی بھی غلط خیال تم اپنے دل میں نہیں بٹھاؤ گی..... ایسا کچھ نہیں تھا۔'' زینب صفائی دیتے دیتے آنسو چھلکا بیٹھی۔
یہ تو اسے معلوم تھا، کبھی نہ کبھی زندگی اسے ایسے کسی موڑ پر لا کھڑا کرے گی مگر ایسا اتنی جلدی ہو جائے گا شاید اس نے سوچا نہیں تھا۔
''تو مجھے یقین کیوں نہیں آتا؟'' وہ بے بسی سے بولی۔
''اس بات کا تم یقین کر لو، ایسا کچھ نہیں تھا۔'' وہ اس کو پیار کرتے ہوئے تھپک کر بولی۔
''آئی! کہیں اور چلے جائیں ہم یہاں سے دور..... میں نے رشتوں کی بڑی بری شکلیں دیکھی ہیں۔ مجھے اب رشتوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ سونیا پھپھو کے گھر جو کچھ ہوا، پھر ثمینہ آنٹی نے جو کچھ کہا، جب بھی مجھے وہ سب یاد آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے میں خود کو ختم کر لوں۔''
وہ بری طرح سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ زینب کو احساس ہو رہا تھا۔
''ایسا کچھ بھی سوچنے سے پہلے تم میرے بارے میں نہیں سوچو گی۔ میں جس کی کل کائنات، میرا سب کچھ تم ہو۔ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا کشف! تمہاری یہ ماں تو جیتے جی قبر میں اتر جائے گی۔ مجھ سے پرامس کرو تم آئندہ ایسا کچھ نہیں سوچو گی۔''
وہ ماں کے کندھے سے لگی یوں ہی سر ہلانے لگی۔

☆☆☆

ثمینہ اور حیدر ایمان کے رشتے کے لیے آئے تھے۔
میر منصور وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھے۔
اسے جتنی نفرت حیدر سے تھی، اب اس سے اس کی بیٹی کا رشتہ جڑنے جا رہا تھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال نہیں سکتا تھا۔

زریں کے تو خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔
سونیا اور آزر بھی موجود تھے۔
ثمینہ نے تورشتہ ڈالتے ہی اٹھ کر ایمان کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پرس میں سے ڈھیر سارے نوٹ نکال کر اس کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔
''کچھ بھی دیکھنا بھالنا نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو اچھے سے جانتے ہیں تو میرے خیال میں لمبی چوڑی رسموں میں پڑنے کے بجائے ہم ڈائریکٹ نکاح اور شادی کی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔''
ثمینہ کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ ابھی ایمان کو ساتھ لے جائے۔
''ثمینہ! آپ بلال بیٹے کو بھی ساتھ لے آتیں۔'' زریں بھی بہت خوش تھی۔ جواب میں بولی۔
''زریں بھابھی! ہمارے ہاں لڑکے لڑکی ایسے موقع پر ساتھ کہاں ہوتے ہیں۔ کل آپ لوگ آئیں ہماری طرف تو بلال سے بھی ملاقات ہوجائے گی اور ساتھ میں شادی کی تاریخ بھی طے کرلیں گے۔ کیا خیال حیدر!'' اس کی مسلسل خاموشی پر ثمینہ کو کہنا پڑا۔
''ہاں، ٹھیک ہے۔ آپ لوگ کل آئیں ہماری طرف۔''
وہ بمشکل سر ہلا کر تائید کرتے ہوئے بولا۔
''بلکہ سونیا بہن اور آزر! آپ بھی ساتھ میں آیئے گا۔'' حیدر نے مروتاً دعوت دی۔
''کل تو مشکل ہے، کل ہماری طرف گیسٹ آرہے ہیں۔ پرسوں کا پروگرام ہو تو پھر دیکھتے ہیں۔'' آزر سونیا کو دیکھ کر جتانے والے انداز میں بولا تھا۔
سونیا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''کوئی بات نہیں، پرسوں کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔'' زریں فوراً سے بولی۔ اگرچہ اسے آزر کی بات اچھی نہیں آئی تھی لیکن اب چونکہ وہ ان کے گھر میں رہ رہے تھے تو ان کی باتوں کا خیال رکھنا تو ضروری تھا۔
''بائی داوے، کل کون سے گیسٹ آرہے ہیں سونیا!'' منصور کچھ بے چین سا ہو کر بولا۔
''کچھ خاص نہیں بھائی!'' سونیا نے آزر کی نظروں کی پروا کیے بغیر سرسری لہجے میں کہا۔
پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔
ایما کو وہاں مزید بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔
وہ ان سے معذرت کر کے اٹھ گئی۔ اسے جلد سے جلد یہ خوشی کی خبر رمشا سے شیئر کرنی تھی۔ وہ ان کے پورشن کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

کشف تھکے تھکے قدموں سے یونیورسٹی سے نکل کر اسٹاپ کی طرف جارہی تھی۔ جب موحد کی گاڑی اس کے پاس آ کر رکی۔
وہ اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کررہا تھا اور وہ نظرانداز کرتے جارہی تھی۔
بالآخر وہ گاڑی ایک طرف پارک کر کے اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے لگا۔
''اب یہ کس بات کی ناراضی ہے؟''
''میرا آپ سے ایسا کوئی رشتہ نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔
''اب اتنا بڑا جھوٹ بھی نہ بولو۔'' وہ مذاقاً بولا۔
''یہ جھوٹ نہیں، حقیقت ہے۔'' وہ اسی طرح جلتی رہی۔

''حقیقت تو میرے پاس ہے، اس نکاح نامے کی شکل میں۔'' وہ اس کی بات سن کر، رک کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' وہ اسے شرارت سے دیکھ کر بولا۔

''دیکھ رہی ہوں اتنا پڑھا لکھا، مہذب انسان کسی کو بلیک میل کرتے ہوئے کیسا لگتا ہے۔'' وہ طنز سے بولی۔

''میں تمہیں بلیک میلر لگتا ہوں۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

''اس سے بھی کچھ زیادہ..... ایک بات مانیں گے میری۔'' وہ ایک طرف ہو کر رک گئی۔

''تمہاری ایک نہیں، ہزار باتیں مان سکتا ہوں۔'' وہ فراخ دلی سے بولا۔

''ہزار نہیں، صرف ایک بات۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

''ہاں بولو۔'' وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔

''مجھے اس خفیہ تعلق سے آزاد کر دیں۔''

وہ اس کے بالمقابل کھڑی تھی۔

سورج بالکل سامنے تھا۔ موحد کی آنکھیں اس کی روشنی میں کھل نہیں پا رہی تھی۔

مگر وہ پھر بھی نظریں جمائے کشف کو دیکھتا جا رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا، آپ نے کس مقصد کے لیے مجھ سے یہ تعلق جوڑا تھا۔ مگر میں نے جس جلد بازی اور خوف میں یہ بے وقوفی کی تھی، اس نے میرے دن کا چین، رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔''

''کچھ میرا بھی ایسا ہی حال ہے۔''

وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔

رخ پھیر کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''تو آپ میری بات نہیں مانیں گے۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''ماننے والی ہوتی تو ضرور مانتا۔ میں نے یہ نکاح..... ہاں کہہ سکتی ہو کسی مقصد کے لیے کیا تھا مگر سچ کہوں تو اب وہ مقصد میرے دماغ میں دور دور تک کہیں بھی نہیں ہے لیکن اس کی جگہ جو جذبہ میرے دل میں ہے، شاید تم نہ تو سمجھ سکو نہ یقین کرو۔ میں واقعی تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہارے چھٹکارے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میں مر جاؤں..... تو کشف! میرے مرنے کی دعا مانگو تو شاید تمہارا کام بن جائے۔'' وہ کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا دور کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور اس میں بیٹھ کر چلا گیا۔

کشف ساکت سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

زینب گھر میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

منصور سامنے تخت پر آتی دھوپ میں اخبار لیے یوں بیٹھا تھا جیسے وہ ہر روز اس طرح یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔

وہ اسے سلام کرتی، اندر جا کر چادر اتار کر دوپٹا اوڑھتی، بیگ رکھتی، کچن کی طرف جانے لگی۔

''تم مجھ سے پوچھو گی بھی نہیں، میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' وہ اٹھ کر دو قدم اس کی طرف آیا۔

''ضرورت نہیں پوچھنے کی۔'' وہ روکھے پن سے بولی۔

''میرے تو خیال میں تمہیں تو شاید کبھی بھی میری ضرورت نہیں رہی۔'' وہ طنز سے بولا۔

''اگر یہ تمہارا خیال ہے تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی اور اندر جانے لگی۔
''کیا تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو زینب!'' اس کے لہجے میں زمانے بھر کی حدت تھی۔
''محبت کا زمانہ تو مدت ہوئی گزر چکا۔'' وہ خود کو کہنے سے باز نہیں رکھ پائی۔
وہ اسے شکایت بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔
''مگر میں تو تمہیں آج بھی اسی طرح چاہتا ہوں۔'' وہ اس کی ڈھٹائی پر ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔
''اچھا، ویسے ابھی کل ہی تم نے مجھے مطلع کیا تھا کہ تم یہاں میرے پیچھے نہیں، اس گھر کو سیل آؤٹ کرنے کے لیے آئے ہو۔'' وہ روٹی بنانے کے لیے فریج سے آٹا نکالنے لگی۔
''اس کی تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ مجھے بس غصہ آ گیا تھا اور میں نے کشف کے لیے بھی نہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالا۔'' وہ پتا نہیں واقعی شرمندہ تھا یا اس کے سامنے بن رہا تھا۔
مگر زینب کو اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
''اچھا ہوا یہ تمہارے منہ سے نکل گیا، میں بھی بہت سارے جھوٹ بولنے سے بچ گئی۔ یوں بھی کشف.....''
''پلیز، آگے کچھ نہیں کہنا۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔'' وہ لجاجت سے کہہ رہا تھا۔
وہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔ وہ نامعلوم اب اس سے کیا چاہتا تھا، کیوں یہ معافی تلافی کر رہا تھا۔
وہ خاموشی سے چولہا جلا کر توا رکھ کر آٹے کے پیڑے بنانے لگی۔
''کیا تم مجھے سن رہی ہو زینب!'' وہ عجیب اضطراب بھرے لہجے میں بولا۔ وہ ٹھٹکی۔
''اب اس کے دل میں کیا ہے؟''
''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں زینب!''
اور پیڑہ اس کے ہاتھ سے گرنے لگا۔ وہ اسے انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے کبھی دیکھا کرتا تھا۔
''اگر یہ مذاق ہے تو پلیز اسے ختم کرو۔ اگر سنجیدہ ہو تو تم فکر نہیں کرو، مجھے صرف دو تین مہینے کا ٹائم دے دو۔ میں تمہیں گھر خالی کر دوں گی۔ اس کے لیے تمہیں الٹی سیدھی آفرز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایکسکیوزمی۔'' کہہ کر وہ اس کی بات سنے بغیر تیزی سے اس کے پہلو سے گزر گئی۔
توے کے نیچے چولہا تیز آنچ سے جل رہا تھا۔

☆☆☆

''ہرگز نہیں، کیسے آپ لوگ میری مرضی، میری رضا کے بغیر میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' رمشا ایک دم بھڑک اٹھی۔ اس کو انگوٹھی پہنائی شائستہ ٹھٹک کر رک گئیں۔ رمشا روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔
آزر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
سلمان ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔
فقط سونیا کے چہرے پر اطمینان تھا۔
''آزر بھائی! آپ نے تو کہا تھا، آپ نے رمشا سے بات کر لی ہے، اس کی مرضی ہے اس رشتے کے لیے۔'' شائستہ لہجے میں ناگواری چھپا کر بمشکل نارمل انداز میں بولیں۔
''رمشا کی مرضی کے بعد ہی میں نے آپ کو بلوایا تھا۔ یہ سونیا نے اس کے دل میں کوئی بات ڈالی ہے جس کی وجہ سے یہ انکار کر رہی ہے۔''
سونیا کا چہرہ ابھی بھی بے تاثر تھا۔ شائستہ اسے پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

''بھابھی! کیا آپ نہیں چاہتیں ایسا ہو۔'' شائستہ کا لہجہ مغرورانہ تھا۔
''نہیں۔'' سونیا قطعی انداز میں بولی۔
''آئیں ماما! چلیں۔'' سلیمان کا ضبط جواب دے گیا۔
''ایسے کیسے بیٹا۔ ان لوگوں نے زبان دی ہے، کوئی مذاق ہے۔'' وہ سختی سے بولیں۔
''ٹھیک کہہ رہی ہے شائستہ!'' نماز پڑھ کر اندر آتی طاہرہ بھی بول پڑیں۔
''اور کتنی میری انسلٹ کرائیں گی، میں جا رہا ہوں۔ آپ بیٹھی رہیں یہاں۔'' غصے میں تن فن کرتا باہر نکل گیا۔
آزر نے سونیا کو گھور کر دیکھا۔
''کس وجہ سے؟'' شائستہ پوری طرح جرح کے موڈ میں تھیں۔
''ایک بیٹی کو کھو چکی ہوں، دوسری کو اتنی دور بھیجنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔'' سونیا دوٹوک انداز میں کہہ کر اٹھ کر اندر چلی گئی۔
''دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ گھر آئی نعمت کو ٹھوکر۔ ماردی ہے۔ تم فکر نہیں کرو، میں بات کرلوں گی اس سے۔ تم سلیمان کو سمجھاؤ، یہ سب یوں جھٹ پٹ نہیں ہو جاتا۔ تھوڑا تحمل رکھنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کچھ بھی ہے مشا اور سونیا کا زخم ابھی تازہ ہے۔ میں بات کروں گی۔ رشتہ تو تم طے سمجھو۔'' طاہرہ اسے تسلی دینے لگیں۔

☆☆☆

''آنی! چائے پیتی کشف نے ٹھٹک کر زینب کو دیکھا۔
''کیا یہ تمہاری خواہش نہیں تھی۔'' زینب مسکرائی۔
کشف سر ہلا کر رہ گئی۔
''کبھی تھی۔'' وہ پھیکے پن سے بولی۔
''تو اب کیا ہوا؟'' وہ اسی طرح مسکرا دی تھی۔
''اب مجھے یہ گھر اچھا لگتا ہے، محفوظ..... اپنا اپنا سا۔'' وہ اطراف میں گردن گھما کر بولی۔
اس کے سیاہ بالوں کی لٹیں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ زینب نے اسے نظر بھر کر نہ دیکھا۔
''آئی سی، تو آپ اس وجہ سے گھر شفٹ کرنے کا کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے گھر بیچنا ہے۔'' وہ دوسرے لمحے بولی۔
اسی وقت بیرونی دروازہ کھول کر ہلکی سی دستک دے کر موحد کھلے دروازے سے اندر آ گیا۔
دونوں اسے دیکھ کر چونک گئیں۔
وہ سلام کرتے ہوئے حیران سی کھڑی کشف کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔
''کشف! تم تیار ہو؟'' وہ خاصی بے تکلفی سے اس سے مخاطب ہوا تھا۔ زینب چونکی۔
''جی!'' کشف بھی حیران تھی۔
''میں لینے آیا ہوں تمہیں۔ میری پوسٹنگ ہو گئی ہے اور ہمیں یہاں سے جانا ہو گا۔''
''یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ کشف کیوں جائے گی تمہارے ساتھ؟'' زینب غصے میں بولی۔
''کیونکہ کشف میری بیوی ہے۔ نکاح کیا ہے ہم نے۔'' زینب شاکڈ سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اور پھر جل پری شہزادے سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو کر اپنی دنیا میں چلی گئی۔

وہ لحاف میں دبکا ہوا پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ دادی سے کہانی سن رہا تھا..... موسم کی ٹھنڈک کو کم کرنے کے لیے کمرے میں آتش دان روشن تھا۔ اس آتش دان کے شعلوں کو تڑپتا پھڑکتا دیکھتے ہوئے وہ خود بھی دل ہی دل میں بھڑک رہا تھا۔ اسے شہزادے پر سخت غصہ آ رہا تھا جس نے اتنی پیاری، معصوم اور بھولی بھالی جل پری کو ناراض کر دیا تھا۔ اس کے ننھے سے دل میں ایک ننھا سا الاؤ روشن ہو گیا تھا۔

غم و غصے کا الاؤ۔

نفرت کا الاؤ۔

''شہزادہ بہت برا تھا دادی!''

وہ دادی سے ہر روز ہی کوئی نہ کوئی کہانی سنا کرتا تھا۔ کبھی الہ دین کا چراغ، کبھی علی بابا اور چالیس چور، کبھی گلنار پری اور ظالم دیو کی کہانی مگر اچھی اسے سب سے زیادہ جل پری کی کہانی ہی لگا کرتی تھی۔ وہ یہ کہانی سنتے ہوئے کھو جایا کرتا تھا۔ سوچ کی کسی ایسی بستی میں چلا جایا کرتا تھا جہاں تا حد نگاہ پانی ہی پانی ہوا کرتا تھا۔ گہرے سمندر کا پانی جس میں نیلے آسمان کی ساری نیلاہٹیں سموئی ہوئی تھیں اور اس سمندر کی مختلف اطراف میں پڑے سرمئی، چٹانی پتھر..... جو اس کی نگاہوں کا مرکز ہوا کرتے تھے، دادی کہا کرتی تھیں کہ وہ جل پری ان ہی پتھروں پہ بیٹھا کرتی تھی جب شہزادہ اس سے ملنے آیا کرتا تھا اور اس کے ننھے سے دل کو بھی یقین ہوا کرتا تھا کہ کسی نہ کسی چٹانی پتھر پہ بیٹھی ہوئی جل پری اسے بھی نظر آ جائے گی۔ حسین، جمیل، سنہری بالوں والی، گھنی پلکوں والی اور میٹھی دلفریب مسکراہٹ والی جل پری۔

حنا بشریٰ

قصہ ایک جل پری کا

مکمل ناول

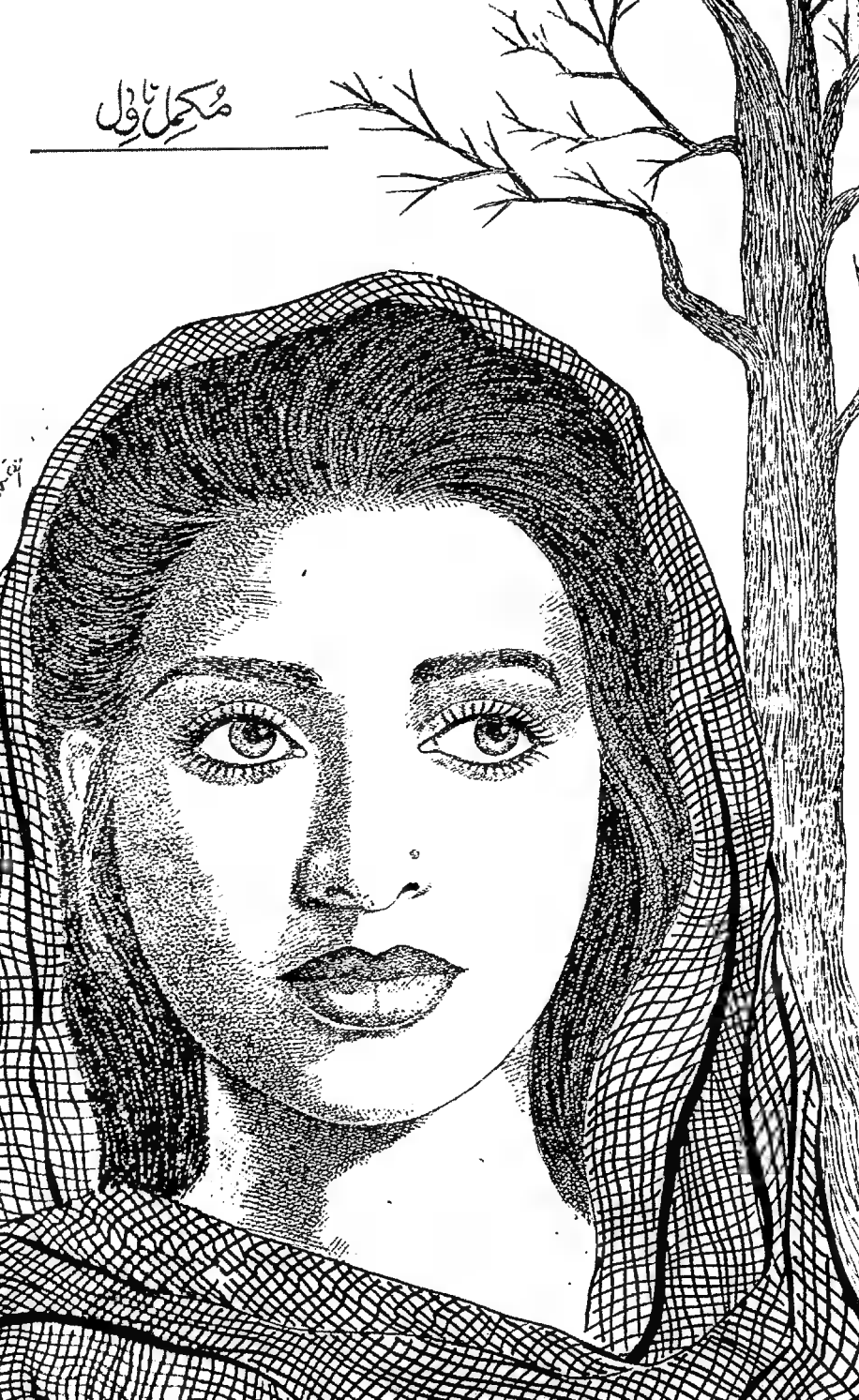

''وادی! اگر ایسی جل پری مجھے کبھی ملی تو میں اسے ناراض نہیں کروں گا۔''

اور پھر وہ دل ہی دل کئی ارادے باندھتا نیند کی وادی میں اتر جایا کرتا تھا۔ اس کی متلاشی آنکھیں خواب کی دنیا میں بھی اسی جل پری کی تلاش میں رہا کرتی تھیں۔

اور آخر ایک روز اسے وہ ''جل پری'' نظر آ ہی گئی۔ وہ بے حد حسین تھی اس کی، سوچ سے بھی زیادہ، نرم سنہرے بال آبشار کی مانند اس کی سڈول کمر پہ بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں چمک دار ستاروں کی طرح روشن..... اس کی مسکراہٹ بے حد دلکش اور سحر انگیز تھی۔ وہ سچ مچ کی جل پری تھی۔ اس کی اپنی جل پری۔ پھر اس سے بھی ایک غلطی سرزد ہوگئی۔

پھر جل پری کہیں کھوگئی..... دور، بہت دور۔

☆☆☆

شہر کے مشہور و معروف ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہ کسٹمرز کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ دن کے بارہ بجے تھے۔ اس وقت عموماً رش کم ہی ہوا کرتا تھا۔ کسٹمرز کی زیادہ تعداد شام یا رات کو اس طرف کا رخ کرتی۔ مگر وہ ہمیشہ اسی وقت آیا کرتا تھا۔

''سر! یہ ٹرائی کیجیے۔ ایک کے ساتھ ایک فری.....!'' دلکش اور مترنم سی آواز سماعتوں سے ٹکرائی ضرور مگر اپنے دھیان میں مگن اس نے اس آواز کے تعاقب میں نظریں نہ دوڑائیں۔

''سر! آپ ایک بار ٹرائی تو کریں!'' ایک بار پھر وہ جادوئی آواز سماعتوں کے آر پار ہوئی تو چیزوں کی قیمتیں دیکھتا ہوا دانیان متوجہ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

گرے کلر کے پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ سلم و اسمارٹ لڑکی اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور پہ کام کرنے والی بطور ''سیلز گرل'' ہر ایک کا یہی لباس تھا۔ گرے پینٹ کوٹ کے ساتھ سفید شرٹ اور یاہ چمکتے دمکتے جوتے کچھ سیلز گرلز نے تو میک اپ کر کے چہروں کو چمکا رکھا تھا مگر یہ میک اپ سے بالکل عاری تھا۔ بڑی بڑی یا آنکھوں میں ہلکا سا کاجل اور کمر پہ جھولتی موٹی نا سی سنہری بالوں کی چوٹی جو پشت سے بھی نیچے جا تھی۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی یہ سیلز گرل چائے پتی پورشن میں کھڑی مختلف انواع واقسام کی پ دکھانے کے ساتھ اپنی مدھر آواز میں انہیں خرید کے لیے بھی مجبور کر رہی تھی۔ بعض کسٹمرز کی د اشیائے خوردنی سے زیادہ اس حسینہ میں نظر آ تھی۔ بلاضرورت، بلاوجہ وہ اس کے پاس کھڑ تھے۔ چہرے کے تاثرات سے صاف عیاں تھ خریداری کا تو کوئی ارادہ نہ تھا۔ بس ان کی نیگاہ ''طوفان میل'' بچے شاپنگ کے لیے دائیں با پھر اسٹور کے سیکنڈ اور تھرڈ فلور پر گئے ہیں تو یہ پرست مرد اسی بہانے سے ان حسیناؤں کی ز کے سائے میں دو گھڑی سکون لینے کھڑے ہو ہیں۔ ساتھ ہی غیر ضروری اور ذو معنی جملے بھی بو رہے تھے۔

''اسٹرونگ ہے نا بھئی.....!''

''جی سر، اطمینان رکھیے.....!''

''ارے اس کے ساتھ ایک کپ بھی ہے.....؟''

''جی سر، فری کپ اور ایک کے ساتھ چائے کا پیکٹ بالکل فری.....!''

''ارے بھئی..... غیر معیاری چائے نہ ہو.....''

''نہیں سر..... ہمارا اسٹور غیر معیاری رکھتا ہی نہیں۔''

بے معنی اور بے سروپا باتیں کر کے یہ چھچھو مرد صرف ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر تھے جبکہ ہر بات اشیائے خوردنی کی پیکنگ پہ درج تھی۔ ان کی قیمتیں، ان کا معیار، ان کے مفت آفر کتنے عرصے کے لیے تھی یہ بھی در مگر غیر ضروری باتیں پھر بھی جاری تھیں۔

دانیال نے ایک بھرپور تمسخرانہ نگاہ جس میں طنز کا عنصر حاوی تھا۔ اس سیلز گرل پہ ڈالی اور اپنی ٹرالی گھسیٹتا آگے بڑھا ہی تھا کہ اسی سیلز گرل سے ٹکرا گیا۔

''سوری سر..... آئی ایم رئیلی سوری سر.....!''

ٹرالی دانیال کی بے دھیانی سے ٹکرائی تھی کیونکہ اس کا سارا دھیان سیلز گرل اور کسٹمر پر تھا۔ کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ٹرالی کہاں کی کہاں گھوم گئی۔ اور اس میں سے چند چپس اور بسکٹ اسٹور کے چکنے چمک دار فرش پر گرے تو وہ سیلز گرل بجلی کی تیزی سے نہ صرف اٹھا کر ٹرالی میں ڈالنے لگی بلکہ دانیان سے معذرت بھی کرنے لگی۔ حالانکہ غلطی سراسر دانیان کی ہی تھی مگر نایاب ان اونچے شاندار اسٹور پر کام کرنے والوں اور گاہکوں کی یہی ڈیوٹی تھی کہ کسٹمرز کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

دانیان شان بے نیازی سے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پہ ڈالتا آگے بڑھ گیا۔ دوسرے پورشن سے راؤنڈ لگاتا اس کا دوست علی بھی آچکا تھا۔

''ہوگئی شاپنگ؟'' علی کی خریداری مکمل ہوچکی تھی۔

''نہیں.....!'' یک لفظی جواب دیتے ہوئے دانیان کی نگاہیں ابھی بھی کسی چیز کی تلاش میں تھیں۔

''اوہ یار..... تو تو کسی اسٹور میں گھس جائے تو پھر تباہی پھیر دیتا ہے۔''

''بس نتاشا کے لیے پرفیوم لینا تھا۔'' اس کی نگاہیں لیڈیز پرفیوم کی تلاش میں تھیں کہ سامنے سے ہی سیلز گرل آتی دکھائی دی۔ نہ جانے کیوں تمام تر بے نیازی کے باوجود دانیان اس کی جانب متوجہ ہوا جاتا تھا..... وہ سیلز گرل دونوں ہاتھوں میں سرف کے موٹھ دس پیکٹ پکڑے تیزی سے اسی جانب آرہی تھی۔

''ویسے یار! یہ اسٹور والوں نے کمال ''پپو'' چیزیں رکھ لی ہیں!'' علی دیکھ چکا تھا کہ دانیان کا دھیان بے دھیانی میں بھی اسی ساحرہ کی جانب تھا۔

''پپو چیزیں..... مطلب.....؟''

دانیان ہنوز غائب دماغی کا شکار تھا سو علی کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ نظریں ابھی بھی اسی مجسم حسن و جمال کی جانب تھیں۔ جو سرف کے پیکٹ رکھتے ہوئے۔ اپنے کسٹمرز کو بھی مسکراتے ہوئے ڈیل کر رہی تھی۔ اور کسٹمرز بے تکلف ہونے کے لیے بار بار ''پٹری'' سے اتر رہے تھے۔

''ارے یار..... یہ سیلز گرل اور کون!'' علی نے ذومعنی سا قہقہہ لگایا، شرارت سے کہنی بھی دانیان کو ماری، تو اور وہ علی کی بات مکمل طور پہ سمجھ پایا۔

''میں سوچتا ہوں، ایسے ''شوپیس'' اسٹورز پہ رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' دانیان کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''ایسے شوپیس نہیں رکھیں گے تو اسٹور پہ گاہک کیسے آئیں گے۔''

علی نے پھر بلند بانگ قہقہے کے ساتھ شرارتی سا جملہ کسا تو ان دونوں نے محسوس کیا کہ کام میں مشغول اس سنہرے بالوں والی سیلز گرل نے عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا، اور ان نظروں میں واضح طور پہ ناگواری نظر آتی تھی۔

''جاہل۔'' وہ زیرلب بڑبڑاتی تھی۔

''کوئی باعزت کام تو نہیں ہے یہ۔'' اب دانیان کا تبصرہ کچھ سنجیدہ سا تھا اور انداز گفتگو میں کسی حد تک نخوت کی بھی آمیزش تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے عورتوں کا ملازمت کرنا سخت ناپسند تھا۔ اس کے مطابق عورت کا کام ہی کیا ہے کہ باہر نکلے، اپنی نمائش کروائے، دوسروں کی میلی نظروں کا نشانہ بنے، اس کی سوچ کے مطابق جو عورتیں گھر سے نکل کر نوکریاں کرتی ہیں، وہ مردوں کو خود اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔

اسٹورز اور ہوٹل میں کام کرتی ایسی لڑکیاں تو اسے سخت زہر لگا کرتی تھیں، اس کے نزدیک یہ کوئی باعزت روزگار نہیں تھا کہ مردوں جیسا لباس پہن کر اپنے جسموں کی نمائش کروائی۔ یہ لڑکیاں ان کے شانہ بشانہ کام کریں دانیان کا طنزان سیلز گرل کے یونیفارم پہ تھا گرے پینٹ کوٹ، وائٹ شرٹ، جس

کے بٹن اکثر سیلز گرل نے تو "ماڈرن" بننے کے چکر میں کھول رکھے تھے اور کسی نے گردن تک آخری بٹن بھی بند کر رکھا تھا۔

دانیان نے سر جھٹکتے ایک غصیلی نگاہ اس لڑکی پہ ڈالی اور شاپنگ میں مصروف ہوگیا مگر علی کا دھیان تو جیسے اس سیلز گرل کی طرف ہی چپک گیا تھا۔

"کام تو بہانا ہے ان لڑکیوں کا میرے یار۔" ہر احتیاط سے عاری علی نے یہ جملہ اتنی آواز میں کہا کہ وہ لڑکی پھر سے اس کی جانب دیکھنے لگی، اب اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصہ بھی نمایاں تھا۔

"اصل میں امیر کبیر لوگوں کے رشتے ڈھونڈنے کے چکر میں یہ لڑکیاں ایسی جگہوں پہ نوکریاں کرتی ہیں۔" علی کا پورا جملہ سیلز گرل نے سن لیا تھا۔ اس کے صبیح چہرے پر غم و غصے کی لکیریں ابھرنے لگیں۔ چہرہ غصے کے مارے سرخ ہوگیا۔

"ایکسکیوزمی! لیڈیز پرفیومز کہاں ہوں گے؟" علی نے یہ بات بھی محض چھیڑ چھاڑ کے لیے کی تھی۔

"سر! سرف اور صابن کے پورشن میں اگر آپ سارا دن بھی لیڈیز پرفیوم ڈھونڈتے رہے تو وہ بھی نہیں ملے گا۔ بہتر ہے اس پورشن کے بیک سائیڈ پہ کاسمیٹکس پورشن پہ چلے جایئے!" زہریلے انداز میں جواب دیتے ہوئے وہ دوسرے پورشن میں چلی گئی۔

علی اور دانیان کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس کی سنہری نرم و ملائم بالوں کی چوٹی۔ جو اس کی سڈول سی کمر پہ جھولتی اسے اسٹور کی تمام سیلز گرل میں نمایاں بناتی تھی۔

☆☆☆

"آیت آپی! آج اتنی دیر کردی آپ نے۔" ڈور بیل کی آواز سنتے ہی ہما اور عمر بھاگتے ہوئے باہر آگئے تھے۔ سامان سے لدی پھندی، وہ دھان پان سی لڑکی ہزار تھکاوٹوں کے باوجود بہت خوش دلی سے مسکرائی اور باری باری دونوں کی پیشانی چوم لی۔

"آپ ہمیشہ اس چوہیا کو پہلے پیار کرتی ہیں۔" آیت سامان کے پیکٹ ایک سائیڈ پہ رکھتے لکڑی کے دروازے کو کنڈی لگانے ہی لگی تھی کہ انکشاف ہوا کہ کنڈی ایک جگہ سے اکھڑ کر ہل رہی ہے۔

دس سالہ عمر کی بات سن کر اس کے تھکے ہوئے چہرے پہ ہلکا سا تبسم آ گیا عمر اور ہما اس کے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ وہ دونوں ہی اس کے دل کے بہت قریب تھے۔ وہ دونوں ہی اپنی آپی کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ ماں کے دنیا سے جانے کے بعد اس وہی ان کی ماں تھی۔

وہ ان کی ہمراہی میں سامان اٹھا کر اس چھوٹے سے گھر کے مرکزی کمرے میں آ گئی تھی۔

"السلام علیکم ابا.....!"

آیت کے والد رفیق صاحب ایک حدیث میں اپنی ٹانگیں گنوا بیٹھے تھے۔ اب گھر کی واحد کفیل آیت ہی تھی۔ جو رفیق صاحب کی بیٹی بھی تھی اور بھی کچھ عرصے تک تو رفیق صاحب کی کمپنی نے ان کے علاج کا خرچا بھجوایا مگر جب یہ خرچا بند ہوا تو نوبت فاقوں پہ آ گئی۔ آیت اس وقت کالج میں پڑھ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام بیٹا! آج بہت دیر نہیں ہوگئی؟" رفیق صاحب نے کھانستے ہوئے سلام کا جواب دیا اور دیر سے آنے کی وجہ بھی پوچھی۔

"آیت رات آٹھ بجے تک آجاتی تھی مگر آج دس بج چکے تھے، اس لیے انہیں فکر لاحق ہوئی تو انہوں نے عمر سے کہہ کر ایک دو بار آیت کو فون بھی کروایا اور ہر بار وہ یہی کہہ کر فون بند کر دیتی کہ..... بس رہی ہوں.....!"

"بس ابا! آج سیلری ملنی تھی اور راشن بھی۔ ڈیوٹی یونیفارم کے اوپر سے گاؤن اور سر سے اسکارف اتارتی، وہ قدرے اطمینان سے بولی اور تیزی سے واش روم میں گھس گئی، وہ ڈیوٹی یونیفارم سے خود آزاد کرتے دوبارہ سے ان سب کے درمیان آ

بیٹھ گئی تھی۔ سفید اور سیاہ پھول دار شلوار قمیص کے ساتھ سفید ململ کا دوپٹہ تھا۔ گھر میں اس کا یہی پہناوا ہوا کرتا تھا اور اسی میں وہ خود کو آرام دہ محسوس کرتی تھی۔ مجبوری تھی، جو ڈیوٹی کے دوران اسے یہ ناپسندیدہ لباس پہننا پڑتا تھا۔ ڈیوٹی کے دوران تو وہ اس یونیفارم میں کام کرتی، مگر بعد میں خود کو گاؤن میں چھپا کر گھر جاتی تھی۔

''ابا! یہ آپ کی دوائیاں!'' عمر اور ہما جو آیت کے لائے شاپروں میں گھسے اپنی اپنی پسند کی چیزیں نکالتے خوشی سے نہال ہو رہے تھے، ان ہی شاپروں میں سے ایک شاپر احتیاط سے نکالتے آیت نے رفیق صاحب کے قریب رکھتے ہوئے کہا، آج ان کی کھانسی بھی کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے پانچ روز سے دوائیاں ختم ہوگئی تھیں اور آیت کو سیلری کا انتظار تھا۔

''سارا بوجھ اتنی سی عمر میں تم پہ آ گیا ہے۔'' پانی کے ساتھ دوا کھلانے کے بعد آیت اب ان کی چارپائی کی پائنتی پہ بیٹھ کر نرم ہاتھوں سے ان کی ٹانگیں دبانے لگی تھی۔

''کیوں سوچتے ہیں ابا ایسے..... آپ سب میری ذمے داری ہیں، کوئی بوجھ نہیں۔''

وہ محبت سے باپ کی ٹانگیں دباتے بہت بوجھل دل کے ساتھ بولی تھی، مگر یہ بوجھل پن آیت نے آواز سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، اس بوجھل پن کے پیچھے وجہ ابا کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت تھی۔ وہ بے انتہا کمزور ہو گئے تھے۔ ان کی ٹانگ کا زخم مناسب دوا اور علاج نہ ملنے کی وجہ سے خرابی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ دوا تو آیت پھر کسی نہ کسی طرح لے آتی تھی کبھی اپنی بچپن کی دوست جو محلے میں ہی رہتی تھی، اس سے ادھار پیسے لے لیا کرتی تھی، نیلما اس کی ہمدرد بھی تھی اور اس سے مخلص بھی کسی اچھے اسپتال سے علاج کروانا اس کے بس میں نہ تھا۔

رفیق صاحب معذور تھے۔ مگر اس معذوری میں بھی اس کا سہارا تھے، بھلے وہ سارا دن بستر پہ پڑے رہتے تھے مگر ان کے بیمار وجود سے بھی آیت کو بہت ہمت ملا کرتی تھی، یہ احساس کہ دنیا میں کوئی بڑا اس کے سر پہ موجود ہے، ماں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد باپ ہی کا سہارا تھا۔

''کاش میں بیمار نہ ہوتا.....!'' جب بھی آیت کو مہینے کے آخر میں تنخواہ ملا کرتی تھی، تو رفیق صاحب بجائے خوش ہونے کے مغموم ہو جایا کرتے تھے۔

اپنی معذوری اور آیت پر اتنی کم عمری میں ذمے داریوں کا بوجھ ان کے دل کو اداس کر دیا کرتا تھا۔ اپنی خوشحالی کے دن یاد کر کے وہ غمگین ہو جایا کرتے تھے، جب ان کے گھر میں خوشیاں رقص کیا کرتی تھیں۔ قہقہے گونجتے تھے..... چھٹی کا دن کسی تہوار کی طرح منایا کرتے تھے، اہتمام سے دسترخوان سجایا جاتا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ حالات یوں بدل جائیں گے، خوشیاں یوں منہ پھیر لیں گی، غم ڈیرے ڈال لیں گے..... اور زندگی پہ ایسا جمود چھا جائے گا کہ خوشی کو ترس جائیں گے۔

''ابا! غم نہ کیا کریں، تقدیر کے آگے انسان بے بس ہوتا ہے۔'' آیت جب بھی بیمار باپ کی آنکھوں میں نمی اور دکھ کے سائے لہراتے ہوئے دیکھتی تو اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

''اچھا بتائیں، آپ کے لیے کیا بناؤں۔'' آج اس کی سیلری پانچ ہزار بڑھ گئی تھی، اب اس کی کل تنخواہ پچیس ہزار ہوگئی تھی اور اس بار راشن بھی ڈبل ملا تھا۔ اس لیے وہ بہت مطمئن تھی، شاپروں میں سے دال کا پیکٹ اور چاول نکالتے آیت نے بڑی خوش دلی سے پوچھا ہی تھا کہ جھٹ سے ہما اور عمر کا ''فرمائشی پروگرام'' جاری ہو گیا۔

''آیت آپی ہمارے لیے کسٹرڈ بنا دیں۔'' یہ عمر تھا۔

''اس میں جیلی بھی ڈالیے گا۔'' یہ ہما کی فرمائش تھی۔

''اچھا بابا..... بنا دیتی ہوں!'' ان چیزوں کے

تھی فوراً آنکھوں کے کٹوروں میں پانی بھر آیا۔

''ارے میری جان ایسے نہیں روتے!'' دانیان نے محبت سے بانہوں میں بھرتے ہوئے اپنی ننھی گڑیا کو سینے سے لگایا ہی تھا کہ دھواں دھار ہچکیاں شروع ہوگئیں۔

''بھائی! بہت بگاڑ دیا ہے آپ نے اسے۔'' ایشمل نے چڑ کر کہا۔

دانیان کے والدین سلمٰی اور جمال صاحب بزنس ٹور کے سلسلے میں کینیڈا گئے تھے، ابھی انہیں گئے ہوئے دو دن ہوئے تھے ان کی واپسی پورے ایک ڈیڑھ ہفتے بعد تھی۔ ایشمل نے ماما سے کہا بھی تھا کہ الوینہ کو ساتھ لے جائیں۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ الوینہ کے اسکول کا حرج ہوتا تھا۔ شاید سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے الوینہ اتنی حساس ہوگئی تھی۔ یا پھر دانیان کے لاڈ پیار نے اسے اتنا نازک بنا دیا تھا۔

''نہیں بھئی، ایشمل! ہماری گڑیا کو یوں تو نہ کہو!'' الوینہ کو سینے سے لپٹائے، اب وہ اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''چڑیا سا تو دل ہے میری الوینہ کا!'' دانیان کی پوری کوشش تھی کہ وہ اسے کسی نہ کسی طرح بس بہلا لے، شروع میں اس کو بہت مشکل لگا کرتا تھا۔ چھوٹی بہنوں کو بہلانا اور خاص کر الوینہ کو۔ (جب اس کی ماما پہلی بار بزنس ٹور پہ گئیں) سنبھالنا پڑا تو اسے احساس ہوا کہ لڑکیوں کو سنبھالنے کے لیے ایک عورت کا ہونا کتنا ضروری ہے۔

''ماما کو واپس بلا لیں بھائی!'' دانیان کے سینے میں منہ چھپاتے الوینہ نے اٹک اٹک کے یہ جملہ ادا کیا تھا۔ رو رو کے اس کا برا حال ہوگیا تھا۔ اس بار دانیان کو اندازہ ہوگیا تھا کہ الوینہ کو سنبھالنا بے حد دشوار ہوگیا ہے۔ وہ اس معاملے میں اتنی بے قرار اور مضطرب سی ہوگئی تھی کہ رات کو سوتے میں ڈر کر آنکھ کھل جاتی تو وہ دیر تک روتی رہتی تھی۔

''اچھا، پہلے تم کھانا کھالو پھر وہ سرپرائز دیکھ لو جو میں تم دونوں کے لیے لایا ہوں۔ پھر اچھی سی بارنی مووی دیکھیں گے اتنی دیر میں ماما کام فنش کر کے آجائیں گی.....!''

الوینہ کی بھیگی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے نہ صرف اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا بلکہ بھرپور کوشش کر کے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی مگر دانیان ناکام رہا۔ وہ یوں ہی سسکیاں بھرتے ایک ہی بات کی گردان کرتی رہی۔ جس پر ایشمل اسے غصے سے گھورنے لگی۔

''دیکھو الوینہ.....!'' دانیان نے ایک بار پھر اسے بہلانا چاہا مگر وہ ایک دم سے یوں چلائی کہ دانیان سمیت ایشمل بھی شاکڈ رہ گئی۔

''مجھے کچھ نہیں سننا بس ماما کو بلائیں.....!''

الوینہ اپنی ازلی ضد پہ اتر آئی تھی۔ وہ جنونی انداز میں چیختی اور روتی جا رہی تھی۔ دانیان اور ایشمل اسے ساکت نظروں سے دیکھ رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بار الوینہ اس قدر مضطرب کیوں نظر آرہی ہے۔

پھر اسی شور و ہنگامے کے دوران دانیان کے سیل فون پہ آنے والی انٹرنیشنل کال نے جو کینیڈا کے کسی اسپتال سے تھی۔ دانیان کو سراپا لرزا کر رکھ دیا۔ کچھ نہ ہوا تھا۔ پوری دنیا سلامت تھی۔ سب کی زندگی رواں دواں تھی۔ کسی طوفان، آندھی اور ناگہانی آفت نے کسی بستی کو بھس نہیں کیا تھا۔ کسی طوفانی سیلابی بپھری موج نے آبادی کو صفحہ ہستی سے نہیں مٹا تھا۔ کوئی آتش فشاں نہیں پھٹا تھا۔ نہ کسی برفانی تودے نے تباہی مچائی تھی۔ ساری دنیا تو سلامت تھی۔ ٹھیک ٹھاک تھی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔

بس الٹ پلٹ تو ان کی دنیا ہوئی تھی۔ بس نہیں تو ان کا آشیانہ ہوا۔ ایسی زور کی آندھی چلی تھی کہ آشیانے کا تنکا تنکا بکھر گیا تھا۔ سلمٰی اور جمال روڈ ایکسیڈنٹ میں اس بری طرح سے زخمی ہوئے تھے کہ موقعے پہ ہی دم توڑ گئے تھے۔

دانیان سے الوینہ چند پل، چند گھڑیوں کے لیے بہلائی نہیں جا رہی تھی اب تو پوری زندگی

معاملہ ہوگیا تھا، ایسا حادثہ رونما ہوگیا تھا جس کے لیے نہ دماغ تیار تھا اور نہ ہی تسلیم کرنے کو دل راضی ہو رہا تھا، مگر کسی کے ماننے اور راضی ہونے یا نہ ہونے سے کیا ہوتا تھا بس جو ہونا تھا ہوگیا۔

☆☆☆

جیسے تاریک راہوں میں جلتی ہوئی بتیاں
یوں معیشت کی چکی میں پستی ہوئی لڑکیاں
بھیگی بھیگی پلکیں، بھیگی بھیگی ردا
ان کے پیروں میں غربت کی بیڑیاں
رنج وغم میں ڈوبی ہوئی فضا
یہ زمانے کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں
ان کو کب اجازت کہ جنبش کریں
ان کی رگ رگ سے الجھی ہوئی ڈوریاں
جیسے خوشبو کے جھونکوں میں لپٹی ہوئی
بن پروں کے اچھالی گئی تتلیاں
دھوپ کی ریشمی شال میں ضوفشاں
اور ہر سمت اٹھتی ہوئی انگلیاں
دفتروں سے گھروں کا سفر عمر بھر
اور ادھوری ادھوری سی یہ لڑکیاں
سارے لمحے لہو رنگ ہوتے رہے
اور جذبوں کو دیتی رہیں تھپکیاں

کچھ خواب آیت کی آنکھوں نے بھی دیکھے تھے، جو حالات کی ستم ظریفی سے ادھورے رہ گئے تھے۔ کچھ خواہشات، کچھ آرزوئیں، کچھ امنگیں اس کے دل میں بھی تھیں۔ مگر تقدیر نے یوں اچانک ان سے بھی دست بردار ہوجانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ کیا کرسکتی تھی۔ قسمت سے لڑنا نہیں آتا تھا اور نہ ہی وہ لڑنا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس لڑائی میں سارا خسارہ اس کا ہی ہونا ہے۔

آیت نے پچھلے ایک ہفتے سے اسٹور سے چھٹی لے رکھی تھی۔ ابا کی طبیعت کچھ روز سے بہت خراب تھی۔ عمر اور ہما دونوں اتنے چھوٹے تھے کہ ان کی تیمارداری نہیں کرسکتے تھے۔

''آئی ابا.....!'' ابا کی کمزور آواز واشنگ مشین کے شور میں بمشکل اس تک پہنچی تو وہ سب کام چھوڑ کر ان کے کمرے کی طرف لپکی تھی۔ ابا رات بھر بے حد مضطرب رہے تھے۔ اس وقت بھی بری طرح سے کھانس رہے تھے۔ آیت کی آنکھیں وحشت سے پھیلنے لگیں۔

''ابا..... کیا ہوا آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے؟'' سینے کے پنجرے میں اٹکی ہوئی سانسیں جیسے آزاد ہونے کو بے کل تھیں۔ بے تحاشا کھانستے ہوئے انہوں نے آیت کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ صورتحال کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے اس نے ارحم کو فون کر دیا۔ اس دوران رفیق صاحب کا کمزور ہاتھ آیت کے ہاتھ میں ہی تھا۔

''عمر اور ہما کا خیال رکھنا میری بچی.....!'' یہ نصیحت تھی یا وصیت۔ آیت کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔

''ابا..... مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں.....!'' وہ بستر مرگ پر پڑے اس بوڑھے شخص سے یوں منتیں کرنے لگی، جیسے موت اور زندگی کا اختیار ان کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ ابا انہیں اس دنیا میں اکیلے کر گئے۔

ارحم پہنچا مگر دیر ہوچکی تھی عمر اور ہما بھی اسکول سے آئے تو اپنے گھر پہ افتاد ٹوٹی دیکھ کر وہ بھی سہم گئے۔ وہ دونوں منتظر تھے کہ آیت انہیں اپنے سینے سے لگا کر ہر خوف سے آزاد کردے۔ مگر مصیبت اور قیامت کے ان لمحات میں آیت کو ہوش ہی کہاں تھا.....؟

☆☆☆

اداسیوں میں لپٹے ہوئے دن اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر آیت کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے زندگی رک گئی ہو۔ پوری دنیا ٹھہر گئی ہو۔ سارے نظام پہ جمود طاری ہوگیا ہو۔ مگر ایسا کب ہوتا ہے۔ کسی کے جانے سے زندگی کہاں رکتی ہے، چلتی رہتی ہے، آگے بڑھتی رہتی ہے۔

''خود کو سنبھالو آیت.....!'' یہ مسز فرح انجم

تھیں۔ آیت کی اسکول ٹیچر جو بہت مہربان اور شفیق تھیں۔ وہ چند گھر چھوڑ کر آیت کے محلے میں ہی رہتی تھیں۔

''میم..... میں اکیلی رہ گئی.....'' ماں کے چلے جانے کے بعد آیت کو باپ کا سہارا تھا مگر اب وہ اس سائے سے بھی محروم ہوگئی تھی، اور وہ خود کو بہت تنہا محسوس کررہی تھی۔ اس کی زندگی اس حادثے کے بعد معمول پہ ہی نہیں آرہی تھی۔

''یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے میری جان! ایک نہ ایک دن سب کو جانا ہے۔'' مسز فرح انجم اس کو تسلی دینے کی بھرپور کوشش کررہی تھیں، جب سے یہ سانحہ گزرا تھا، وہ باقاعدگی سے ہر شام اسکول سے فارغ ہوکر آیت کی طرف ضرور آیا کرتی تھیں، اسے حوصلہ دیتیں اس کے اندر جینے کی امنگ پیدا کرتی تھیں۔

''تم ہمت ہار بیٹھیں تو ان دونوں کو کون سنبھالے گا.....!'' عمر اور ہما مسز فرح انجم کے اسکول میں ہی پڑھا کرتے تھے، انہوں نے پرنسپل سے سفارش کرکے ان کی فیس معاف کروادی تھی۔

مسز فرح انجم نے اسی اسکول میں آیت کے لیے بھی جاب کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ کوئی باعزت نوکری کرے۔ انہوں نے اسکول پرنسپل سے اس کی نوکری کی درخواست کی جو مسترد کردی گئی۔ وجہ یہ بنی کہ آیت کی تعلیم صرف ایف اے تھی۔ اور پھر آیت کو اسٹور پہ نوکری دلوانے میں اس کی دوست نیلما معاون ثابت ہوئی۔ جو خود بھی وہاں ملازمت کیا کرتی تھی۔ شروع میں تو مسز فرح انجم اس نوکری کے بالکل حق میں نہ تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آیت اور لڑکیوں کی طرح تیز طرار نہیں ہے، مگر جب وہ خود اس کی ملازمت کا بندوبست نہ کرسکیں تو خاموش ہوگئیں۔ عمر اور ہما کی تعلیم کے معاملے میں مکمل تعاون کررہی تھیں۔

مسز فرح انجم اور نیلما کی محبت بھرے رویوں کی وجہ سے آیت بیچ بھنور میں پھنسی اپنی زندگی کی کشتی کو دھکیل کر ساحل تک تو لے آئی مگر احساس ہوا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔

تین مہینے کے بعد جب وہ دوبارہ اسٹور پہ کام کرنے کے لیے گئی تو اسٹور کے مالک نے اس کی طویل غیر حاضری کے باعث اسے فارغ کردیا۔ اس سلسلے میں نیلما نے سفارش کرنے کی کوشش کی مگر بات نہ بنی۔ وہ کھلے آسمان تلے بے یارومددگار کھڑی تھی۔ ملازمت ہی تو اس کا سہارا تھی۔ جس سے وہ زندگی کی گزراوقات کررہی تھی۔ ایک بار پھر سے وہ مشکلات میں آگھری تھی۔

''آیت! تم شادی کرلو.....!'' ان مشکل حالات میں اس کے لیے شادی کا مشورہ اور وہ بھی مسز فرح انجم جیسی ہوش مند اور دانا عورت کی طرف سے حیران کن تھا۔

''شادی.....!'' اس نے آج تک اس بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ کتاب زیست کے کسی ورق پہ یہ لفظ لکھا ہی نہیں تھا۔

''میم آپ کی نظر میں شادی میرے مسائل کا حل ہے!'' اس نے یہ سوال مسز فرح انجم سے کیا تھا۔

''ہاں.....!'' مسز فرح انجم کا انداز بہت بااعتماد تھا۔

''مگر کیسے.....؟'' اور پھر مسز فرح انجم نے اپنے اس موقف پر ایسی زوردار دلیلیں دیں کہ آیت کو قائل ہونا پڑا۔

☆☆☆

زندگی اچانک ہی ایک نئے دور میں داخل ہوگئی تھی۔ سرخ گلابوں سے سجی سیج پر دلہن بنی بیٹھی آیت ابھی بھی خواب کی کیفیت میں اپنے اردگرد دیکھتے کہ کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں.....؟ مگر ہر بار ایک ہی جواب ملا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔ بہت خوش گوار اور رنگین حقیقت بالکل قوس قزح کے خوب صورت رنگوں جیسی۔

اپنے ہاتھوں پر لگی مہندی کا رنگ اور نقش ونگار دیکھتے ہوئے آیت کھوئی ہوئی تھی کہ کسی کی آمد نے سنبھلنے کا اشارہ کیا۔ نہایت متانت اور آہستہ سے کوئی

اس کے روبرو آبیٹھا تھا۔ آیت نے ابھی تک اپنے شریک سفر کو نہیں دیکھا تھا۔

''جس طرح سے یہ سب آپ کے لیے اچانک ہوا۔ میرے لیے بھی سب بہت اچانک ہے!'' وہ بہت اپنائیت سے باتیں کررہا تھا۔

''کچھ فیصلے ہم نہیں کرتے۔ وہ فیصلے شاید مقدر میں ہوتے ہیں۔'' چند لمحوں کے وقف کے بعد وہ دوبارہ سے گویا ہوا۔

''انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔'' اب اس کے لہجے میں آیت کو دکھ اور غم کی آمیزش محسوس ہوئی تھی۔ جیسے انسان کسی بڑے تکلیف دہ صدمے سے خود نہ نکلا ہو بلکہ حالات کو دیکھتے ہوئے خود کو زبردستی باہر نکالا ہو۔ آیت کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔

''میں بہت عہد و پیماں تو نہیں باندھوں گا۔ مگر آپ سے ایک وعدہ کرتا ہوں۔'' وہ یوں دھیرے دھیرے بول رہا تھا کہ جیسے اپنے جذبات وخیالات کو ہم آہنگ کرتے ہوئے لفظوں اور جملوں کو ترتیب دے رہا ہو۔ اس کی ہر بات اس کے جذبوں کے خالص ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔

''میں اس رشتے کو پوری ایمان داری سے نبھاؤں گا۔'' آیت کا مخملی ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے ایک خوب صورت سا وعدہ کیا تو بہت سے اندیشے، وسوسے جو اس نئی زندگی کے بارے میں آیت کے دل ودماغ میں تھے۔ اسے دور ہوتے محسوس ہوئے سرخ گلاب سی پنکھڑیوں جیسے نازک لبوں پر ہلکا سا تبسم آگیا۔

''کوئی بہت زیادہ تو اقعات کا بوجھ دوسرے پر ڈالنے والا انسان نہیں ہوں۔ بس ایک چھوٹی سی درخواست ہے میری۔'' آیت نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اس درخواست کی وضاحت چاہی تھی۔

''میری بہنیں میری زندگی ہیں.....'' اس کا لہجہ یوں گہرا ہوگیا تھا۔ جیسے وہ بہت اہم بات کرنے جارہا ہو یا پھر اس کی زندگی کا محور ومرکز یہی بات ہو۔

''ایشمل اور الوینہ کا بہت خیال رکھیے گا بالکل بڑی بہنوں جیسا.....'' دانیان کو آیت سے شادی کا مشورہ بھی مسز انجم نے ہی دیا تھا۔ وہ دانیان کی ماما کی تایا زاد تھیں۔ اور ایشمل اور الوینہ ان ہی کے اسکول میں پڑھا کرتی تھیں۔ سلمٰی اور جمال کی اچانک موت نے پورے گھر کا شیرازہ ایسے بکھیرا تھا کہ بائیس سالہ دانیان بری طرح سے گھبرا اٹھا تھا۔

ان چار پانچ ماہ میں اس نے کئی خواتین رکھی تھیں مگر الوینہ نہ سنبھل پائی تھی۔ الوینہ کی حالت نے دانیان کو ذہنی طور پر اتنا پریشان کردیا تھا کہ اس سے پہلے وہ زندگی میں کبھی اتنا پریشان نہ ہوا تھا۔ اس حادثے سے ایشمل بھی متاثر ہوئی تھی۔ مگر وہ کسی حد تک اب سنبھلنے لگی تھی مگر الوینہ نارمل ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مسز فرح انجم نے دانیان کو شادی کا مشورہ دیا تھا۔

جو اس کے لیے کافی حیران کن تھا۔ وہ بھی ذہنی طور پر آیت کی طرح شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے مستقبل کے حوالے سے بہت سے پلان تھے۔ اسے اعلا تعلیم کے لیے باہر جانا تھا۔ اسے اپنا کیریئر بنانا تھا۔ اور اس سب کے علاوہ ایک وجہ نتاشا بھی تھی۔ اس کی یونی فیلو..... جسے وہ چاہتا تھا اور وہ بھی دانیان سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ دانیان نے کبھی نتاشا کے علاوہ کسی اور کو شریک سفر بنانے کا سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن نتاشا ابھی شادی کے حق میں نہ تھی۔ وہ تعلیم مکمل کرکے دنیا گھومنا چاہتی تھی۔ گھر بنانا اور گھر کی ذمہ داریاں اس کے پروگرام میں شامل نہ تھیں۔ وہ ان دنوں تعلیم کے سلسلے میں امریکا میں تھی۔

باوجود کوشش کے رابطہ نہ ہوسکا۔ وہ ان حالات میں بہت بکھر گیا تھا۔ الوینہ کے معاملے کو لے کر وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ اسی دوران مسز فرح انجم نے اسے شادی کا مشورہ دیا۔

''دانیان بیٹا! اس وقت تمہارے گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے، جو تمہیں اور تمہارے گھر کو سنبھال لے۔ اگر تمہاری اپنی کوئی پسند ہے تو اس سے

شادی کرلو ورنہ جس لڑکی کا میں نے تمہارے لیے انتخاب کیا ہے وہ تمہارے لیے بہترین ثابت ہوگی اور اس کا مجھے یقین ہے۔"

مسز فرح انجم کو آیت پر پورا بھروسا تھا کہ وہی دانیان کی بکھری ہوئی زندگی کو سنبھال سکتی ہے۔ کیونکہ آیت ایک مخلص، باہمت اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ یہ وصف اللہ نے عورت میں ہی رکھا ہے کہ چاہے وہ کم عمر ہی ہو اس کے خمیر میں ممتا ہوتی ہے، وہ بکھرے ہوئے آشیانے کو سنبھال لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کبھی ماں بن کر، کبھی بڑی بہن بن کر..... تو کبھی بھابھی بن کر..... اور پھر آیت کو بھی کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور مسز فرح انجم کے لیے دانیان، آیت کے لیے بہترین انتخاب تھا دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ میرا انتخاب اور فیصلہ بہتر ثابت ہوگا۔" یہ بات مسز فرح انجم نے دانیان اور آیت دونوں سے کہی تھی۔

"آپ کے دونوں بہن بھائی آج سے میری ذمہ داری ہیں۔" ہولے سے مسکراتے ہوئے دانیان نے ایک خوب صورت سا وعدہ کرکے اس کے دل میں اپنا مرتبہ اور مقام بنایا تو آیت کے دل میں ڈھیروں سکون اتر آگیا۔

دانیان نے سونے کے دو بھاری کنگن اس عہد محبت کے ساتھ آیت کی مومی کلائیوں میں پہنا دیے کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ مخلص رہے گا۔ نتاشا اس کا ماضی تھی اور آیت اس کا حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ نتاشا سے اسے پناہ محبت تھی مگر اس نے تسلیم کرلیا تھا کہ وہ اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ اس کا نصیب آیت ہی تھی، جو بغیر دوڑ دھوپ کے اسے مل گئی تھی۔

دانیان نے نئی نویلی دلہن کے دیدار کے لیے گھونگٹ اٹھایا تو حیرت سے پھٹی آنکھوں میں محبت کے تمام رنگ ایک دم سے غائب ہوگئے۔ اگر کوئی رنگ نمایاں تھا تو وہ.....

"نفرت کا رنگ تھا.....

"غصے کا.....

حیرت کا.....

ان سب رنگوں کی وجہ یہ تھی، یہ حسین چہرہ وہ پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا نہ ہی دانیان آیت کے لیے اجنبی تھا۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر شاپنگ کرتے ہوئے دونوں کا بہت بار سامنا ہوا تھا۔ بس یہ انکشاف آج اس اہم دن پہ ہوا تھا کہ دنوں ایک دوسرے کے شریک زندگی بن گئے ہیں۔ وہ دونوں ہی اپنی جگہ حیران تھے فرق اتنا تھا کہ غصے کے زیر اثر دانیان کے منہ سے بے اختیار آپ سے "تم" نکل گیا۔

"تم" اور جبکہ آیت اس حیرانی و پریشانی کے عالم میں زیر لب میں یہی کہہ سکی تھی۔

"آپ....."

اس بھیانک انکشاف کے بعد اس کا ایک لمحہ بھی مزید وہاں ٹھہرنا محال ہوا وہ آگ بگولہ بنا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور نئی نویلی دلہن کے لیے نہ سمجھ میں آنے والے رویے کی عجیب سی "پہیلی" چھوڑ گیا۔ اب زندگی ایک نئی پہیلی کی صورت اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

کتنا بھیانک اور سنگین مذاق کیا تھا زندگی نے اس کے ساتھ..... ایسا تو اس نے کبھی بھول کر بھی نہ سوچا تھا۔ مگر اب وہ اذیت کے طوفان سے نبرد آزما تھا۔

"کیوں..... آخر کیوں؟ زندگی نے اس کے ساتھ یہ کھیل کیوں کھیلا تھا..... سوچ سوچ کر دانیان کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ جائے کہیں دور..... بہت دور..... ماں باپ کی موت کے صدمے کو بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ اس نے سہہ لیا تھا۔ مگر یہ صدمہ، یہ اذیت جو اکیلے اس کی ذات پر آئی تھی۔

وہ لاؤنج میں تنہا ٹہلتے ہوئے اپنے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہ ہو رہا تھا۔ اسی ذہنی انتشار کو دبانے کی ناکام کوشش کرتے وہ

چند پل بہنوں کے پاس گزارنے کے بہانے ان کے کمرے میں چلا آیا۔

☆☆☆

بہت روشن اور اجلا دن تھا۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں تاحد نگاہ سکون ہی سکون سمویا ہوا تھا۔ ننھے منے پرندے سبک رفتاری سے محو پرواز تھے۔ خوشی اور سکون کا تعلق انسان کے اندر سے ہوتا ہے۔ اگر اندر شادمانی کا راج ہو تو باہر سب کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر اندر ہی بے سکونی اور غم نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں تو باہر کا سکون اور رنگینیاں سب بے معنی لگتی ہیں۔ دانیان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔

رات کی بے سکونی نے اسے بیدار ہوتے ہی دوبارہ سے جھنجوڑ ڈالا تو اضطراب رگ وپے میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ رات بہت تھوڑا سا سویا تھا اور بہت جلد بیدار ہوگیا تھا۔ آج اس کی یونی بھی بند تھی۔ پاپا کے آفس وہ شام میں جایا کرتا تھا۔ پاپا کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس نے سارا بزنس سنبھال لیا تھا۔ وہ صبح میں اپنی تعلیم مکمل کرنے لگا تھا۔ اور شام میں آفس کو دیکھا کرتا تھا۔ مگر اس وقت اس کے لیے فرار کی کوئی بھی جائے پناہ نہ تھی۔

''خود تو چین کی نیند سو رہی ہوگی!'' وہ بڑبڑایا۔

حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ دانیان کے یوں اچانک کمرے سے چلے جانے پر آیت سخت حیران پریشان تھی۔ دانیان کا رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے آنے کی منتظر رہی۔ دل میں خیال بھی آیا کہ اٹھ کر باہر جائے اور صورت حال کا جائزہ لے۔ مگر نئی نویلی دلہن کو اس فعل سے حیا نے روکے رکھا۔ دل میں خیال گزارا کہ کسی ملازم نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا.....؟ اور اسی شش وپنج میں آیت نے بھی پوری رات سوتی جاگتی کیفیت میں گزار دی۔

اب اٹھ جائیں، دن چڑھ آیا ہے۔'' آیت تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے اسی بے آرام حالت میں نہ جانے کب سوئی تھی کہ کانوں میں صور پھونکتی آواز نے جھنجوڑ کر اٹھا الا۔

پست قد، فربہ بدن اور الو جیسی گول گول آنکھیں گھمائی، یہ اس خوب صورت اور عالیشان بنگلے کی بہت پرانی میڈ پروین عرف پینو تھی مگر انداز اور رعب سے وہ کہیں سے بھی میڈ نہیں لگ رہی تھی۔ آیت کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا سو وہ بے دھڑک اندر داخل ہوگئی۔

''صبح ہوگئی ہے.....؟؟''

نیند سے بوجھل آنکھیں بمشکل وا کرتے ہوئے آیت نے وال کلاک کو دیکھا تو دن کے دس بج رہے تھے۔ رات بھر کی بے آرامی کی وجہ سے اسے اپنا جوڑ جوڑ درد کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بیڈ سے اترنے کی ہمت تو دور کی بات وہ بمشکل سیدھی ہو کر بیٹھی تھی۔

''جی ہوگئی ہے صبح۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ پینو میڈ ضرور تھی مگر اس کے انداز گفتگو سے صاف عیاں تھا کہ اس نے ایک غریب گھرانے کی لڑکی کو دل سے اس بنگلے کی مالکن تسلیم نہ کیا تھا۔ ویسے بھی ایسی مالکن کی ملازموں کے سامنے کیا حیثیت اور وقعت ہوسکتی تھی، جس کا شوہر صبح سویرے ہی غائب ہوگیا ہو۔ دانیان کی اس حرکت نے پروین پر آیت کی اہمیت اور حیثیت کا راز کھول دیا تھا۔

خانساماں اچانک گاؤں چلا گیا ہے۔ ناشتا نہیں بنا کسی بارعب مالکن کی طرح حکیمہ انداز میں کہتی اور جتاتی نگاہ ڈالتی وہ خراماں خراماں چلتی کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ آیت کی آواز پر قدم رکے۔

''وہ صاحب.....!'' آیت کو دانیان کا دوبارہ سے خیال آگیا تھا جو یوں اچانک ہی کمرے سے غائب ہوگیا تھا اور اب کچھ اتا پتا نہ تھا۔

''میرا مطلب ہے..... وہ دانیان صاحب کہاں ہیں؟'' نئی نویلی دلہن پینو کی استہزائیہ مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کر رہی تھی۔ دانیان کا رویہ عجیب نہیں۔ عجیب ترین تھا۔

''مجھے کیا پتا..... اس بات کا علم تو آپ کو ہونا چاہیے!'' پینو نے طنز کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا

تھا۔ سرتاپا ایک گہری نگاہ ڈالتی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

پیو کی ہر بات سے دھیان ہٹاتے ہوئے وہ واش روم میں گھس گئی۔

☆☆☆

ناشتہ بنانے کے لیے اس کے قدموں کا رخ کچن کی طرف تھا۔ کچن بہت شان دار تھا، اس کی سوچ سے بھی زیادہ۔ وہاں اپنے گھر میں تو کچن اسٹور جتنا تھا۔ جس میں بمشکل ایک وقت میں ایک فرد ہی کھڑا ہوسکتا تھا۔ اور سامان بھی نہایت مختصر تھا۔ چند ڈبے مرچ مسالوں کے تھے، جن میں سے اکثر خالی ہی ہوا کرتے تھے اور یہاں فراوانی ہی فراوانی تھی۔ ہر ایک کیبنٹ کو کھول کر دیکھتے ہوئے جہاں دل کو سکون اور خوشی ملی وہاں دل ہی دل میں خدائے عالم کا شکر بھی ادا کیا تھا۔

''اب ناشتہ بھی تیار ہوگا یا بس یونہی ''تلاشی'' جاری رہے گی۔'' پروین ہنوز طنزیہ موڈ میں تھی، جو بظاہر تو آیت کی مدد کے لیے وہاں موجود تھی مگر سارا دھیان کسی نہ کسی بات پر تمسخر اڑانے پر تھا۔ آیت کو اپنی طرح غریب اور بے سہارا جان کر وہ شیر ہوئی جارہی تھی۔ دانیان کے رویے نے بھی اسے مزید حوصلہ دیا تھا۔ آیت کے حواس تو دانیان کے رویے نے گم کررکھے تھے۔

پیو کی ہدایت کے مطابق ناشتا بنانے کے بعد وہ ٹرے تیار کررہی تھی کہ بے ہنگم شور اور چیخ وپکار اس کے اوسان خطا کرگئی۔

''یا اللہ خیر.....!'' پروین تو سب چھوڑ چھاڑ کر باہر کو لپکی۔ اسی پل گاڑی کے ہارن کی آواز پر آیت نے بے اختیار ہی کشادہ کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھا تو دل نے گواہی دی کہ یہ اس کی آمد ہے۔ جس کے سمجھ میں نہ آنے والے رویے نے آیت کو رات بھر بے چین رکھا تھا۔ لاؤنج سے آتی آوازوں نے طوفان برپا کیا تو آیت بھی خود کو روک نہ پائی۔

''الوینہ.....! میری جان کیوں رورہی ہو؟''

''یہ دانیان تھا..... جو چیختی چلاتی اپنی لاڈلی بہن کی حالت پر بھونچکا سا رہ گیا تھا کہ چہرے پہ فکرمندی کے آثار دوچند ہوگئے تھے۔ جبکہ الوینہ بس روئے چلی جارہی تھی۔ پاس ہی ایشمل سراسیمہ سی کھڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر کھڑی پیو درد سے اپنا بازو مسل رہی تھی۔ الوینہ نے چیختے ہوئے گلدان اٹھا کر پھینکا تھا جو پیو کے جا لگا تھا۔

''نکالو..... ان گندے لوگوں کو یہاں سے.....''

الوینہ چیخے ہوئے نہ جانے کن کو ''گندے لوگ'' کہہ رہی تھی۔ ہما اور ہما اس صورت حال پر سخت گھبرا گئے تھے۔ آیت کو دیکھ کر وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئے تھے۔ آیت انہیں خود سے لپٹائے بات کو سمجھنے کی سعی کررہی تھی۔

''کیا کہا تم لوگوں نے میری بہن کو.....؟''

شاید دانیان سمجھ چکا تھا کہ اس کی چہیتی نے ''گندے لوگ'' کس کو کہا ہے۔ اس لیے اب وہ خونخوار بنا آیت کے روبرو کھڑا تھا۔ نگاہوں میں نفرت کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جبکہ آیت کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرتوں کا ایک جہان آباد تھا۔

''نن..... نہیں..... ہم نے تو.....!'' کچھ لرزتے الفاظ جملے کی شکل اختیار کرنے والے تھے کہ دانیان کے چلانے پر نوک زبان پر ہی خوف سے دم توڑ گئے۔ چاہ کر بھی آیت کچھ بول نہ پائی۔

''کیا کہا ہے تم دونوں نے میری بہن کو.....!''

ہما اور عمر کو پوری طاقت سے کھینچتے ہوئے وہ خونخوار انداز میں چنگھاڑا تھا کہ دونوں بچوں کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلی تھیں۔ وہ بے دردی سے ہما اور عمر کو بازوؤں سے جھنجوڑتے ہوئے مکمل ان کی طرف متوجہ تھا۔ وہ دونوں اس اچانک افتاد پر ایسے بوکھلائے ہوئے تھے کہ ان کی زبانیں تالو سے چپک گئی تھیں۔ ایک لفظ بھی بولنا ان کے لیے محال تھا بس موٹے موٹے آنسو ان کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔

''دانیان.....! انہوں نے آپ کی بہن کو کچھ

نہیں کہا.....!'' عمر اور ہما کی بے بسی آیت کو رلانے لگی تو وہ ان کی حمایت میں بول پڑی۔

''شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ.....''

دانیان اس شدت سے دھاڑا کہ وہاں موجود ہر شخص لرز کر رہ گیا۔ اس بار تو ایشمل بھی خوف زدہ ہوگئی۔ وہ چند قدم آگے بڑھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس نے دانیان کو بازو سے پکڑ کر ہلایا مگر وہ تو ان تینوں ''ملزموں'' کی طرف متوجہ تھا۔

''میری بہنوں کو کسی نے ذرہ برابر بھی تکلیف پہنچائی تو یاد رکھنا۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا مگر ہر لفظ انگارہ بنا آیت کی روح کو داغ رہا تھا۔

''ان ''پلوں'' سمیت تم کو دھکے مار کر باہر نکال دوں گا۔'' کس بے رحمی سے دانیان ایک ایک لفظ ادا کر رہا تھا۔

ایک قہر آلود نگاہ ڈالتا وہ خود تو چلا گیا۔ مگر آیت کے جسم و جان کو لہولہو کر گیا۔

ہما اور عمر کو خود سے لپٹائے وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

ایشمل دکھ بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ کس قدر تذلیل کر گیا تھا وہ اس کی اور اس کے بہن بھائی کی۔ لمحہ بھر میں انہیں انسان سے ''جانور'' بنا ڈالا تھا۔

لفظ پلے.....! اس کی سماعت میں گردش کرتا اسے لہولہو کر رہا تھا۔

ایک پہیلی وہ تھی جو رات اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ آخر دانیان کو ایک رات کی دلہن سے اتنی نفرت کیوں ہو رہی تھی۔ کیا گناہ تھا جس کی سزا وہ رات سے بھگت رہی تھی۔

ملازمین کی نظروں میں اس کے لیے تمسخر تھا جن میں پروین سب سے نمایاں تھی۔ بے وقعتی کا احساس اسے مارے ڈال رہا تھا۔ وہ یہ سوال اس شخص سے پوچھنا چاہتی تھی جسے تقدیر نے اور اس معاشرے نے اس کا شریک سفر بنایا تھا۔ جس کی زندگی میں وہ زبردستی نہیں اس کی مرضی سے شامل ہوئی تھی۔ مگر وہ چاہ کر بھی پوچھ نہ سکی تھی۔

دانیان کی طرف سے ملنے والا یہ اذیتوں بھرا سلسلہ یہیں تمام نہیں ہوا بلکہ یہ تو آغاز تھا۔ اور آغاز سے ہی یہ معاملہ اتنی پیچیدگیاں سمیٹے ہوئے تھا کہ آیت الجھ کر رہ گئی۔ الوینہ اس کی الجھنوں میں مزید اضافے کا باعث بنی تھی۔

''میں یہ آملیٹ نہیں کھاؤں گی..... یہ اچھا نہیں ہے۔'' الوینہ کو آیت کی کوئی بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ نہ ہی اس کا وجود اسے گھر میں گوارا تھا۔

''اتنا مزے کا تو ہے الوینہ.....!'' ایشمل جو نہایت مزے سے ناشتہ کر رہی تھی۔ اسے الوینہ کی نہ تو بات اچھی لگی تھی اور نہ ہی انداز۔ اسے ڈر تھا کہ دانیان پھر سے کوئی تماشا نہ کھڑا کر دے۔ ایشمل کو اس روز والا دانیان کا آیت کے ساتھ ہتک آمیز رویہ بھولا نہیں تھا۔

''نہیں، یہ گندا ہے۔'' الوینہ پر جیسے بھوت سوار ہو جایا کرتا تھا۔

''آپ کو اچھا نہیں لگا۔ میں نے تو بہت مزے کا بنایا ہے!'' آیت ابھی خود بھی بھوکی تھی۔ ناشتے کھانے کی ساری ذمے داری ملازموں کے ہوتے ہوئے بھی آیت پر ڈال دی گئی تھی۔ یہ دانیان کی طرف سے سخت حکم تھا کہ اس کی بہنوں کو جلدی ناشتہ دیا جائے سو وہ نماز پڑھ کر جلد ہی کچن میں آ جایا کرتی تھی۔ تاکہ الوینہ اور ایشمل کے اٹھنے سے پہلے ان کی پسند کا ناشتہ تیار کر دے۔ پھر اس کے بعد ہما اور عمر کی باری آتی تھی۔ وہ بھوکے اس کے منتظر ہوتے تھے مگر بے حد صابر بچے تھے۔ ان دونوں پر سخت پابندی تھی کہ وہ ایشمل اور الوینہ کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا نہ کریں۔

''یہ کس قسم کا ناشتا بنایا ہے؟''

دانیان یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو الوینہ کے تیکھے تیور دیکھے۔ اس کا آیت کے ساتھ رویہ ایسا ہوتا تھا جیسے مالک ملازمہ سے مخاطب ہو۔

''میں نے تو..... اس سے پوچھ کر بنایا تھا۔''
آیت منمنائی تھی۔ عمر اور ہما کے ناشتے کی فکر میں وہ جلدی جلدی کام نبٹا رہی تھی۔
''بھائی..... یہ نئی میڈ بالکل اچھی نہیں ہے۔ اسے نکال دیں فوراً'' یہ الوینہ کی اپنے بھائی سے فرمائش تھی۔ جو بہت روتے بلکتے ہوئے دانیان سے کی تھی۔ الوینہ کا خیال تھا کہ آیت نئی ملازمہ ہے وہ ذہنی طور پر اتنی چھوٹی تھی کہ ایشمل کے لاکھ سمجھانے پر بھی سمجھنے کو تیار نہ تھی کہ آیت دانیان کی بیوی ہے۔
''الوینہ.....! یہ میڈ نہیں ہیں، دانیان بھائی کی وائف ہیں۔'' ایشمل اسے سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگئی تھی اب چڑنے لگی تھی۔
''بھائی..... اس میڈ کو کہیں، اپنے ہاتھوں سے مہندی ریموو کرے۔ مجھے ان کے ہاتھوں سے بو آتی ہے۔ ایک کے بعد ایک نیا اعتراض الوینہ لے کر کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔
کبھی الوینہ کو ناشتے پر اعتراض ہوتا تو کبھی کھانے پر، کبھی اس کی سوئی اس بات پر اٹک جاتی کہ عمر اور ہما کا اس گھر میں کیا کام ہے۔ تو کبھی وہ اس بات پر رونا دھونا مچا دیتی کہ یہ دونوں ہمارے لان میں کھیلتے کودتے نظر آئے تو آخر کیوں.....؟ اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی بیکار بات کو لے کر دانیان میدان میں اتر آتا۔
''تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ تمہارے بہن بھائی بلاضرورت کمرے سے باہر نہ نکلا کریں.....'' دانیان تو جیسے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر جواز تلاش کر رہا تھا کہ کوئی بات نکلے.....'' اس کا بتنگڑ بنے۔
''منع کرتی ہوں..... بچے ہیں..... کمرے میں بند رہ کر اکتا جاتے ہیں۔''
ڈرتے ڈرتے وہ ان دونوں کا دفاع کرتی خود دانیان کے ہتھے چڑھ جایا کرتی تھی۔
''کوئی بہت اذیت پسند فطرت کے بہن بھائی ہو تم سب.....'' نہ جانے کون سی ایسی اذیت آیت نے آتے ہی دانیان کو دے دی تھی۔ جس کا شکوہ اس کی زبان پہ ہمہ وقت رہتا تھا۔

☆☆☆

''عمر اور ہما آئندہ سے الوینہ اور ایشمل کے اسکول نہیں جائیں گے.....!''
یہ دانیان کا نیا فیصلہ تھا جو آیت کے سر پر بم بن کر پھٹا تھا۔ چاروں بچے مسز فرح انجم کے اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ اور ہما، عمر تو اس وقت سے اس اسکول میں تھے جب آیت دانیان کو جانتی بھی نہ تھی۔ مسز فرح انجم نے حالات دیکھتے ہوئے ان کی فیس پرنسپل سے معاف کروادی تھی۔ یہ ان کا بہت بڑا احسان تھا آیت پر.....
''مگر کیوں.....؟'' اسکول وین ہارن پہ ہارن بجائے جا رہی تھی۔ اور دانیان نے صبح سویرے یہ نیا مسئلہ کھڑا کر کے دیا تھا۔ عمر اور ہما بھی آیت کی طرح اس اچانک افتاد پہ گھبرا گئے تھے۔
''اس لیے کہ الوینہ کو پسند نہیں.....!''
گزشتہ روز اسکول پرنسپل نے دانیان کو بلا کر الوینہ کے بچوں کے ساتھ غلط رویے کی شکایت کی تھی۔ اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ بچی کسی ذہنی الجھن میں گرفتار ہے، اس نے نہ صرف اور بچوں کے ساتھ بلکہ عمر اور ہما کے ساتھ بھی مار پیٹ، ہاتھا پائی کی ہے۔ بجائے الوینہ کے متعلق شکایات سن کر دانیان اس کو سمجھاتا بجھاتا۔ اس نے الٹا عمر اور ہما کے خلاف ہی یہ نیا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ دلی خواہش تو شاید غم و غصے کے مارے دانیان کی بھی تھی کہ ان دونوں کا پتا اس گھر سے بھی صاف کروادے۔ مگر ابھی نہ جانے کسی مصلحت کے تحت خاموش تھا۔
''آیت آپی..... یہ ہم سے لڑتی ہے..... ہمیں مارتی ہے..... ہماری کتابیں پھاڑتی ہے..... ہم اس کو کچھ نہیں کہتے.....!'' یہ عمر تھا۔ جس کے ننھے ذہن کو دانیان کا فیصلہ ناانصافی پر مبنی لگا تھا۔ تو وہ چپ نہ رہ سکا تھا۔
''آپی.....! یہ اسکول میں سب کو بتاتی ہے کہ یہ ہماری ''میڈ'' کے بہن بھائی ہیں۔'' یہ بھی ہمارے

گھر کے ''نوکر'' ہیں.....!''

منہ لٹکائے ہما نے بھی اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی۔ بھائی کے بولنے سے اس کو بھی ہمت ملی تو وہ بھی بول پڑی تھی۔ اور آیت ان دونوں کی باتیں سن کر متحیر سا رہ گئی تھی۔

عمر تو اس نئے گھر میں بالکل خوش نہ تھا۔ وہ تو آیت کی یوں اچانک شادی پہ سخت الجھن کا شکار ہوا تھا۔

'' آیت آپی..... کیا آپ کی شادی ہونا ضروری ہے.....؟؟'' آیت کی شادی سے چند روز قبل عمر نے اس سے یہ سوال پوچھا تھا۔ جو اس کی ذہنی الجھنوں کا غماز تھا۔

''ضروری کا تو مجھے پتا نہیں میری جان..... ہاں مجبوری ہے.....!'' آیت بھی فوری طور پر اس شادی کے لیے دلی طور پر تیار نہ تھی۔ مگر مسز فرح انجم کے فیصلے کے سامنے اپنی اور اپنے بہن بھائی کی بہتری اور بھلائی سمجھتے ہوئے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

'' وہ بہت نیک دل اور محبت کرنے والا لڑکا ہے..... وہ تمہارے ساتھ ساتھ عمر اور ہما کو بھی دل سے قبول کرنے پر تیار ہے.....!'' اور اس بات کو سن کر آیت کے سارے خدشات دور ہو گئے تھے۔ اگر آیت کو علم ہوتا کہ شادی کے بعد عمر اور ہما کی زندگی دانیان کے گھر میں اتنی مشکلات میں گھر جائے گی تو وہ کبھی اس کے لیے تیار نہ ہوتی۔

''دانیان..... نہ ان کی فیس کا آپ پر بوجھ ہے..... نہ ہی کتابوں اور یونیفارم کا..... یہ زیادتی ہے ان دونوں کے ساتھ.....'' آیت کی آواز آنسوؤں میں دب گئی۔ بس تعلیم ہی کا تو خزانہ تھا جو ایک غریب بہن اپنے چھوٹے بہن بھائی کے لیے محفوظ کر لینے کی فکر میں گھل رہی تھی۔

''دانیان بھائی..... الوینہ ان کو تنگ کرتی ہے..... عمر اور ہما بہت اچھے ہیں.....!!

وین والا ہارن بجا بجا کر تنگ آ کر بس جانے کے قریب تھا۔ اس نے جانے سے پہلے ایک آخری ہارن دبایا تو بیگ سنبھالتی ایشمل بھی ہما اور عمر کی حمایت میں پیچھے نہ رہی۔ اس نے ساتھ ہی غصے سے گھور کر الوینہ کو بھی دیکھا تھا، جو دانیان کے پاس کھڑی منہ پھلائے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ جو اس کا اپنا لگایا ''تماشا'' تھا۔

''وین لیٹ ہو رہی ہے..... تم دونوں اسکول جاؤ۔ ہری اپ.....'' ایشمل اور الوینہ کو اسکول کے لیے روانہ کرتے دانیان نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

''شکر کرو، میں نے ان دونوں کو صرف اس اسکول میں جانے سے روکا ہے۔ اگر میں چاہوں تو اس گھر میں ان کی کوئی جگہ نہ ہو۔''

دو چار روز عمر اور ہما اسکول نہیں آئے۔ تو اس قصے کی خبر مسز فرح انجم کو بھی ہو گئی۔

مسز فرح انجم کو بھی اس سب پر بے حد دکھ ہوا تھا۔ انہوں نے دانیان سے بات کرنا چاہی مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس مسئلے کو لے کر آیت کی شادی شدہ زندگی میں کوئی بھونچال آئے۔

مسز فرح انجم اس بات سے بالکل بے خبر تھیں کہ آیت کی زندگی میں تو بھونچال آ چکا ہے۔ آیت کی زندگی کی ناؤ بیچ بھنور بہت بری طرح پھنس گئی تھی۔ وہ تو شادی کے پہلے روز سے ہی عجیب اور سنگین حالات سے دوچار ہو چکی تھی۔ نفرت..... حقارت اور تذلیل وہ پہلا تحفہ تھا۔ جو دانیان کی طرف سے اسے اس گھر میں آتے ہی ملا تھا۔ اس نئی نویلی دلہن کی حیثیت دو کوڑی کی ملازمہ سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ اہمیت اور حیثیت والے تو اس گھر کے ملازمین تھے جو آنکھوں میں استہزاء بھرے اس نئی نویلی دلہن کی درگت بنتے دیکھ رہے تھے۔ جس کی حنائی ہتھیلیوں کا رنگ بھی ابھی پھیکا نہیں پڑا تھا۔

تم اس بات کو دل پہ نہ لو..... میرے پاس اس مسئلے کا دوسرا حل ہے۔'' مسز فرح انجم کے لیے بھی عمر اور ہما کی تعلیم بہت اہم تھی۔ وہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ

ان کا کسی قسم کا حرج ہو۔

''الوینہ ایک نفسیاتی بچی ہے۔ ماں باپ کی اچانک موت نے اسے بہت ڈسٹرب کردیا ہے۔''

مسز فرح انجم محسوس کررہی تھیں کہ آیت دانیان کے اس فیصلے پر دلی طور پر بے حد رنجیدہ سی ہے۔

''آیت! تم ایشمل اور الوینہ کے قریب ہونے کی کوشش کرو۔'' گہرے پرسوچ انداز میں مسز فرح انجم نے مشورہ دیا تھا۔

''میں عمر اور ہما کا ایڈمیشن اسی اسکول کی دوسری برانچ میں کروادیتی ہوں۔ الوینہ ذہنی طور پر سنبھل جائے گی تو پھر سے دوبارہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

مسز فرح انجم نے اپنی عقل اور دانش سے اس مسئلے کا تو حل نکال لیا تھا۔ مگر اور بہت سے مسائل تھے۔ آیت کی زندگی کے جوان کی نظروں سے ابھی اوجھل تھے نہ جانے ان کا حل کب اور کیسے نکلتا تھا؟

☆☆☆

''ارحم..... اتنے دنوں بعد آئے ہو.....؟''

آیت کی شادی کو تین مہینے ہو چلے تھے۔ آخری بار ارحم کی ملاقات آیت سے اس کی رخصتی کے وقت ہوئی تھی۔ وہ اس روز بہت بجھا بجھا سا بھی تھا اور غم زدہ بھی..... چہرہ بتا رہا تھا کہ آیت کی یوں آناً فاناً ادی کو ارحم نے بھی ذہنی طور پر قبول نہ کیا تھا۔

''ملنے آتے رہنا..... تمہارا میرا رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔''

محبت بھری یہ سرگوشی آیت نے رخصتی کے وقت ارحم کے کان میں کی تھی۔ بہت بار چاہنے کے باوجود ارحم آیت کے گھر نہ آپایا تھا۔ شاید یہ اس شان دار اونچے برجوں والے بنگلے کا رعب تھا کہ وہ اسے دور سے دیکھ کر ہی واپس لوٹ آیا کرتا تھا۔

''پتا نہیں آیت مجھ سے ملنا بھی پسند کرے گی یا نہیں؟'' یہ اندیشہ سر اٹھاتا۔ اور اگر کبھی ہمت کر کے ان قدموں سے خود کو گھسیٹتا یہاں تک پہنچ بھی جاتا تو لوٹا دیا جاتا۔

''یہ لڑکا ایک دو دفعہ پہلے بھی آیا تھا.....'' عینک کو کبھی اوپر لگا کر، کبھی مکمل اتار کر اپنی الو جیسی گول گول آنکھوں سے اچھا خاصا ارحم کا جائزہ لیتی میڈ پروین نے یہ خبر آیت کو دی تھی۔ پپو تو ارحم کو یوں سرتاپا جانچ رہی تھی کہ جیسے کوئی ''چور ڈاکو'' گھر میں گھس آیا ہو۔ آیت سے ملنے والوں کی خبر اسے دانیان کو جو دینا ہوتی تھی۔

''تم پہلے بھی آئے تھے ارحم.....؟؟'' آیت کی آنکھوں میں تشویش ابھری۔

''تو اندر کیوں نہیں آئے.....؟؟'' آیت آج بہت دنوں کے بعد بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اور اس کی یہ غیر معمولی خوشی میڈ پپو کی آنکھوں سے مخفی نہ رہ سکی تھی۔

''میں آیا تھا..... مگر انہوں نے کہا۔'' کہ آپ گھر میں نہیں.....!'' ارحم واقعی آیت ہما اور عمر سے ملنے آیا تھا۔ اور ان کے لیے مٹھائی بھی لایا تھا۔ مگر پپو نے اسے لوٹا دیا اور مٹھائی بھی واپس کردی تھی۔ اور آج بھی وہ بہت مایوس دل کے ساتھ ہمت کر کے آیا تھا۔

''ہاں تو میں نے کون سا جھوٹ بولا تھا۔'' پپو بھنا سی گئی کہ جیسے آیت کے اس مشکوک سے مہمان نے اس کی شکایت لگائی ہو۔

''گھر میں نہیں تھیں تو یہی کہا تھا.....'' لفظوں کو بری طرح پیستے ادا کیا گیا۔

جھوٹ تو پپو نے بولا تھا۔ جب سے آیت اس گھر میں آئی تھی، ایک بھی خوش گوار شام یا پھر حسین پل، یا کوئی سنہرا لمحہ جو اس نے دانیان کے سنگ باہر گزارا ہو اس کی یادداشت میں نہیں تھا۔ وہ ایک بار بھی اس کے ساتھ کہیں باہر آؤٹنگ پر نہیں گئی تھی۔ اور نہ ہی دانیان اسے اپنے ساتھ لے جانا پسند کرتا تھا، وہ تو اس بات سے بھی خار کھاتا تھا کہ آیت اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے کیونکہ اس سے بھی الوینہ کو الجھن ہوتی تھی ..... دانیان اکثر شام کو ایشمل اور الوینہ کو سیر تفریح اور شاپنگ کے لیے لے جایا کرتا تھا مگر ایسی کوئی ''خوش گوار آفر'' آیت، ہما اور عمر کے

لیے نہیں تھی۔

''آپ کو نہیں لے کر گئے صاحب.....؟؟''

اور دانیان کے جانے کے بعد یہ طنزیہ سوال تو لازمی پینو کی طرف سے داغا جانا تھا۔ اور اس سوال پر آیت اندر ہی اندر شرمندگی کے مارے گڑ جایا کرتی تھی۔

''شادی کے شروع کے دنوں میں تو میاں بیوی خوب سیر و تفریح کرتے ہیں۔ آپ کا جوڑا تو عجیب سا ہی ہے۔''

وہ دانیان کی زندگی میں بیوی کی حیثیت سے داخل ضرور ہوئی تھی مگر اس کی حیثیت بیویوں جیسی نہیں تھی۔ اس کی حیثیت تو اتنی معمولی تھی کہ اس بنگلے کی معمولی ملازمہ بھی اسے کوئی نہ کوئی بات بے دھڑک سنا دیا کرتی تھی۔

مجھے شوق ہی نہیں ہے سیر و تفریح کا.....!'' ضبط کے کڑے مرحلوں سے گزرتی آیت اس کی طنزیہ مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے یہ جواب دیتی۔ مگر اندر ہی اندر دل کرچیوں کی شکل میں ٹوٹ کر بکھر جاتا۔

''اچھا چھوڑو سب..... آؤ مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔''

بشاشت کے ساتھ آیت نے ارحم کا بازو پکڑا اور محبت سے اسے اپنے ساتھ کچن میں لے آئی۔ کیونکہ وہ اس وقت دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں الوینہ اور ایثمل نے اسکول سے آجانا تھا۔ اور الوینہ تو کھانے میں ایک منٹ کی دیر بھی برداشت نہ کیا کرتی تھی۔ آیت، ارحم کو لے کر کچن میں چلی گئی اس بات سے بے خبر کہ سی آئی ڈی آفیسر پروین کی شکی نگاہوں نے دور تک ان دونوں کا تعاقب کیا تھا۔

''پتا ہے، میں کتنے دنوں سے تمہیں یاد کر رہی تھی۔''

وہ دونوں اب کچن میں تھے۔ یہ آیت کی پرانی عادت تھی۔ وہ شادی سے پہلے بھی اپنے پرانے گھر میں کھانا پکاتے وقت ارحم کو کچن میں لے آیا کرتی تھی۔ اور ارحم کچن کے ایک کونے میں بیٹھ جایا کرتا تھا اور پھر ایک دو گھنٹے وہ دنیا جہاں کی باتیں، ہنسی مذاق، گپ شپ لگایا کرتے تھے کہ جیسے بہت گہری بچپن کی پرانی سہیلیاں آج صدیوں بعد ملی ہوں۔ اور باتوں سے پیٹ بھر رہی ہوں۔

''اور اوپر سے جناب کے پاس موبائل کی بھی سہولت نہیں.....!'' اب کے آیت نے مصنوعی خفگی دکھائی تھی۔ تو ارحم بھی ہلکا سا مسکرا دیا۔ وہ اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اچھا بتاؤ..... کیا کھاؤ گے.....؟؟'' آیت نے خوش دلی سے استفسار کیا تھا۔

''بس پانی پیوں گا.....!'' ارحم کا جواب حد درجہ تکلف میں لپٹا تھا۔ جو آیت کو عجیب سا لگا تھا۔

''بس پانی.....!'' آیت کو ارحم پہلے کی نسبت کمزور بھی لگا تھا۔ چہرہ بھی کملایا ہوا تھا۔ اور وہ بہت تھکا تھکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں کہ جیسے کسی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہو۔ یا پھر اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہو۔ آیت نے اسے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر دی۔ دم پر رکھی بریانی کو دیکھنے کے بعد اطمینان سے ارحم کے سامنے کرسی پر آبیٹھی۔ وہ دونوں کتنے دنوں بعد ملے تھے، پورے تین ماہ بعد..... ارحم کس قدر خاموش اور گم صم سا تھا۔

''اچھا بتاؤ..... تعلیم کہاں تک پہنچی ہے.....؟؟ اور آگے کا کیا پلان ہے؟؟''

''سیکنڈ لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے۔'' ارحم کا جواب مختصر سا تھا۔ وہ اپلائیڈ فزکس میں ایم ایس سی کر رہا تھا نجی یونیورسٹی سے۔ وہ غیر معمولی ذہین نوجوان تھا۔

''سیکنڈ لاسٹ.....؟؟'' آیت کا انداز پر سوچ تھا۔

''میرے حساب سے تو یہ تمہارا لاسٹ سمسٹر ہونا چاہیے تھا۔'' آیت نے حساب کتاب لگاتے سوال کیا تو بہت مدہم سی مسکراہٹ نے ارحم کے اداس چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

''ہاں..... وہ بس ایک سمسٹر مس ہو گیا تھا۔''

ارحم نے جواب اٹکتے ہوئے دیا تھا۔ اس دوران اس کی آنکھیں بلا مقصد اردگرد دیکھ رہی تھیں۔

''کیوں.....؟'' آیت یوں سنجیدہ سی ہوکر اچھل پڑی کہ جیسے اس کا اپنا سمسٹر کسی وجہ سے چھوٹ گیا ہو۔ وہ ارحم کی تعلیم کے لیے بہت حساس تھی۔ اگر آج ارحم تعلیم حاصل کر رہا تھا تو صرف اور صرف آیت کے تعاون کی وجہ سے۔

''وہ.....بس.....ایسے ہی.....!'' وہ جلد از جلد اس موضوع سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔ مگر اب آیت کہاں چھوڑنے والی تھی۔

''فیس نہیں تھی نا.....؟؟'' اس کی آنکھوں میں جھانکتی آیت کا انداز برہمی لیے ہوئے تھا۔ اور اب ارحم کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے نظروں کے ساتھ سر کو بھی جھکا لیا تھا۔

''بہت زیادتی کی ارحم! تم نے اپنے ساتھ۔'' اور پھر آیت کی دھواں دھار تقریر شروع ہوگئی۔

ارحم آیت کے دور کے رشتے کے مرحوم چچا کا بیٹا تھا۔ اس کے والدین بچپن میں ہی ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ ارحم کو رفیق صاحب اپنے گھر لے آئے۔ ارحم آیت سے صرف چند ماہ ہی چھوٹا تھا مگر قد کاٹھ ایسا نکالا تھا کہ آیت اس سے کئی برس چھوٹی لگتی تھی۔ آیت کا سلوک ارحم کے ساتھ ہمیشہ چھوٹے بھائیوں والا تھا۔ وہ بالکل ایسے عمر کی طرح سمجھتی تھی۔ جیسے وہ عمر کو ڈانٹ لیا کرتی تھی ویسے ہی ارحم کی بھی خوب کلاس لیتی تھی۔ ارحم اس کی ڈانٹ ڈپٹ کو یوں لیتا تھا جیسے محبتوں کی میٹھی گولیاں۔ وہ اگر ڈانٹتی تھی تو خیال بھی رکھتی تھی۔

''کھانا کھالیا.....؟؟''

''بس کا کرایہ ہے تمہارے پاس.....؟''

''یونیورسٹی کی فیس کب جمع کروانی ہے؟''

جب تک ارحم یہاں رہا۔ آیت اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ مگر جب رفیق صاحب کے گھر کے حالات خراب ہوگئے تو ارحم کو اس گھر میں اپنا وجود بوجھ لگنے لگا تو آیت اور رفیق صاحب کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ اپنے دوست کے گودام میں رہنے لگا۔ انہیں اپنے مال کی حفاظت کے لیے چوکیدار کی ضرورت تھی۔ چوکیدار کی نوکری کرلی۔ ٹیوشن پڑھا کر اپنے اخراجات پورے کرنے لگا۔ باقی کی مدد تعلیمی معاملات میں آیت کردیا کرتی تھی۔ جب وہ اسٹور پر جاب کرنے لگی تو ارحم کی مکمل ذمہ داری اٹھالی۔

''ارحم! تم صرف اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ اس کا کسی قسم کا حرج نہیں ہونا چاہیے۔''

یہ آیت کی ایک مخلصانہ درخواست تھی اس سے۔ ارحم کا مستقبل میں اسکالرشپ اپلائی کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ اعلا تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔ اور آیت اس کے ارادوں میں ہمیشہ اس کی بھرپور حمایت کرتی۔

آیت کچھ دیر غصے میں بولتی رہی پھر اٹھ کر کچن سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں کے بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں خاکی رنگ کا لفافہ تھا۔

''یہ لو.....!'' آیت کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ابھی تک ناراض تھی۔

''یہ کیا ہے.....؟''

''تین ماہ کی فیس.....'' لفافہ زبردستی اس کے ہاتھ میں تھماتی ■ پھر سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ آیت کی شادی کو تین ماہ ہوگئے تھے۔ اس دوران ارحم ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ جبکہ آیت نے رخصتی کے وقت اسے تاکید کی تھی کہ وہ اس کے ساتھ رابطے میں رہے۔

''میرا اور تمہارا رشتہ اتنا کمزور تو نہیں ارحم کہ کسی نئے رشتے کے زندگی میں شامل ہونے سے ٹوٹ جائے۔ تم میری ذمہ داری ہو۔ یہ ذمہ داری مجھے ابا نے سونپی تھی۔ جب تک تمہاری تعلیم مکمل نہیں ہوجاتی تم میری ذمے داری ہو۔ جب مکمل ہوجائے تو تم آزاد ہوگے۔ جہاں چاہو چلے جانا۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔''

آیت کے جذبات اس کے لیے بے غرض

تھے۔

''نہیں..... آیت! یہ میں نہیں لوں گا.....!''

ارحم لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے ایک دم سے کھڑا ہوگیا تھا۔

''مگر..... کیوں.....؟'' آیت حیرت زدہ سی کھڑی ہوگئی۔

''بس کہہ دیا نا، نہیں لینے!'' ارحم پہلی بار زندگی میں درشت سا ہوا تھا۔

آیت ایک دم مدھم پڑ گئی۔

''دانیان صاحب کے مال میں سے ایک روپیہ بھی لینا میرے لیے مناسب نہیں!'' ارحم نے خاکی لفافہ سنگ مرمر کے سلیب پر افسردگی کے ساتھ رکھا۔ اور جانے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ آیت اس کے روبرو کھڑی ہوگئی۔

''تم سے کس نے کہا ہے کہ یہ پیسے میرے شوہر کی کمائی سے ہیں!'' سینے پر دونوں بازو باندھتے وہ بہت رسانیت سے بولی تھی۔

اب لازم تھا کہ وہ بتائے کہ وہ ارحم کی تعلیم کے لیے رقم کا بندوبست کہاں سے کر رہی تھی۔

آیت کے اباریق صاحب کا دو مرلے کا ذاتی مکان تھا۔ ان کے دنیا سے جانے کے بعد بہت سے لالچی اور خود غرض رشتے دار اس مکان کے دعوے دار بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تو آیت کے دل کو فکر دامن گیر ہوئی۔ یہ مکان اس کے باپ کا تھا۔ اور حق دار وہ، عمر اور ہما تھے۔ مگر اکیلی کمزور لڑکی کو دیکھ کر سب خود غرض رشتے مختلف حیلے بہانوں سے یہ مکان ہتھیانا چاہ رہے تھے۔ اس سلسلے میں آیت کی مدد نیلما (دوست) اور اس کی فیملی نے کی۔ نیلما کی بھرپور کوششوں سے یہ خستہ حال مکان مناسب داموں پر فروخت ہوا۔

آیت مکان سے ملنے والی رقم کو عمر اور ہما کے مستقبل کے لیے محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ سو اس سلسلے میں بھی نیلما نے بھرپور مدد کی۔ آیت نے مکان کی رقم ایک بچت اسکیم میں جمع کرادی۔ تاکہ مستقبل میں یہ عمر اور ہما کے کام آسکے۔ اس کام میں بھی آیت کا نیلما کے علاوہ کوئی دوسرا راز دار نہ تھا۔ یہاں تک کہ ارحم اور مسز فرخ انجم بھی نہیں۔ اس رقم سے ملنے والے ہر ماہ کے منافع سے آیت، عمر اور ہما کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ضروریات پوری کرلیا کرتی تھی۔

''آپی..... میرے جوتے ٹوٹ گئے ہیں۔'' یہ عمر کی ضرورت ہوتی۔

''آپی..... مجھے سردیوں میں نیا سویٹر لے دینا۔'' یہ ہما کی پریشانی ہوتی اور آیت ان دونوں کی ضروریات کو نظر انداز نہیں کرسکتی تھی اور نہ ہی ان کی ضروریات کے لیے وہ دانیان کے آگے ہاتھ پھیلانا چاہتی تھی۔ اور اسی ''منافع'' سے آیت نے ارحم کی تعلیمی ضروریات کے لیے رقم الگ سے رکھ لی تھی۔

''آپ نے تایا ابو والا مکان بیچ دیا؟'' ارحم پر یہ انکشاف آج ہوا تھا۔

''ہاں.....'' آیت کے ایک لفظی جواب میں اطمینان کا اظہار تھا۔

''اور میں تمہاری فیس کے لیے رقم اس میں سے دے رہی ہوں۔ نہ کہ دانیان کی کمائی۔'' آیت کے دل میں عجیب سی چبھن ہوئی تھی کہ الفاظ ٹھہر گئے تھے۔ وہ کھوئی گئی تھی۔ سوچ کے کسی اور جہاں میں..... دور بہت دور۔

دانیان کی کمائی میں سے تو وہ خود اپنی ذات کے لیے ''دس روپے'' حق سے نہ مانگ سکی تھی۔ تو پھر اپنے پیاروں کے لیے کس ''حق'' سے اس کے آگے ہاتھ پھیلاتی؟؟ وہ اس قدر رنجیدہ سی لگنے لگی تھی کہ ارحم کے دل کو اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

''آیت.....'' ارحم نے جیسے اسے سوچ کے اس جہان سے بازو پکڑ کر باہر نکالا مگر یہ کیا..... اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تو کیا آیت کسی دکھ کا شکار ہے.....؟ وہ کسی کرب سے گزر رہی ہے؟ اتنے اونچے برجوں والے محل میں شہزادیوں سی زندگی گزارنے والی آیت غم زدہ.....؟ ارحم کا دل انجانے سے خوف سے لرزا تھا۔

مگر چاہ کر بھی سوال زبان پر نہ لا سکا تھا۔ اس کے آنسو دیکھ کر دل بوجھ کی کسی بھاری بوجھ تلے آدبا تھا۔

☆☆☆

''یو چیٹر.....'' آئی کل یو دانیان.....!''

سیاہ رنگ کی ٹائٹ جینز، وائٹ کلر کی شرٹ میں پہ سیاہ حروف سے لکھا۔ آئی ایم میڈ میں ملبوس وہ لڑکی چیختی چلاتی پچھلے بیس پچیس منٹ سے یونیورسٹی کے لان میں ہر ایک کی مسکراتی نگاہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ گوری دودھیا رنگت والی یہ بلا کی حسین لڑکی جس کی ادا سے امارت جھلکتی تھی۔ وہ دانیان کی بیسٹ فرینڈ نتاشا۔ وہ مزاجاً اور عادتاً سچ مچ کی پاگل تھی۔

''مجھے نہ تمہاری شکل دیکھنی ہے اور نہ ہی تم سے کوئی بات کرنی ہے۔'' وہ دانیان سے پرسخت خفا تھی۔ اپنی باریک پینسل ہیل سے لان کی نم گھاس کو کچلتی وہ جانے کے لیے بڑھی ہی تھی کہ دانیان نے راستہ روک لیا۔

''یہ شادی بہت ''مجبوری'' میں ہوئی تھی نتاشا.....'' دانیان نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر روک لیا۔ اس سے ناراض تھی..... شدید ناراض..... اور وجہ دانیان کی یوں اچانک آیت سے شادی تھی۔ نتاشا کے مطابق دانیان کو اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ فوری شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ دانیان شادی رچا کر بیٹھ جاتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دانیان بائیس سال کی عمر میں شادی کرے گا۔

دانیان نے ہر بات پوری وضاحت کے ساتھ نتاشا کو بتائی تو بدگمانی کی گرد جو دل کے گوشوں کو اپنی لپیٹ میں چھپاتے ہوئے تھی۔ ہٹنا شروع ہوئی۔

''مگر مجھے لگتا ہے کہ فرح آنٹی نے آیت سے شادی کروا کر میری زندگی کے ساتھ بہت غلط کیا ہے.....!''

یہ تھی اصل بات جس کی طرف اب دانیان آیا تھا۔

''میں بکھر چکا ہوں نتاشا.....'' نتاشا نے ہنس مکھ، زندگی سے بھرپور دانیان کو زندگی میں پہلی بار اتنا غم زدہ دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے بہت صدمہ ہوا تھا اور اپنی بدگمانیوں پر پشیمانی بھی۔

''مجھے..... میرے گھر کو..... میری بہنوں کو آیت نہیں تم جیسی لڑکی ضرورت ہے نتاشا!'' یہ درخواست تھی..... التجا تھی جو بھی تھی، نتاشا نے اپنا ہاتھ دانیان کے مضبوط ہاتھ پر رکھتے ہوئے اس کی الجھنوں کو دور کرنے کی حامی بھرتے یہ یقین دلایا کہ وہ ہر قدم پر اس کے ساتھ ہے۔

شام کی سیاہ چادر پر خاموشی کے گہرے سائے لرزیدہ تھے۔ چند لمحوں پہلے والی افق کی لالی اب پوری طرح سے سیاہ رنگ میں گھل چکی تھی۔

لان کے داخلی دروازے کی سیڑھیوں پر آیت تنہا بیٹھی تھی اور آسمان کے سینے سے اترتے گہرے اندھیرے کو اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تک رہی تھی۔ یہ اندھیرا اسے اپنی رگوں میں اپنی روح کی گہرائیوں میں سرایت کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے عمر اور ہما کے کمرے سے آئی تھی۔ کمرہ کیا تھا.....؟ اس شان دار سے بنگلے کا ایک چھوٹا سا اسٹور روم تھا۔ جو دانیان جیسے امیر کبیر، دریا دل انسان نے انہیں ''رحم کھا کر'' عنایت کیا تھا۔ ہما اور عمر کو آج دانیان نے بے دردی سے مارا تھا۔ ان دونوں کے چہروں کو اپنی نفرت کے طمانچوں سے زخمی کر ڈالا تھا۔

''ان کا قصور.....؟؟''

ان کا قصور یہ تھا کہ آج دوپہر میں دانیان کے یونی فرینڈز کی گیٹ ٹوگیدر پارٹی تھی۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد دانیان نے اپنے بنگلے پر سب فرینڈز کو انوائٹ کیا تھا۔ اس نے تاکید کی تھی کہ عمر اور ہما اس موقع پر ہرگز باہر نہ آئیں۔ ''اپنی شکلیں گم رکھیں''

نہ جانے کس وقت اس پارٹی کو دیکھنے کا اشتیاق انہیں باہر کھینچ لایا تو ان دونوں کی ذات ایسی بدمزگی کی وجہ بنی کہ دانیان تو ان کا خون ہی پی جاتا۔

''ارے دانیان..... یہ وہی لڑکی نہیں جو اس

اسٹور پر معمولی سی ورکر تھی.....!''

آیت جو مہمانوں کو خوش دلی سے سرو کرنے میں مشغول تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس پارٹی میں اس کی ذات اس کی پچھلی زندگی کی غربت اور حالات ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ علی جانتا تھا کہ دانیان نے گھریلو مسائل کی وجہ سے شادی کی ہے مگر اس بات کا علم اسے آج ہوا تھا کہ دانیان کی شادی آیت سے ہوئی تھی۔

''اس لڑکی سے شادی سے بہتر تھا کہ یار تو کنویں میں چلانگ لگا دیتا.....!'' علی کے الفاظ میں آیت کے لیے حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔

''تم دونوں کی کلاس کا فرق..... مزاج مختلف، سوچیں الگ..... اور سب سے بڑی بات کہ یہ لڑکیاں جو غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں نہ باوفا ہوتی ہیں اور نہ ہی ساتھ نبھانے والی.....''

علی تو ابھی نہ جانے اور کیا کیا تھا کہ چند ہی قدموں کے فاصلے پر سنگ مرمر کے مضبوط ستون کے پیچھے عمر کی سماعتوں نے اپنی آپی کے بارے میں اس کا زہریلا تبصرہ سن لیا تھا۔

''خبردار..... جو میری آپی کے بارے میں ایک لفظ بھی اور کہا.....!'' عمر کیسے یہ سب برداشت کرسکتا تھا۔

عمر نے اس زور کا دھکا دیا کہ علی توازن برقرار نہ رکھ اور پاس ہی کھڑی لڑکی سے بری طرح ٹکرا گیا۔ وہ لڑکی جو کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک چھلک کے اس کی قیمتی میکسی پر گرا تو ایک طوفان برپا ہوگیا۔

''جاہل..... بدتمیز.....''

علی نے اسے دونوں بازوں سے دبوچا۔ باقی کی کسر دانیان نے بھری محفل میں عمر کے چہرے کو طمانچوں سے لال کر کے کردی۔ عمر کو بے دردی سے پٹتا دیکھ کر آیت اور ہما کے تو اوسان ہی خطا ہوگئے۔

''چھوڑو میرے بھائی کو.....'' ننھی ہما بھی یہ منظر برداشت نہ کرپائی تو بھاگ کر عمر کو بچاتے اس کے ساتھ جو لپٹی تو دانیان کے تھپڑوں کی زد سے اسے بھی کوئی نہ بچا سکا۔

''دانیان..... چھوڑیں انہیں ..... میں معافی مانگتی ہوں۔'' یہ آیت تھی جو یہ دیکھ کر بلک اٹھی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر جہاں الو پنہ کو ڈھیروں خوشی مل رہی تھی۔ وہاں ایشمل کو گہرا رنج ہوا تھا۔ وہ بھی ان دونوں کو بچانے کے لیے لپکی تو آیت کی مددگار بنی۔

''بھائی..... عمر کا کوئی قصور نہیں ہے!'' ایشمل کو دانیان کے اس سلوک سے صدمہ ہوا تھا۔

''مس بی ہیو آپ کے فرینڈز نے کیا ہے نا کہ عمر نے!'' ایشمل نے سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر غصے میں بپھرے دانیان کو اس وقت کسی کی کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آرہی تھی۔

''آئندہ ان دونوں نے کوئی ایسی حرکت کی تو یاد رکھنا.....!'' انگشت شہادت غضب ناک انداز میں اٹھائے دانیان کا انداز دھمکی آمیز نہ تھا۔ ''وہ تم تینوں کا اس گھر میں آخری دن ہوگا۔''

مہمانوں کے سامنے آیت کو ذلیل کر کے دانیان نے یہ ثابت کردیا تھا کہ ایک جاہل اور ''لوئر کلاس'' لڑکی نے اس کی زندگی کو کس طرح عذاب میں مبتلا کردیا ہے۔ دانیان تو اس قدر ہائپر ہوگیا تھا کہ کھڑے کھڑے آیت کو تین لفظ کہہ کر دھکے مار کر گھر سے نکال دیتا لیکن اس کے دوست اسے سمجھا بجھا کر باہر لے گئے۔ ورنہ آج آیت کا اس گھر میں آخری دن ہوتا۔

آیت تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ اپنی بے بسی پر خوب ماتم کیا تھا۔ یوں جیسے آج ہی اس کے باپ کا جنازہ اٹھا تھا۔ وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔

''آپ کا کوئی دور نزدیک کا رشتہ دار نہیں ہے؟'' عمر اور ہما کو خود سے لپٹا کر بے زاری کرتی آیت بینو کی بات پہ چونکی تھی۔

''کیوں.....؟؟'' آنسوؤں تر سے لب لرز رہے تھے۔

''ان دونوں کو ان کے پاس بھیج دیں.....!'' یہ

محترمہ مینو کا ''مفت مشورہ'' تھا اس کے مطابق یہ دونوں فساد کی جڑ تھے جن کے باعث آئے روز گھر میں جھگڑا ہی رہتا تھا۔

''یہ بہن بھائی ہی ہیں۔ کون سا آپ کی اولاد ہیں!'' پینو نے یہ بات کرکے اسے سہا دیا تھا۔ وہ دونوں بے شک اس کی اولاد نہیں تھے مگر وہ تو ان دونوں کے لیے ماں کا دل رکھتی تھی۔

''رشتے دار کہاں خیال رکھتے ہیں؟'' آیت تو یوں خوف زدہ ہوئی کہ کہیں پینو یہ بات دانیان کے کان میں ڈال کر اس نئی سمت ہی روانہ نہ کردے۔ ویسے بھی آیت کا اس دنیا میں تھا ہی کون؟ ایک سگے ماموں تھے۔ جن کے گھر اس نے چند روز گزارے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد اسے اکیلے گھر میں خوف محسوس ہوا تو وہ ماموں کے گھر آ گئی۔ مگر تین دن کے بعد ہی انہوں نے سگے بھانجے اور بھانجیوں کو ''ہری جھنڈی'' دکھادی۔

آیت کا ارادہ تھا کہ اپنے گھر کو کرائے پر چڑھادے گی اور خود ماموں کے گھر (جو اچھا خاصا بڑا تھا) عمر اور ہما کے ساتھ گزارہ کرے گی مگر ماموں ممانی نے ثابت کردیا تھا کہ ان کے گھر میں اور دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں..... مجبوراً آیت کو مسز فرح انجم کا مشورہ مان کر دانیان سے شادی کرنی پڑی۔

مگر آج اس ذیت بھرے دن کے بعد اسے لگ رہا تھا کہ اس نے مسز فرح انجم کے مشورے پر عمل کرکے اچھا نہیں کیا۔ نہ تو دانیان کو اس کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس کی بہنوں کو اور نہ ہی گھر کو ضرورت تھی۔ آنسوؤں کو آنچل میں جذب کرتے وہ تلخ یادوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ قدموں کی چاپ پر پلٹی۔

''ایشمل..... آپ اس وقت؟؟'' رات کے دس بج رہے تھے۔ اس وقت تو وہ دونوں سو جایا کرتی تھیں۔ کیونکہ صبح اسکول جانا ہوتا تھا۔ دانیان ابھی تک گھر نہ لوٹا تھا۔ دوستوں کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل گیا تھا۔ اس کی واپسی لیٹ نائٹ تھی۔ بیوی کے ہوتے ہوئے اس نے فون کرکے نوکرانی پینو کو یہ پیغام دیا تھا۔ آیت کو دانیان کے اس فعل سے بہت دکھ ہوا تھا، اس کی حیثیت تو ملازمہ سے بھی کم تھی کہ اس کا شوہر اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔

''نیند نہیں آرہی تھی!'' ایشمل کا لہجہ بہت اداس تھا۔

''کیوں..... طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''

کچھ لمحوں پہلے والی اپنی تکلیف مکمل فراموش کرکے آیت کی توجہ کا کامل مرکز ایشمل تھی۔ جو اسے پہلی بار بے حد پریشان اور سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔ مگر تیرہ سالہ بچی آخر کس بات پر پریشان تھی۔ آیت سمجھ نہ پائی۔

''وہ..... میں.....'' اس سے آگے ایشمل کچھ نہ بول پائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آیت کا دل بھر آیا۔

کچھ دیر وہ اسے خود سے لپٹائے حوصلہ دیتی رہی۔ ایشمل کا دل ہلکا ہوا تو اس نے اپنی تکلیف کا تمام حال کہہ ڈالا۔ جسے سن کر آیت کی آنکھوں میں خوف اور وحشت کے سائے لرزنے لگے تھے۔

''آپ نے اتنے بڑی بات اب تک کیوں چھپائی.....!'' ایشمل کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے اس کا انداز بے حد مشفقانہ تھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنے دنوں سے یہ بچی یوں تنہا اس مسئلے سے نبرد آزما تھی۔ ایشمل تو اسکول کا ایک لڑکا ستاتا تھا جو اس سے عمر میں بھی بڑا تھا۔ شروع میں زبانی چھیڑ چھاڑ رہی۔ مگر اب وہ حد سے بڑھنے لگا تھا۔ آج اس نے ایشمل کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا تھا۔ جس کی جرأت اتنی بڑھ گئی، وہ کل کو کچھ بھی کرسکتا تھا۔

''آپ نے مسز فرح انجم کو بتایا.....؟''

''نہیں.....!''

''مگر کیوں؟''

''اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر کسی کو میری شکایت لگائی تو میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر

تمہیں اغوا کرلوں گا۔'' یہ اس بگڑے ہوئے لڑکے کی اس چھوٹی سی لڑکی کو دھمکی تھی۔

آپ بھائی کو نہ بتایئے گا۔'' ایشمل کو ڈر تھا کہ دانیان کو علم ہوا تو وہ اسکول جا کر شور مچائے گا۔ اور اس لڑکے کے خلاف سخت ایکشن لے گا۔ جس پر وہ لڑکا مزید کوئی انتقامی کارروائی کر سکتا تھا۔

''آپ بے فکر رہو۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ اب غلیظ لڑکا آئندہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا۔'' آیت نے مضبوط انداز میں کہتے ہوئے اسے تحفظ کا احساس دلایا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز ہی اس نے مسز فرح انجم سے بات کر کے ایشمل کی مشکل رفع کی تھی کہ مسئلہ حل بھی ہو گیا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔

''آئی لو یو.....!'' ہر خوف سے آزاد ایشمل نے اس سے اپنے دلی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ آیت کو اپنا وجود اس گھر میں پہلی بار معتبر لگا تھا ورنہ تو اسے یہی لگتا تھا کہ نہ تو اس گھر کو اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے مکینوں کو۔

ایشمل کے بعد الوینہ کے دل میں بھی حالات نے جگہ بنانے کے مواقع فراہم کیے تو طمانیت کا احساس اس کی روح کو پرسکون کر گیا۔ وہ لڑکی جو اس کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ آیت اس کے لیے کچھ بھی بنا کر لاتی، وہ خوش دلی سے کھا لیتی تھی نہ صرف آیت بلکہ الوینہ نے عمر اور ہما کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ یہ تبدیلی اس رات کے بعد آئی تھی وہ درد بھری رات۔

جب دانیان کچھ روز کے لیے آفس ٹور پر گیا تھا۔ الوینہ پر پھر وہی جنونی دورے پڑے جو ماما، پاپا کے جانے پر اس کی حالت ہوتی تھی وہ نہ صرف خود ڈسٹرب ہوئی بلکہ سارے گھر کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ وہ ہر وقت روتی رہتی اور یہی گردان کرتی رہتی۔

''بھائی کو بلاؤ.....!'' ایشمل اور پروین اسے سنبھالتے ہوئے بے حال ہو جاتیں، وہ مجبوراً دانیان کو فون کر دیتیں تو دیار غیر میں کام میں مصروف دانیان آیت پر غصہ اتارتا۔

''کس قسم کی عورت ہو، ایک بچی نہیں سنبھالی جاتی۔''

''دانیان..... وہ آپ کی کمی محسوس کر رہی ہے۔'' اس کی ڈانٹ ڈپٹ پر آیت روہانسی سی ہو جاتی تو ایشمل کو بھی دلی صدمہ ہوتا۔

''فرح آنٹی نے کس عذاب میں میری جان ڈال دی۔'' دانیان کو آیت کی وضاحتیں بھی زہر لگتیں تو غراتے ہوئے فون بند کر دیتا تو ان نفرتوں پر آیت کی روح چھلنی ہو جاتی۔

اس رات الوینہ رو رو کر نڈھال ہو گئی تھی۔ دانیان کے فون آف کرنے پر اس کا اضطراب بڑھنے لگا تو پورے گھر میں طوفان برپا کر دیا۔ وہ توڑ پھوڑ کرنے لگی۔ اور پھر اسی کیفیت میں قابو ہو کر گھر سے باہر نکل گئی۔

''عمر! بھاگو..... پکڑو اسے.....!'' ایشمل اور آیت بھی الوینہ کے پیچھے بھاگے۔ روڈ پر ٹریفک بھی تھی۔ مگر الوینہ بھاگتی جا رہی تھی۔ عمر بھی اس کے تعاقب میں تھا کہ اسی دوران ایک بائیک بیک وقت دونوں کو ''ہٹ'' کرتی زن سے آگے نکل گئی۔ عمر اور الوینہ کو سخت چوٹیں آئیں مگر اللہ نے زندگی کی حفاظت کر لی۔

وہ درد بھری رات آیت نے ان دونوں کے ساتھ ہسپتال میں جاگ کر گزاری تھی۔ تکلیف اور اذیت سہنے کے بعد آیت نے الوینہ کے دل میں بھی اپنی جگہ بنا لی تھی۔ مگر دانیان کے دل تک رسائی ممکن نہیں تھی کیونکہ وہاں تو پہلے ہی کسی اور کی حکمرانی تھی جس کا انکشاف پیپو کی زبانی ہوا تھا۔

''صاحب..... نتاشا بی بی کو پسند کرتے ہیں؟ کب کیے، آپ کو نہیں معلوم؟'' پیپو اس کی بے خبری پر مسکرائی تھی اس کی مسکراہٹ دل جلانے والی تھی۔

اس انکشاف کے علاوہ ایک اور انکشاف بھی آیت کے وجود کو جھنجوڑ گیا کہ یہ کوئی بزنس ٹور نہیں تھا

بلکہ دانیان نتاشا کے ساتھ کینیڈا میں تھا۔ اس بات کا ثبوت یوں ملا کہ ایشمل کے فون کرنے پر دانیان کا فون نتاشا نے اٹینڈ کیا تھا۔

آیت کا دل چاہا کہ دانیان سے خوب لڑے جھگڑا کرے۔ مگر کس حق سے؟ دانیان نے اسے کوئی حق دیا ہی کب تھا۔ جس کو استعمال کرتی۔ اس کا اور دنیان کا تو صرف کاغذی بندھن تھا۔

☆☆☆

''کون آتا رہا ہے میرے پیچھے؟'' دانیان لوٹ آیا تھا، نتاشا کی سنگت میں چند لمحے گزار کر۔ اب اسے آیت کا وجود اپنی زندگی میں گوارا نہ تھا۔ شاید وہ اب نتاشا کو پانے کے لیے جواز تلاش کر رہا تھا۔

''کون ہے وہ ذلیل اور گھٹیا انسان۔ جس پر چھپ چھپ کر میرا مال لٹا رہی ہو۔''

دانیان کا اشارہ ارحم کی طرف تھا۔ یہ ساری معلومات میڈ پینو نے فراہم کی تھیں کہ آیت اپنے کزن کی مالی معاونت کرتی ہے۔ آیت پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس سنگ دل کو دیکھ رہی تھی جس نے اس کے کردار کی دھجیاں اڑا دی تھیں، اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ سماعتوں میں دانیان کے بے رحم الفاظ گونج رہے تھے۔

''گھٹیا عورت۔''

''بدکردار''

''بے حیا۔''

''شوہر کی کمائی کو اپنے عاشق پر لٹانے والی۔''

اس کے بعد آیت کے چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اس کی ذات بھی کہیں اندھیرے میں گم ہوگئی تھی۔

☆☆☆

''اتنا کچھ ہوگیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟''

یہ مسز فرح انجم تھیں آیت کی غمگسار..... انہیں دانیان سے یہ امید نہ تھی۔ دانیان بھی صرف مسز فرح انجم کے سامنے اپنی ذات اور اپنی بات کو کلیئر کرنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ ورنہ آیت کو تو وہ کھڑے کھڑے گھر سے بے گھر کر دیتا۔ مگر آیت اب دانیان کا گھر چھوڑ آئی تھی۔

وہ گھر جہاں اس کی صرف تذلیل کی گئی تھی۔

''مجھے دانیان جیسے پڑھے لکھے۔ سلجھے ہوئے انسان سے ہرگز یہ امید نہ تھی.....!'' آیت کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ عمر اور ہما کو لے کر وہ مسز فرح انجم کے گھر آ گئی تھی اور کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اپنے لیے کوئی جاب تلاش کرے اور کسی اور ٹھکانے کا بندوبست کرے۔

گھر سے نکلتے ہوئے ایشمل اور الوینہ نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔

''پلیز، آپ نہ جائیں.....!'' یہ الوینہ کی درخواست تھی۔

''آپ چلی گئیں تو بھائی اپنی فرینڈ نتاشا سے شادی کرلیں گے۔ جو ہمیں بالکل پسند نہیں.....!'' یہ ایشمل کا خوف تھا۔

''اگر تم کہو تو میں دانیان سے اس بارے میں بات کرتی ہوں!'' مسز فرح انجم کو دانیان پہ سخت غصہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ آیت دردر کی ٹھوکریں کھائے۔

''کوئی فائدہ نہیں!'' وہ زندگی سے بالکل مایوس ہوگئی تھی، اور حالات کی بہتری کی اب اسے کوئی امید نہ تھی۔

''ٹکے ٹکے کی نوکری کرنے والی ''بدکردار'' لڑکی کی اس شخص کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہ اب نہ کبھی پہلے۔''

یہ الفاظ جتنی بار آیت کی سماعتوں میں گردش کرتے تھے، اس کی روح تک ماتم کیا کرتی تھی، دانیان نے غصے کے عالم میں اپنی نفرتوں کی وجہ بھی دھڑلے سے بیان کردی تھی۔ وہ آیت سے اس لیے پہلے دن سے نفرت کرنے لگا تھا کہ وہ شادی سے پہلے ملازمت کرتی تھی اور دانیان کی سوچ کے مطابق ملازمت پیشہ عورتیں گھر بسانے والی ہوتی ہیں اور نہ ہی باوفا اور قابل بھروسا۔ ایسی لڑکیاں اپنے حسن سے

غیر مردوں کو لبھاتے اپنی انا کو تسکین دیتی ہیں۔ ایسی عورتیں کبھی بھی ایک مرد کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتیں۔

''ان سے اس موضوع پہ بات کرنا بے کار ہے!''

آیت کی آنکھوں میں نمی آنے لگی تھی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دانیان اس سے اس لیے نفرت اور حقارت والا رویہ رکھتا تھا کہ وہ ماضی میں ملازمت کرتی رہی تھی۔

تمام تر کڑواہٹوں کے ساتھ آیت کے دل نے ان حقیقتوں کا زہر اپنی روح میں اتار لیا تھا کہ دانیان کی نظر میں اس کی کوئی عزت نہیں ہے۔ وہ اس کی نظر میں ''بدکردار'' اور گھٹیا کردار عورت رہے گی۔

☆☆☆

زندگی اپنی ڈگر پہ چل رہی تھی۔ خراماں خراماں۔

نیلما کے توسط سے آیت کو پھر سے کسی اسٹور پہ جاب مل گئی تھی۔ زمانے والوں کی نظر میں بھلے ملازمت نے اس کا کردار مشکوک بنا دیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ یہ ملازمت اس کی ضرورت بھی تھی اور مجبوری بھی۔ اس کی تنخواہ بہت کم تھی مگر کچھ نہ ہونے پہ تھوڑا بھی غنیمت تھا اور باقی کی ضروریات زندگی آیت اپنے ابا کے مکان کی بنک میں جمع شدہ رقم پوری کر رہی تھی۔ اگر اس کی زندگی میں عمر اور ہما کی ذمے داری نہ ہوتی۔ تو شاید وہ دانیان کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر کب کی موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔ مسز فرح انجم نے اس کے لیے ایک کرائے کے مکان کا بندوبست کر دیا تھا۔

وہ اپنا اور عمر و ہما کا سامان پیک کرتی روانگی کی تیاریوں میں تھی کہ سیڑھیوں سے ان دونوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کی آوازوں میں خوشی کا عنصر غالب تھا۔ وہ دونوں بہت دنوں بعد چہکے تھے۔

''ارحم بھائی! آپ کتنے دنوں بعد آئے ہیں۔''

خفا خفا سی ہما کی آواز نے اعلان کیا تو آیت کو معلوم ہوا کہ آنے والا ارحم ہے۔

''تم.....؟'' آیت حیران ہوئی تھی۔ اس نے ارحم کو گھر چھوڑنے کا نہیں بتایا تھا۔

''اب دوسرا ٹھکانا کون سا ہے؟ کیا یہ جاننے کی مجھے اجازت ہوگی!'' ارحم بہت ناراض سا لگا تھا۔

آنکھوں میں سوال بھی تھے اور شکوے بھی۔

''وہ..... دراصل..... تم بیٹھو نا!'' آیت سے فوری جواب نہ بن پایا تھا۔ آیت کے کہنے پہ ارحم خاموشی سے کرسی پہ آ بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں جو اپنے اندر تفکر اور ناراضی سموئے ہوئے تھیں آیت کے سفری بیگ اور دیگر سامان پہ جم گئی تھیں۔ چند پل خاموشی میں بیت گئے۔

''ارحم بھائی..... ہم سب بہت پریشان تھے آپی نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے، دانیان بھائی نے۔'' عمر ابھی روانی میں نہ جانے اور کیا کیا کہنے کے موڈ میں تھا کہ آیت کو ٹوکنا پڑا۔

''عمر..... جاؤ اپنی چیزوں کو سمیٹو!''

''ناراض ہو!'' آیت نے پیکنگ مکمل کر لی تھی۔ ان تینوں کا سامان کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اب وہ رسانیت سے ارحم کے سامنے آ بیٹھی تھی۔

''مجھے تو ناراض ہونے کا بھی شاید کوئی حق نہیں!'' شکستہ سا لہجہ جس میں ملال کے رنگ تھے۔

''ارحم، دراصل میں اپنی ذات کی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی!'' دکھ آنسوؤں کے گولوں کی شکل میں آیت کے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔

''آیت! میں ارحم.....!'' قدرے بلند آواز میں بولتے اس نے انگشت شہادت سینے پہ رکھتے اشارہ اپنی جانب کیا تھا۔ ''کسی'' کی فہرست میں شامل ہوں؟'' استفسار گہرے کرب کا پتا دے رہا تھا۔

ارحم کو دلی صدمہ ہوا تھا کہ آیت نے اپنی زندگی پہ گزرے اس دردناک حادثے کی اطلاع اس کو نہیں دی تھی، جبکہ آخری ملاقات پہ وہ آیت کو اپنا نمبر دے آیا تھا۔ اس سے سب کچھ چھپا کر آیت نے یہ ظاہر کیا تھا

کہ جیسے ارحم کوئی "غیر" ہے۔

ارحم کچھ روز پہلے آیت سے ملنے اس کے بنگلے پہ گیا تھا۔ اس نے امتحان میں ٹاپ کیا تھا۔ اور اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے اسے گولڈ میڈل ملا تھا اور یہ خوشی کی خبر مٹھائی کے ساتھ وہ آیت کو سنانے آیا تھا تو پتا چلا کہ آیت گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ یہ خبر پپو نے دی تھی۔

"کہاں.....؟" ارحم کو دھچکا سا لگا تھا۔

"مجھے کیا پتا..... پتا تو تمہیں ہونا چاہیے تھا۔" ارحم کو پپو کا انداز نہ صرف طنزیہ بلکہ معنی خیز بھی لگا تھا۔

"کچھ باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں۔" یہ کہتے آیت نے دانستہ نظریں چرالی تھیں۔ وہ ارحم کو بتاتے انتہائی شرم محسوس کر رہی تھی کہ اس کے شوہر دانیان نے اس کے کردار پہ کیچڑ اچھالا ہے، وہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ دانیان نے ارحم کو اس کا عاشق قرار دیا ہے اور یہ بہتان بھی لگایا ہے کہ وہ دانیان کے مال میں سے ارحم کی مالی اعانت کر رہی تھی۔

"پھر بھی آیت..... کچھ تو بتاؤ۔ یوں سب اچانک؟" آیت کو بے تحاشا روتا دیکھ کر ارحم کی ناراضی اور غصہ پلک جھپکتے ہی کافور ہو گئے تھے۔ وہ آیت سے ناراض بھلا رہ ہی کب سکتا تھا۔ "جن سے دل کا رشتہ ہوتا ہے، ان سے ناراضی بس وقتی ہوتی ہے۔

آیت نے اس کو بتایا تھا کہ دانیال کی زندگی میں کوئی اور لڑکی آ گئی تھی۔ اس لیے اس نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ وہ اپنی ذلت کی داستان ارحم کو نہیں سنانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"مجھے دوا نہیں کھانی۔ آیت کو بلاؤ!"

یہ الوینہ کی چیخ و پکار تھی۔ جس سے در و دیوار تک لرز رہے تھے۔ آیت جسے زندگی سے نکال کر وہ سمجھ رہا تھا کہ اب زندگی میں سکون ہی سکون ہوگا۔ یہ محض غلط فہمی ثابت ہوئی تھی۔

الوینہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آیت سے اتنی اٹیچ ہو گئی تھی کہ اس کے اچانک چلے جانے سے اس کی ذہنی حالت پھر سے ابتر ہو گئی تھی۔ الوینہ کی بیماری نے دانیان کو پھر سے مضطرب کر دیا تھا۔ الوینہ کی حالت سے پپو عاجز آ گئی تھی۔

"دانیان صاحب! آپ کسی اور میڈ کا بندوبست کر لیں۔ میری تو بس ہو گئی ہے۔" دانیان پروین پہ ہی بھروسا کیے ہوئے تھا۔

"پتا نہیں، آیت بی بی بچوں کو کون سی غلط عادتیں ڈال گئی ہیں کہ اب یہ بچی سنبھلنے پہ نہیں آ رہی صاحب! آپ یا تو آیت بی بی کو واپس لے آئیں پھر اس گھر کے لیے کسی اور عورت کا انتظام کر لیں۔" یہ پپو کا مشورہ تھا۔

آیت کو واپس لانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

ہاں یہ بات درست تھی کہ دانیان کے ا بکھرے ہوئے آشیانے کو، اس کی بہنوں کو اور خو دانیان کو ایک عورت کی ضرورت تھی۔ جو اس سار صورت حال کو سنبھال لیتی۔ اور اس آپشن میں نتا سے بہتر کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

موسم سرما کی شام نے سنہری گلابی اوڑھنی گھونگھٹ اپنے چہرے پہ گرالیا تھا۔ چڑیوں چہکارنے عجیب سا شور برپا کر رکھا تھا، شاید شا ہوتے ہی آشیانوں میں لوٹ جانے اور بسیرا کر کا یہ سب ہنگامہ تھا۔ آشیانوں کے سکون سے واقف یہ ننھے چرند پرند بھی تھے۔

کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتی آیت کی آنکھوا میں شبنمی پانی کی دھند برسنے لگی تھی۔

"ارحم بھائی!" عمر اور ہما کی آوازوں ۔ آیت کو چونکایا تھا۔

ارحم ان سے ملنے آیا تھا۔ اس کے دونوا ہاتھوں میں شاپر تھے جو سامان سے لدے تھے، مٹھائی بھی لایا تھا۔

گلاب جامن اور رس گلوں سے بھرا ڈبہ د

کر ہما کی تو چیخ نکل گئی تھی۔ وہ میٹھی چیزوں کی تو یوں دیوانی تھی جیسے چیونٹی۔ عمر اور ہما کو مٹھائی کھلانے کے بعد وہ جوش بھرے انداز میں اس کی جانب بڑھا تھا۔ آج وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔

''بھئی، یہ کس خوشی میں؟'' ارحم نے اپنے ہاتھ سے آیت کو رس گلا کھلایا تو وہ چند دنوں پہلے والی اداسی کو بھلاتے ہوئے بشاشت سے مسکرائی تھی۔

''مجھے جاب مل گئی ہے!''

شہر کی مشہور فرم میں مارکیٹنگ منیجر کی جاب ملی تھی وہ بھی اس کی قابلیت اور صلاحیتوں کے بل بوتے پر۔ تنخواہ بہت اچھی تھی اور کچھ عرصے بعد گاڑی اور فلیٹ بھی مل جانا تھا۔ ارحم اسی خوشی میں ان تینوں کے لیے مٹھائی اور بہت کچھ لایا تھا۔

''واقعی.....!'' آیت کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں۔ آج اسے ساری ریاضتوں اور محنتوں کا صلہ مل گیا تھا۔ ارحم اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی کامیابی آیت کو اپنی کامیابی لگ رہی تھی۔

''آج ابا زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے ارحم۔'' اس خوشی کے موقع پہ آیت کو رفیق صاحب کی یاد آ گئی تھی۔ جنہوں نے ارحم کی ذمے داری آیت کے سپرد کی تھی۔

''ارحم کو ہمیشہ عمر کی طرح سمجھنا!'' یہ ایک باپ کی بیٹی کو وصیت تھی۔ اور آیت نے اس وصیت کو کسی امانت کی طرح دل کے گوشوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ اس نے اس ذمے داری کو نہ صرف احسن طریقے سے نبھایا بلکہ ارحم پر احسان بھی نہ جتایا تھا۔

''بس دو چار مہینوں کی بات ہے پھر ہم سب نئے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے!'' یہ ارحم کا آئندہ پلان تھا جس پہ عمر اور ہما کی تو خوشی کی انتہا نہ تھی مگر آیت کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''اور اب یہ اسٹور کی نوکری بھی ختم.....!'' ارحم کو ہمیشہ سے آیت کو نوکری کرتا دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ وہ بہت کم عمری میں اپنے بیمار باپ اور چھوٹے بہن بھائی کا سہارا بننے کے لیے دنیا کی بھیڑ میں نکل آئی تھی۔ ارحم کو یہ سب دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن سوچ رکھا تھا کہ جیسے ہی اس کی تعلیم مکمل ہو گی اور جاب مل جائے گی تو وہ آیت کو نوکری ہرگز نہیں کرنے دے گا اور ان تینوں کی ساری ذمے داری خود اٹھائے گا اب قدرت نے اسے اس قابل بنا دیا تھا۔

''اچھا ہے جو آیت آپی جاب چھوڑ دیں، دانیان بھائی نے اسی جاب کی وجہ سے کتنا ذلیل کیا تھا نا!'' عمر بول اٹھا۔ بات غلط موقع پہ ہی سہی مگر منہ سے نکل گئی تھی۔

''ذلیل کیا تھا.....!'' ارحم کو آیت کے حالات جاننے کی بے چینی تو تھی، مگر آیت کی خاموشی نے اسے سوال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اب عمر کی بات سن کر وہ خود کو سوال کرنے سے روک نہ پایا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں!'' آنکھوں کی نمی کو تلخ مسکراہٹ میں چھپا کر اس نے ایک ناراضی بھری نگاہ عمر پہ ڈالی جو ارحم کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ارحم دو چار روز بعد اب اکثر ملنے آ جایا کرتا تھا آج اسے آفس کی طرف سے باقاعدہ فلیٹ کے کاغذات مل گئے تھے، وہ بہت خوش تھا اور ارادہ یہی تھا کہ آج کے آج ہی وہ سب وہاں شفٹ ہو جائیں، اسے آیت کو یوں تنگی ترشی میں گھٹ گھٹ کر رہتا دیکھ کر اذیت ہوتی تھی۔ وہ پہلے دانیان کے گھر تھی تو اور بات تھی، مگر اب ارحم اسے اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

''نہیں ارحم..... ہم یہیں ٹھیک ہیں.....!''

''اور جاب تو میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی!'' آیت اس لمحے اسے بے حد اجنبی سی لگی تھی۔

''مگر کیوں آیت؟'' ارحم کو آیت کی سرد مہری نے تکلیف پہنچائی تھی۔

''بس ارحم! ہر بات بتانے والی نہیں ہوتی۔''

مگر آج ارحم بھی ڈٹا تھا کہ حقیقت معلوم کر کے دم لے گا۔

اور پھر ارحم کے اصرار پر آیت کو اپنے اوپر گزرا تکلیف کا ہر پل، اذیت کا ہر لمحہ، تذلیل کی ہر رات، حقارت کی ہر جبر کا قصہ سنانا پڑا۔

یہ بتانا پڑا کہ وہ دانیان کی نفرتوں کی اس لیے مستحق تھی کیونکہ وہ ملازمت کرتی تھی اس کی نظر میں ملازمت پیشہ لڑکیاں باکردار نہیں ہوتیں۔

آیت کو یہ بھی بتانا پڑا کہ دانیان نے یہ بھی الزام لگایا تھا کہ آیت ارحم پر اس کی کمائی لٹا رہی تھی۔

دانیان نے ارحم کے حوالے سے بھی آیت کے کردار پر کیچڑ اچھالا تھا۔ ارحم جو اسے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ اسے دانیان نے آیت کا ''عاشق'' قرار دیا تھا۔ اب آیت ارحم کے ساتھ رہ کر دانیان کے لگائے الزام کو صحیح ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اتنا کچھ ہو گیا اور..... تم نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔'' ارحم بجھے دل کے ساتھ سر تھامے بیٹھا تھا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ بظاہر آسودہ نظر آنے والی آیت اندر سے یوں ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی مسکراہٹ مصنوعی تھی۔ قہقہے بناوٹی تھے۔ الفاظ کھوکھلے تھے۔

''آیت..... فوراً اس شخص سے خلع لو.....!''

سب جاننے کے بعد ارحم کا بھی یہی مشورہ تھا۔ نیلما کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر مسز فرح انجم کی رائے اس بارے میں بالکل مختلف تھی وہ نہیں چاہتی تھیں کہ آیت یا دانیان جلد بازی میں کوئی فیصلہ کریں۔

☆☆☆

''دانیان! آیت کو طلاق دینے سے پہلے اچھی طرح سے غور کرلو۔ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔''

دانیان جو آیت سے اپنے کاغذی بندھن کو ختم کرنے کے لیے طلاق کے پیپر بنوا چکا تھا اور اپنے اس فیصلے سے مسز فرح انجم اور نتاشا کو بھی آگاہ کر چکا تھا مگر نتاشا نے اس فیصلے پہ انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے مایوسیوں کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔

''دانیان! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے گھر اور تمہاری بہنوں کی کیئر ٹیکر بن کر تم سے شادی کروں گی تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔''

نتاشا دانیان سے محبت ضرور کرتی تھی مگر اس کی محبت اس نوعیت کی تھی کہ وہ اپنے اور دانیان کے درمیان کسی تیسرے وجود کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اور الوینہ، ایشمل ان کے درمیان تیسرا وجود تھیں۔

''الوینہ ایک سائیکو لڑکی ہے۔ اور میرا اتنا اسٹیمنا نہیں ہے کہ اسے برداشت کرسکوں۔'' نتاشا نے ایک بار پھر کورا جواب دے دیا۔ جس نے دانیان کو مزید الجھا دیا تھا۔

آیت کو وہ زندگی میں دوبارہ لانا نہیں چاہتا تھا اور نتاشا اس کی زندگی میں ایشمل اور الوینہ کو برداشت نہیں کر رہی تھی۔ الوینہ کے پاس بیڈ پہ بیٹھا اس کے ماتھے پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتا دانیان انتہائی گہری سوچ میں تھا کہ الوینہ کی بات نے اسے چونکا دیا۔

''دانیان بھائی! آیت بھابھی کو واپس لے آئیں!'' یہ بات ایشمل نہ جانے کتنی بار آیت کے جانے کے بعد دانیان سے کہہ کر اس سے ڈانٹ بھی کھا چکی تھی۔

''خبردار! جو آئندہ کسی نے اس گھر میں اس گھٹیا لڑکی کا نام لیا!''

''دانیان بھائی۔ آپ نے آیت کے ساتھ بہت برا کیا ہے!'' یہ وہی الوینہ تھی جو آیت کو دیکھتے ہی رونے چلانے لگتی تھی، اسے آیت کا وجود ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے گھر میں برداشت نہیں تھا۔ وہ اب آیت کے جانے کے بعد بیمار ہوگئی تھی۔ وہ کسی کے ہاتھ سے کھانا اور دوا تک نہیں کھا رہی تھی۔

''دیکھیں، کتنے دن ہوگئے ہیں نہ کسی نے میرے بال بنائے اور نہ میری کینڈی ڈول کے!'' عمر اور الوینہ کے روڈ ایکسیڈنٹ والے واقعے کے بعد آیت نے اس کا خیال جتنی محبت اور دل سے رکھا تھا۔ اس نے الوینہ کو اس کا دیوانہ بنا دیا تھا آیت اسے نہلاتی، اپنے ہاتھوں

سے کھانا کھلاتی۔ اس کے بال بناتی۔ الوینہ کی فرمائش پر اس کی کینڈی ڈول کے بال بھی بنائے۔

''دانیان..... تم آیت کے معاملے میں بہت جذباتی ہو کر سوچ رہے ہو۔ وہ لڑکی ہیرا ہے ہیرا۔'' مسز فرح انجم کسی مہربان رہبر کی طرح دانیان کو اس جلد بازی سے روک رہی تھیں۔ ''عورتیں ملازمت مجبوری میں بھی کرتی ہیں۔ اپنی ضرورتوں کے لیے کرتی ہیں۔ ملازمت پیشہ عورت کے بارے میں یہ سوچ رکھنا کہ وہ بے راہ روی کا شکار ہوں گی۔ بہت غلط اور دقیانوسی ہے۔ آیت دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ ایک نیک اور مخلص لڑکی ہے!''

دانیان کے لیے مسز فرح انجم کی گواہی کافی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ کبھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچتا۔ مگر آج پہلی بار سوچ رہا تھا کیونکہ ایشمل نے وہ حقائق بیان کر دیے تھے جن سے وہ ابھی تک ناواقف تھا۔ الوینہ اور عمر کے ایکسیڈنٹ والی رات، ایشمل کو اسکول میں آوارہ لڑکے کا سامنا۔ کس طرح آیت نے اسے اس مشکل سے نکالا تھا۔

''ایشمل..... آپ نے اتنی بڑی بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟'' دانیان تاسف کا شکار ہونے لگا۔ اس کی بہنوں نے ہمیشہ اس سے دل کی بات کی تھی آج پہلی بار وہ دانیان کو کچھ بتاتے ہوئے جھجکی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ لڑکیوں کی بہت سی باتیں صرف ایک عورت سمجھ سکتی ہے۔

''دانیان..... میرے خیال میں تمہاری بہنوں کو آیت سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا!'' مسز فرح انجم کی بات پر پہلی بار دانیان کے دل نے بھی تصدیق کی تھی۔ آیت ان دونوں سے یوں گھل مل گئی تھی کہ جیسے ان کی بڑی بہن ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ آیت نے اخلاقی لحاظ سے بھی ان کی تربیت کرنا شروع کی تھی۔

الوینہ اور ایشمل نے ہمیشہ اسکرٹ، ٹائٹس پہنا تھا۔ آیت نے ان دونوں کو شلوار قمیص کے ساتھ دوپٹہ پہننا سکھایا۔ وہ خود بھی یہی لباس پہنتی اور ہما کو بھی یہی پہناتی تھی تو اب الوینہ اور ایشمل کو بھی یہی پہنایا تھا۔

''اب آپ لوگ خود بتائیے کہ یہ لباس زیادہ اچھا ہے یا پھر وہ جو آپ لوگ پہلے پہنا کرتی تھیں۔''

ان ساری باتوں کو لے کر دانیان کا دماغ سوچ کی اک نئی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ وہ آیت کا موازانہ نتاشا سے کر رہا تھا۔ آیت ہر لحاظ سے اس سے مختلف تھی۔

''دانیان بھائی۔ آیت کو واپس لے آئیں نا!''

الوینہ آیت کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی ماں سے محروم وہ بچی آیت میں ہی اپنی ماں ڈھونڈ رہی تھی۔ پہلے تو ایک دو بار دانیان نے اس کی ضد پر اسے جھڑک دیا تھا مگر پھر اس کی بیماری کو دیکھتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

''دانیال بھائی! پتا ہے آیت مجھے روز رات کو اسٹوری بھی سناتی تھیں۔''

ابھی کچھ لمحوں پہلے دانیان نے الوینہ کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا جو بخار کی وجہ سے جل رہی تھی اور یہ محسوس کر کے دانیان کا دل بوجھ تلے آ گیا تھا۔

''کون سی اسٹوری.....؟'' الفاظ دھیرے دھیرے ادا ہوئے کہ اسے علم ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ لڑکی جس سے وہ اتنی نفرت کرتا تھا۔ وہ اس کی بہنوں سے کتنی قریب ہو گئی تھی۔

''شہزادے اور جل پری والی.....!'' الوینہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ دانیان کو دھکیلتے ہوئے کہیں بہت دور لے گئے۔ شاید گہرے سمندر کی نہلا ہٹوں میں۔

''شہزادہ بہت برا ہے دادی.....'' یادداشتوں میں یہ الفاظ گونجے۔

''اگر مجھے ایسی جل پری ملی تو میں اسے کبھی ناراض نہیں کروں گا اور اگر ناراض ہو گئی تو فوراً منالوں گا۔''

آیت بھی بالکل جل پری جیسی تھی جس کے سنہری بال تھے۔ کمر پر بکھرے ہوئے۔ روشن بڑی بڑی آنکھیں اور دودھیا گلابی رنگت تھی۔ دانیان کو یاد تھا جب اس نے پہلی بار آیت کو اسٹور پر دیکھا تھا بے دھیانی میں بھی اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر آیت کی

طرف جارہی تھیں۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ اس لڑکی کو کیوں بار بار دیکھ رہا تھا۔ اسے نگاہوں کے اس طواف پر کسی حد تک غصہ بھی آیا تھا۔

دانیان کی یادداشت میں وہ لمحہ بھی آ گیا تھا۔ جب آیت سنہری بالوں کا ریشم اپنی کمر پر پھیلائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ جل پری کی سنہری زلفیں اسے اپنا اسیر کر لیتیں۔ وہ تو دل کا پیالہ نفرت سے اس قدر بھرا تھا کہ اس میں محبت کی ذرا سی بھی جگہ نہ تھی۔ دانیان نے ایک نخوت بھری نگاہ اس سے جل پری (آیت) کے دلکش سراپے پر ڈالی تو اس خیال نے اندر ہی اندر زہر پھیلا دیا کہ نہ جانے کتنے مردوں کی نظروں نے اس وجود کو سراہا ہوگا۔ اس سوچ کے بعد دانیان نے دوسری نگاہ بھی اس پر نہ ڈالی تھی۔

وہ جل پری جیسی ہی تو تھی۔ جو اس کی زندگی میں آئی تھی۔ جس کو دیکھنے کا وہ بچپن سے ہی تمنائی تھا۔ وہ جل پری جسے اس نے ناراض کر دیا تھا۔ وہ روٹھ کر بہت دور چلی گئی تھی۔ بہت دور.....

☆☆☆

ارحم کی خواہش تھی کہ آیت دانیان سے خلع لے کر اپنے اس کاغذی بندھن کو پھاڑ کر پھینک دے۔ مگر آیت نے اس معاملے میں مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی ارحم، ہما اور مسز فرح انجم کو بھی پریشان کر رہی تھی۔

''دس ماہ بہت ہوتے ہیں کسی شخص کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے اور میرے خیال میں دانیان جیسے پست اور چھوٹی سوچ رکھنے والے شخص کے ساتھ ایک پل بھی گزارنا خود کو اذیت دینے کے سوا کچھ نہیں!''

ارحم تو دانیان پر سخت برہم تھا۔

ارحم نے برسوں آیت سے خاموش محبت کی تھی۔ ارحم ہمیشہ سے اس کی ہیروں جیسی چمکتی آنکھوں اور سنہری زلفوں کا اسیر تھا۔ آیت ایسی ہی تھی جسے چاہا جاتا۔ مگر ارحم کبھی حوصلہ نہیں کر پایا تھا۔

وہ آیت سے دو تین ماہ چھوٹا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر آیت کے سامنے کبھی اظہار کیا تو وہ ناراض نہ ہو جائے۔ مگر جب اچانک ہی اسے دانیان اور آیت کی شادی کی خبر ہوئی تو اس کا دل بری طرح سے ٹوٹ گیا تھا۔ مگر جب اس نے آیت کو دانیان کے شاندار بنگلے میں دیکھا تو اسے لگا کہ آیت کو تقدیر نے شہزادی بنا دیا تھا۔

اسے لگا وہ بھلا آیت کو کیا دے سکتا تھا۔ مگر وقت نے اب اسے قابل بنا دیا تھا کہ وہ آیت کا ساتھ مانگ سکتا تھا۔ وہ بس آیت کے فیصلے کا منتظر تھا تاکہ وہ بھی آیت کو اپنے جذبات سے آگاہ کرے۔ مگر دانیان کے حوالے سے آیت کی غیر معمولی خاموشی نے دونوں کے درمیان بلند و بالا فصیل کھڑی کر دی تھی جسے وہ چاہ کر بھی پار نہیں کر پا رہا تھا۔

''بس کل وکیل کے پاس چلو، ہم اس کے مشورے سے خلع کے کاغذات تیار کروائیں!'' ارحم کا لہجہ بہت سخت تھا۔

''نہیں ارحم.....!'' خلع کی بات پر آیت کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ ''میں دانیان سے خلع نہیں لینا چاہتی.....!''

''مگر کیوں آیت.....'' ارحم سراپا احتجاج تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔

''خلع اور طلاق کی بات تو تب کروں۔ جب مجھے کوئی اور ہم سفر چاہیے ہو۔ جب مجھے دوسری شادی کرنی ہو۔'' آیت کا لہجہ برف سے بھی زیادہ سرد تھا۔

''کیا مطلب؟'' ارحم بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ شاید وہ آیت کا فلسفۂ حیات پوری طرح سے سمجھ نہیں پایا تھا اس کی پیشانی پہ درجنوں بل ابھر آئے تھے۔

''مطلب یہ کہ میں دانیان سے کبھی طلاق نہیں لوں گی۔ اور اگر اس نے مجھے طلاق دے دی تو میں دوسری شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ کیونکہ.....'' آیت کی برف سی سرد آنکھوں سے ایک گرم آنسو نکلا۔ وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ ارحم کے دل نے اس آدھے ادھورے سے جملے کا مطلب سمجھ لیا تھا تب ہی دل پہ گھونسا سا لگا اور وہ لڑکھڑا سا گیا۔

''یہ غلط ہے آیت..... اس جیسے گھٹیا انسان سے.....!'' تقریباً چلا اٹھا تھا۔

''تمہیں دانیان کے حوالے سے جو کہنا ہے کہو۔ تمہارا حق ہے۔ دل میں برا جانو تو تمہاری مرضی مگر میرے معاملے کو ڈسکس نہ کرو۔ کیونکہ صرف ایک کاغذی تعلق ہی تو ہے جو ہمارے درمیان موجود ہے۔ ورنہ اس شخص نے کبھی میری پرواہ نہیں کی ہے.....!''

آیت کی آواز بھرا گئی تھی۔ ارحم کو لگا کہ اسے یہ آواز بہت دور سے آرہی ہے۔ اب دل نے صحیح معنوں میں تسلیم کرلیا تھا کہ آیت اس سے بہت دور جاچکی ہے۔ دانیان کی اتنی بدسلوکی کے باوجود بھی وہ آیت کے دل میں موجود تھا۔ یہ دانیان کی خوش نصیبی تھی اور ارحم کی بدنصیبی کہ وہ کبھی بھی آیت کے دل تک رسائی حاصل نہ کرسکے گا۔ آخر آیت کے دل میں ''اس'' کے لیے ''گنجائش'' کیوں تھی۔ ارحم نے لمحے بھر کے لیے سوچا تھا۔

''گنجائش..... محبت کا دوسرا نام ہے ارحم، انسان جس سے محبت کرتا ہے جسے وہ کھونا نہیں چاہتا۔ جس سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا۔ اس سے ناراضی اور گلے شکوے وقتی ہوتے ہیں۔'' آیت نے گویا ارحم کی سوچ پڑھ کر جواب دیا تھا۔

تو آیت اتنی تذلیل، اتنی نفرت اور حقارت کے باوجود بھی دانیان کے لیے دل میں گنجائش رکھتی تھی؟ وہ گنجائش جس کا دوسرا نام ''محبت'' ہے ارحم کے دل میں درد سا اٹھا تھا۔

آسمان یکبارگی سیاہ بادلوں سے بھر گیا تھا۔ بادل یوں گھر گھر کر آرہے تھے کہ اب برسے کہ تب۔ اور پھر رات بھر خوب دھواں دھار مینہ برسا تھا۔

جب صبح کا اجالا آسمان کی سیاہی کو چیرتے ہوئے باہر نکلا تو مطلع صاف ہوچکا تھا۔ ہر چیز دھل کر نکھر گئی تھی۔ ارحم کے درد دل کو بھی آرام آچکا تھا۔ وہ درد یک طرفہ تھا۔ جس سے آیت ناواقف تھی۔ اور شکر تھا کہ وہ ابھی تک ناواقف تھی۔ جس کے دل تک رسائی ممکن نہ ہو، وہاں جذبات کے اظہار کا بھی کیا فائدہ۔

ارحم نے ہمیشہ سوچا تھا کہ زندگی میں کبھی نہ کبھی آیت کے احسانوں کا بدلہ ضرور اتارے گا۔ اب وقت آگیا تھا وہ جانتا تھا کہ اپنی ''محسن'' کے احسانوں کا بدلہ کیسے اتارنا ہے۔ اس کے مضبوط قدموں کا رخ دانیان کے عظیم الشان بنگلے کی جانب تھا۔ وہ آیت کا وکیل بن کر اس کا مقدمہ لڑنے جارہا تھا۔ دل میں قوی امید تھی کہ جیت اسی کی ہوگی۔

☆☆☆

رات اپنے پر پھیلائے کھڑی تھی۔ سیاہ آسمان ننھے منے روشن چراغوں سے سج گیا تھا۔ دروازے پر دستک نے آیت کو چونکا یا تو بے اختیار نگاہ گھڑی کی جانب اٹھ گئی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ یہ ارحم کے آنے کا بھی وقت نہیں تھا اور نہ ہی نیلما اس وقت آتی تھی۔ مسز فرح انجم سے چند گھنٹوں پہلے اس کی بات ہوئی۔ انہوں نے آیت کو بتایا تھا کہ دانیان کم سے ملنا چاہتا ہے۔

''کہیں یہ ''ملاقاتی'' وہ تو نہیں!'' دل عجیب لے پر دھڑکا تھا۔

دوپٹہ سنبھالتے ہوئے وہ تیزی سے بیڈ سے اتری تھی۔

☆☆☆

''بہت ناراض ہونا؟'' بہت دیر بعد وہ بولا تھا۔

''ناراض ہونے کا کوئی حق تو مجھے کبھی نہیں ملا۔ ہاں البتہ!'' چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولی تھی۔

''انسان ہونے کے ناتے دکھ کا شکار ضرور ہوئی ہوں۔'' شفاف آنسو گال سے پھسلا تھا۔ آیت قدرے رخ موڑے کھڑی تھی۔ دانیان کو اس سفید مورتی کو دیکھ کر پہلی بار دکھ سا محسوس ہوا تھا۔ دل نے احساس دلایا تھا کہ ''جل پری'' کے دکھ کی وجہ دانیان کی وجہ ذات تھی۔

''آپ کا سلوک..... رویہ اپنی جگہ..... مگر مجھ پر اور ارحم پر اتنا گرا ہوا الزام تو نہ لگاتے۔ میرے لیے وہ عمر کی طرح ہے۔''

آیت کی زبان سے شکوہ نکلا بھی تو اس حوالے سے جس بارے میں عورت بہت حساس ہوتی ہے۔ دانیان نے ہمیشہ اسے نفرت دی تھی۔ اس نے گلہ نہ کیا۔ ہمیشہ اس کی تذلیل کی۔ وہ شکوہ زبان پر نہ لائی۔ اس نے بیوی ہونے کے باوجود آیت کو ہمیشہ

حقارت سے دیکھا۔ اس نے قسمت کا لکھا سمجھ کر ضبط کرلیا۔ دانیان نے عمر اور ہما کو بھی بے دردی سے پیٹا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ مگر کردار پر بات۔

دانیان مکمل خاموش تھا۔ آج وہ سب سننا چاہتا تھا۔ اور آیت وہ بھی شاید آج سب کہنا چاہتی تھی۔

دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ باہر کوئی سایہ دور ہوا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں ارحم تھا۔ وہ جو آیت سے محبت کرتا تھا۔ وہ جسے دانیان نے آیت کا عاشق قرار دیا تھا۔ وہ ارحم آیت کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز تھا۔ یہ ارحم ہی تھا جو دانیان کو یہاں تک لے کر آیا تھا۔ اس نے ہر بات پوری ایمان داری سے دانیان کو بتائی تھی۔ آیت نے کبھی بھی ارحم کو دانیان کی کمائی سے ایک روپیہ بھی نہیں دیا تھا۔

ارحم نے رفیق صاحب کے مکان کو بیچ کر اپنی ضروریات پوری کرنے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ آیت نے کبھی بھی دانیان کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ جبکہ دانیان بہت کھلے دل کا انسان تھا۔ بہت کچھ وہ غریب اور مستحق لوگوں کی امداد کے لیے کیا کرتا تھا۔ مگر آیت، عمر اور ہما کے معاملے میں نہ جانے کیوں اس کا دل تنگ ہوجاتا تھا۔ اس نے کبھی بھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی تھی کہ ان تینوں کو کوئی ضرورت تو نہیں۔

آیت بھی ارحم کو بے انتہا چاہتی تھی مگر اس کی محبت کا رنگ جدا تھا۔ اور ارحم کو آیت کی محبت کا ہر رنگ قبول تھا۔ وہ دل ہی دل میں شکر کررہا تھا کہ آیت کے سامنے اپنے جذبوں کا اظہار نہ کیا تھا خود کو بے وقعت نہ کیا تھا۔ ورنہ وہ آیت کی اس محبت سے بھی محروم ہوجاتا۔

دل کی بات کہہ کر آیت خاموش ہوگئی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ مگر دانیان کو بہت کچھ کہنا تھا۔ بہت سی باتوں کی وضاحت کرنا تھی۔

''میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا آیت!''

دانیان کے مخاطب کرنے پر آیت کو اپنا نام بہت اجنبی سا لگا تھا۔ کیونکہ دانیان نے ہمیشہ اسے لڑکی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''سنو لڑکی.....!'' جیسے دانیان کو اس کا نام لینا تک گوارا نہ تھا۔

''میں مانتا ہوں، میرا رویہ ہمیشہ سے تمہارے ساتھ اچھا نہ تھا۔ مگر یہ سلوک اور رویہ کس گود میں پلا آج اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں.....''

میری ماما پاپا ورکنگ وومن تھیں۔ وہ شادی سے پہلے بھی اپنی کمپنی چلا رہی تھیں اور شادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ ان عورتوں میں سے نہ تھیں جو شادی کے بعد شوہر اور بچوں میں گھر کر اپنی پہچان کھو دیتی ہیں۔ ابتدا میں تو میرے پاپا کو ان کے کام کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر دھیرے دھیرے... اعتراض ہونے لگا۔

اس کی وجہ دانش سکندر تھا۔

کہانی کچھ یوں تھی۔

وہ مختلف بزنس پروجیکٹس میں ماما کا بزنس پارٹنر تو ان کی دوستی گہری ہونے لگی۔ دن بہ دن گہری ہو دوستی کا اثر سلمیٰ اور جمال کے گھریلو معاملات پر ہونے تو بہت سے معاملات بگاڑ کا شکار ہوگئے۔

''یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی تعلق توازن کھو ہے تو اس کا اثر گردوپیش پر پڑنے لگتا ہے۔ اور اگر یہ منفی نوعیت کا ہو تو بگاڑ بھی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔''

دانش سکندر اور سلمیٰ کا تعلق توازن کھونے لگا وہ بہت سا وقت ساتھ گزارنے لگے اکثر غیر ملکی بزنس ٹورز میں بھی وہ دونوں ساتھ ہوتے۔ اس ''ساتھ'' دنیا اپنی نظر سے دیکھنے لگی۔

''ضروری نہیں کہ دنیا ہمیشہ ہی غلط نظر سے دیکھ ہو۔ بہت دفعہ دنیا جو دیکھ رہی ہوتی ہے۔ ٹھیک دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اس کے اندازے درست ہوتے ہیں۔

اور دانش سکندر اور سلمیٰ کے معاملے میں دنیا سوچ غلط نہ تھی۔

وہ دونوں بہت قریب آچکے تھے۔ اور آخر حقیقت دانیان کے پاپا پر یہ آشکار ہوئی تو ان پرسکون زندگی میں طوفان برپا ہوگیا۔ شروع میں انہوں نے اس دوستی کو روکنے کے لیے مثبت طریقے اختیار کیے۔ مگر وہ زیادہ سود مند ثابت نہ ہوئے۔ پھ

انہوں نے سلمٰی پر پابندی لگادی کہ بزنس کے معاملات چھوڑ کر مکمل طور پر گھر پر توجہ دی جائے۔ مگر سلمٰی تو شوہر سے اس حد تک متنفر ہو چکی تھیں کہ انہوں نے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ ممکن تھا کہ یہ آشیانہ تنکا تنکا بکھر جاتا اگر اس وقت ننھی الوینہ کی آمد نہ ہوتی۔

''بچپن کے وہ سات سال کس قدر تکلیف دہ اور اذیت ناک تھے۔ میں الفاظ میں بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتا آیت.....'' رنجیدگی نے دانیان کے چہرے کو مزید سنجیدہ کر دیا تھا۔

''اگر کسی بچے کا باپ غلط راستوں پر چل پڑے تو اس بچے کو ماں کا سہارا ہوتا ہے۔ لیکن اگر غلط راستوں پر چلنے والی ماں ہے تو وہ بچہ اندر ہی اندر ٹوٹ جاتا ہے۔ بکھر جاتا ہے۔''

جب یہ حادثہ میری زندگی میں رونما ہوا تو میں دس سال کا تھا۔ اس وقت ایشمل بہت چھوٹی تھی۔ میں اپنا دکھ اپنی بہن سے شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ میں تنہا تھا۔ اپنی الجھن میں، بالکل تنہا۔ میں خوف زدہ تھا کہ ماں مجھے چھوڑ کر نہ چلی جائے۔

''بابا کی کوششوں کی وجہ سے ہمارا آشیانہ تو بکھرنے سے بچ گیا۔ مگر میری سوچ ورکنگ وومن کے بارے میں انتہائی سخت اور خراب ہوگئی۔''

دراصل دانیان کے کچے ذہن میں ایک ہی بات بیٹھ گئی تھی کہ جو عورتیں باہر نکل کر کام کرتی ہیں وہ اچھی نہیں ہوتیں۔ ان کے کردار مضبوط نہیں ہوتے۔ اسی سوچ کے تحت دانیان نے آیت کو پہلے روز سے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا۔ کیوں کہ وہ بھی ملازمت پیشہ تھی، حسین تھی۔ دانیان کو اس کے معصوم اور حسین چہرے کے پیچھے انتہائی غلیظ چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ جو مردوں کو اپنے جال میں پھنسانی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے آیت کو کبھی دل طور پر قبول نہ کیا تھا۔

آیت کے جانے کے بعد اس کی یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی تھی کہ اب زندگی پر سکون ہو جائے گی۔

نتاشا نے اسے بیچ راہ میں چھوڑ دیا تھا۔ نتاشا کی محبت وقتی اور کھوکھلی تھی۔ دانیان کو نتاشا سے محبت

الف لیلہ ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب-/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ-/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

تھی مگر نتاشا نہ تو اس کا گھر سنبھالنے کی روادار تھی اور نہ ہی اس کی بہنوں کو محبت دینے کی۔

''میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا آیت۔ فیصلے کا حق تمہارے پاس ہے اگر تمہارا دل میرے حق میں گواہی دے تو ٹھیک ہے ورنہ تم جو بھی فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہوگا.....''

اب جو بھی فیصلہ کرنا تھا، آیت کو کرنا تھا کہ زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے قدم آگے بڑھائے یا پھر پیچھے کی طرف..... اگر قدم آگے بڑھاتی تو کوئی مضبوط سہارا نہ تھا۔ اور اگر قدموں کو پیچھے موڑتی ہے تو دانیان کے ساتھ اس کی بھی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ تذلیل وہ نفرت جس نے اسے پل پل رلایا تھا۔ یہ سب بھی بہت کٹھن تھا اتنا آسان نہیں تھا۔ سب بھول جانا۔ اور دانیان نے تو اسے کبھی محبت بھی نہیں دی تھی جس کے سہارے وہ اس کی زیادتیوں کو بھول جاتی۔

مگر وہ ایک ''عورت'' تھی جس کے خمیر میں محبت تھی۔ سمجھوتا تھا۔ جس کی سرشت میں ''درگزر'' کرنا تھا۔ جس کی فطرت میں ہر تلخی اور کڑواہٹ کو بھول جانا تھا۔

''قدم آگے بڑھا کر تنہا سفر کرنے سے بہتر ہے کہ پیچھے موڑ لو۔ کوئی منتظر ہے تمہارا.....!''

مسز فرح انجم کی بات نے گویا اندھیرے میں ڈگمگاتی آیت کے ہاتھ میں کوئی جگنو تھما دیا تھا۔

☆☆☆

''آؤٹ ..... آؤٹ..... یہ فاؤل ہے آیت آپی.....!'' لان میں کرکٹ میچ جاری تھا ایشمل اور عمر کے پرزور احتجاج نے دانیان کی توجہ بھی اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ جو قدرے فاصلے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا آج اتوار تھا۔ سو چھٹی کے دن کو انجوائے کیا جا رہا تھا۔

ایشمل اور عمر ایک گروپ میں تھے اور ہما اور الوینہ دوسرے گروپ میں تھیں۔ جس کا ساتھ آیت دے رہی تھی۔ ایشمل اور عمر کے مطابق آیت نے الوینہ کو جتوانے کے لیے ''فاؤل'' کھیلا تھا۔ الوینہ چھوٹی تھی اور بیماری کی وجہ سے بے حد کمزور ہوگئی تھی سو وہ ٹھیک سے کھیل بھی نہیں پا رہی تھی۔ مگر سب کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی سو آیت اسے فل سپورٹ کر رہی تھی۔

''آپی یہ ''روندی'' ہے۔'' عمر چلایا۔

''کوئی روندی وندی نہیں ہے۔ الوینہ ابھی آؤٹ نہیں ہوئی۔'' ہنسی کو بمشکل گلابی ہونٹوں تلے دباتے آیت نے سب کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے سچ مچ ''فل روندی'' ماری تھی۔ اس بار ہما بھی گڑبڑا گئی تھی مگر آیت ہنوز انکاری تھی۔

دراز، سنہری بالوں والی وہ حسین جل پری آج کتنے دنوں بعد مسکرائی تھی۔ اس مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر گویا خوشی کی قوس قزح بکھیر دی تھی۔ دانیان کی آنکھوں کو یہ مسکراتا چہرہ بہت بھلا لگا تھا۔ آیت نے تلخیوں کو بھلاتے ہوئے نئی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ دانیان اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا۔ اس کا شوہر تھا۔ اور عورت اپنے گھر اور اپنی محبت کے ساتھ سدا وفادار رہتی ہے۔

ہاں ایسے دانیان سے ہی نہیں۔ ایشمل اور الوینہ سے بھی محبت تھی۔ جو آیت کو لینے آئی تھیں۔ وہ دونوں زندگی میں مزید تنہا نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ ہما اور عمر کی صورت میں اچھے دوست بھی مل گئے تھے۔ واپسی کے سفر کو سہل بنانے میں ارحم اور نیلما کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ لیکن دانیان اور آیت کے درمیان دوریاں اور فاصلے برقرار تھے دانیان کی ذات سے آیت کو سدا اجنبیت ملی تھی سو آیت کو مانوس ہونے کے لیے کچھ وقت درکار تھا جو دانیان نے اسے دے دیا تھا۔

''مجھے یقین ہے۔ میں ایک روز اپنی روٹھی ہوئی جل پری کو منا لوں گا!'' ان سب کے درمیان آیت کی ''روندی'' سے محظوظ ہوتے ہوئے دانیان نے پہلی بار آیت کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

سوچ کا پرندہ تیزی سے اڑتا ہوا نیلے سمندر کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ وہ نیلا سمندر جس میں سرمئی چٹانی پتھر پہ خوب صورت سنہرے بالوں والی جل پری بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

☆☆

شکیلہ جمال طارق

پچھتاوا

''او بھئی شہناز! جلدی کر ناشتہ لے بھی آ۔ رات تجھے بتایا بھی تھا کھیتوں پر صبح مجھے جلدی پہنچنا ہے۔ سوکت نے پھر پانی کا رولا ڈالا ہوا ہے۔''

کرامت اللہ نے ماں کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بیوی کو آواز لگائی۔ فرمانبردار شہناز بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی تھی۔ دیسی گھی سی چیڑی روٹیاں، تازہ مکھن سے بھرا پیالہ، دہی کا کٹورا اور جھاگ اڑاتی لسی کا بڑا سا گلاس، اس نے کرامت اللہ کے سامنے رکھ دیا۔ کرامت اللہ بسم اللہ پڑھ کر شروع ہو گیا۔

''واہ بھئی شہناز! بڑا سواد رکھا ہے رب سوہنے نے تیرے ہاتھ میں۔ قسم سے مزہ آ گیا۔''

بڑی سی ڈکار لیتے کرامت اللہ نے ''شکر الحمد للہ'' پڑھتے بیوی کو سراہا۔ شہناز اس تعریف پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شفاف ندی کے پانی جیسی ہنسی، پاکیزہ اور من کو اندر تک سیراب کرتی۔

''لے اب تجھے دیر نہیں ہو رہی؟ بیوی کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول کرنے بیٹھ گیا ہے۔''

ماں نے ٹوکا تو کرامت اللہ نے ساتھ والی چارپائی پر سوئے اپنے چار سالہ بیٹے علی حسن کی پیشانی پر بوسہ لیا اور جلدی سے صافہ کندھے پر رکھتا ڈیوڑھی کی جانب بڑھ گیا۔

''اماں جی! آپ کے لیے ناشتہ لے آؤں؟

''ہاں بھئی! زحمت نہ ہو تو مجھ بڑھیا کو بھی کچھ کھانے کو لا دو۔''

''ارے واہ! زحمت کیسی اماں جی! آپ کی خدمت تو فرض ہے مجھ پر۔ اگر کوئی کمی بیشی ہو جائے تو سو بار پیشگی معافی.....'' کانوں کو چھوتے ہوئے شہناز نے حسب عادت کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

''سخت ڈھیٹ لگتی ہے۔ تیری یہ ہر وقت کھی کھی کرنے والی عادت۔''

''اس ماں کی عادت جو ٹھہری سر کے ساتھ ہی جائے گی۔''

ساس نے سامنے رکھا پراٹھا، بالائی کا پیالہ اور بھاپ اڑاتا دودھ پتی کا کپ رکھتے ہوئے بمشکل اپنی ہنسی پر بند ھا اور مڑ کر علی حسن کو اٹھانے لگی۔

''چل اٹھ جا میرا پتر۔ شاباش! دادی کے ساتھ ناشتہ نہیں کرے گا کیا؟''

علی حسن کو اٹھا کر زبردستی منہ ہاتھ دھلایا اور دادی کے ساتھ چارپائی پر بٹھا دیا۔

''مجھے نہیں کھانا مکھن ملائی کے ساتھ پراٹھا۔''

علی حسن نے منہ بسورا۔

''اچھا تو پھر تیری مرغی نے کل جو انڈہ دیا تھا وہ تل دوں؟ اوپر نمک، کالی مرچ بھی چھڑک دوں گی۔'' اس نے اسے لالچ دیا۔

''نہ۔'' علی حسن نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

''دیکھ علی حسن! اگر تو نے شرافت سے ناشتہ نہ کیا تو میں تجھے شہر تیری نانو خالہ کے پاس نہیں لے کر جاؤں گی۔ جانتے ہو اتنی لمبی بس میں جائیں گے ہم جو سارا راستہ یوں یاں کرتی جائے گی۔''

علی حسن کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ سچ ''اماں؟''

ساری سستی، جمائیاں ہوا ہو گئیں۔ رغبت سے دادی کے ساتھ ناشتہ کرنے لگا۔ شہناز کے مطمئن چہرے پر ہنسی مکئی کے پکے ہوئے سنہری بھٹے کی طرح چمکنے لگی تھی۔ وہ مڑی۔ پیچھے سے ماں جی با آواز بلند بڑبڑاتی رہیں۔

''ہونہہ! بس نہ ہوئی باوا کی ریل گاڑی ہو گئی۔ پوں..... یاں.....''

☆☆☆

شہناز نے دستی پمپ چلا کر بالٹی لبالب پانی سے بھری اور کچے صحن میں چھڑکاؤ کرنے لگی۔ تپتی، جلتی زمین کو جیسے قرار آ گیا۔ ہر سو مٹی کی سوندھی مہک پھیل گئی۔

''اے ہے شہناز! کتنی واری تجھے کہا ہے پانی کا ضیاع نہ کیا کر، پر تو ہے کہ سنتی ہی نہیں۔''

ماں کی چھڑی چھاؤں تلے چارپائی پر تکیے کے سہارے نیم دراز اونگھتی ماں جی ایکدم سیدھی ہو بیٹھی تھیں۔

''اماں جی! دھول مٹی اڑتی ہے۔ آپ کا دمہ نہ بگڑ جائے، اس لیے جھاڑو پھیرنے سے پہلے چھڑکاؤ کرتی ہوں۔ اللہ نہ کرے اس دن کی طرح آپ کا پھر سیاہ اکھڑ گیا تو میں کیا کروں گی۔'' شہناز نے اب لمبی سی جھاڑو اٹھا کر صحن میں لگانا شروع کر دی۔

''جو جی میں آئے کر۔ تو بھلا سنتی ہے کسی کی۔''

ماں جی نے بڑبڑا کر پھر سے تکیے سے ٹیک لگا لی۔

''آپ کی نہیں سنوں گی تو اور بھلا کس کی سنوں گی؟ بس آپ بولتی رہا کریں بھلے سے مجھے گالیاں دیں آپ کے بولنے، آپ کے ہونے سے ہی تو برکت ہے اس گھر میں۔''

وہ اب ڈھیر سارے خشک پتے اکٹھے کر کے کچرے والی بالٹی میں ڈال رہی تھی۔

PakistaniPoint

''ہاں ہاں باؤلے کتے نے جو کاٹ لیا ہے خوانخواہ میں تجھے گالیاں دوں گی۔'' چمک کر کہتی وہ پھر سے اٹھ بیٹھیں۔

''اوئے علی حسن! تو کہاں بھاگتا پھر رہا ہے اسکول نہیں جانا کیا؟''

نل کے نیچے ہاتھ دھو کر دوپٹے کے پلو سے خشک کرتی شہناز نے پاس سے گزرتے علی حسن کا بازو دبوچا۔

''میں نے نہیں جانا اسکول استاد جی ڈنڈا مارتا ہے۔''

''چل جھوٹا! استاد جی بھلا تجھے کیوں مارے گا؟ وہ تو اتنے پیار سے پڑھاتا ہے۔''

''اچھا آج چھٹی کرنے دے اماں! کل جاؤں گا۔'' علی حسن نے بازو چھڑوانے کی کوشش کی۔

''ناں۔ میں کہہ رہی ہوں اگر آج تو اسکول نہیں گیا تو میں تجھے شہرنا جو خالہ کے ہاں نہیں لے کر جاؤں گی۔ پتا ہے وہاں ہم بریانی والے چاول کھائیں گے۔ ٹھنڈی ٹھار بوتل پئیں گے اور نا جو خالہ ڈبی والی قلفی بھی کھلائے گی۔''

علی حسن کو ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ اسے گدگداتے ہوئے شہناز کی قل قل کرلی ہنسی پھر سے گونجنے لگی تھی۔

''لو خوانخواہ میں۔ یہاں میرا پوتا کون سا اچھا کھانے پینے کو ترس رہا ہے۔''

ماں جی نے اب کی بار زور سے اپنا سر تکیے پر پٹخ کر زبردستی آنکھیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

شام کو کرامت اللہ نے ڈھیر سارے سفید موتیے کے پھول اس کی جھولی میں ڈال دیے۔ اس کا معمول تھا شام کو کھیتوں سے واپس آتے ہوئے روز شہناز کے لیے موتیے کے پھول لازمی لے کر آتا۔ شہناز سوئی کی مدد سے ان پھولوں کو دھاگے میں پرو کر کان میں پہنی سونے کی بالیوں کے گرد باندھ لیتی۔ پھولوں کے اس زیور سے اٹھتی مہک سے اس کے چہرے کی مسکراہٹ میں کرامت اللہ کی محبت رچ سی جاتی۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے صحن میں چارپائیاں بچھا کر فرشی پنکھا چلا دیا۔

آگے والی چارپائی پر ماں جی نیم دراز تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ والی پر شہناز کے بازو پر سر رکھے علی حسن اپنی دن بھر کی جانے والی کارستانیاں سنا رہا تھا۔ آخری چارپائی خالی تھی۔ کرامت اللہ باہر اپنے دوستوں کے ساتھ چائے پینے گیا ہوا تھا۔

صحن میں جلتا زرد بلب ایک دم بجھ گیا۔

''کم بخت پھر چلی گئی۔'' ماں جی اپنے سرہانے رکھا دستی پنکھا اٹھا کر جھلنے لگیں۔ کھجور کے پتوں سے بنا رنگ برنگا پنکھا ہاتھ لمبا کر کے یوں گھماتیں کہ ہوا کا جھونکا ساتھ والی چارپائی پر لیٹے علی حسن تک بھی جاتا۔

''کب آئے گی بجلی؟'' علی حسن نے بے زاری سے پنکھے کے ساکت پروں کو گھورا۔

''سو تک تارے گنو۔ دیکھنا جیسے ہی تمہاری گنتی پوری ہوگی بجلی آجائے گی۔'' ماں کے کہنے پر اس نے آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھا اور ایک ایک کر کے گننے لگا۔ گنتی پوری ہوگئی۔ بجلی نہ آئی۔ علی حسن نے خفگی سے ماں کو دیکھا۔

''اچھا سن تو، جب ہم شہر تمہاری نا جو خالہ کے پاس جائیں گے تو وہ ہمیں بازار لے کر جائے گی۔ کہہ رہی تھی خوب ساری چیزیں دلاؤں گی علی حسن کو۔ چڑیا گھر بھی چلیں گے۔''

''وہاں ہاتھی بھی ہوگا؟'' علی حسن کی ساری بے زاری اڑنچھو ہوگئی۔

ہاتھی، زرافے سب ہوں گے۔''

''جھولے بھی؟''

''لو پاگل! وہ تو پارک میں ہوتے ہیں۔''

''تو ہم پارک نہیں جائیں گے کیا؟''

''جائیں گے کیوں نہیں جائیں گے۔''

''پر کب اماں؟''

نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں بمشکل کھولے ماں کا چہرہ دیکھا اور جواب سننے سے پہلے ہی نیند کی

آغوش میں چلا گیا۔

''اے شہناز! تو کیا سچ میں اپنی بہن کے ہاں شہر جانے کا سوچ رہی ہے؟''

ناک بھوں چڑھاتے ماں بیٹے کی باتیں سنتی ماں جی نے کروٹ لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کہاں ماں جی۔ ایسے ہی بس اسے ''لارے'' (امید) لگاتی رہتی ہوں۔ آپ نے دیکھا تو ہے شہر جانے کا سن کر فوراً کہنا مان جاتا ہے۔''

علی حسن کے ماتھے پر بکھرے بال سنوارتی وہ مسکراتی تھی۔ ستاروں کے جھرمٹ میں گھرے چاند نے گویا اس کی مسکراہٹ سے روشنی مستعار لی تھی۔ ماں جی ہنکارہ بھرتیں کروٹ بدل گئیں۔

☆☆☆

''چوڑیاں چڑھوالو.....'' دروازہ کھلا تھا۔ چوڑیاں بیچنے والی سر پر بڑا سا ٹوکرا اٹھائے اندر آ گئی۔

''نہیں بھئی نہیں پہننی چوڑیاں تم جاؤ۔''

ماں جی نے فوراً اسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

''ٹھہرو ماسی!''

کمرے میں پیٹی پر چڑھ کر چھت کے جالے اتارتی شہناز جست لگا کر نیچے اتری تھی۔

''دکھاؤ تو سہی کیسی چوڑیاں لائی ہو۔'' اس نے اشتیاق سے پورا ٹوکرا کھول دیا۔

''یہ لال اور ہری والی چڑھا دو۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا اور پہلے سے پہنی ہوئی چوڑیاں اتروانے لگی۔

''انہیں توڑ دو بی بی، ایسے اتارتے ہوئے درد ہو رہا ہے تمہیں۔'' شہناز کے چہرے پر ابھرتے درد کے آثار دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیا۔

''نہیں ماسی! انہیں ایسے ہی اتار دو۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دیکھ کر میرا دل بہت دکھتا ہے۔ خدا نہ کرے جو کبھی میری کلائی کی چوڑیاں ٹوٹیں.....''

''بہت محبت کرتی ہو اپنے گھر والے سے؟''

''ہاں، اس سے محبت ہی تو ہے کہ اس کا گھر، اس کی ماں، اس کی ایک ایک چیز سے محبت ہے۔''

لال اور ہری چوڑیاں کھنکھناتے ہوئے وہ کھلکھلائی تھی۔ قدرے فاصلے پر برآمدے میں بیٹھا سارا منظر ناگواری سے دیکھتی ماں جی تک اس کی چوڑیوں کی کھنک، ہنسی کی جھنکار اور باتیں بخوبی پہنچ رہی تھیں۔

☆☆☆

علی حسن کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

ماں تو اسے ''لارے'' ہی دیتی آ رہی تھی۔ لیکن شہر سے جو خالہ کا سچ میں بلاوا آ گیا۔ اس نے ایک اچھے علاقے میں اپنا ذاتی گھر خرید لیا تھا۔ اور اپنے نئے گھر میں دعوت رکھی تھی۔ جس میں اپنے تمام قریبی عزیزوں کو مدعو کیا تھا۔ شہناز کو بھی بے حد اصرار سے بلایا ناجیہ اس سے دو سال بڑی تھی۔ بھائی کوئی تھا نہیں۔ ماں باپ بھی کچھ عرصے پہلے وفات پا گئے۔ دونوں اسی گاؤں میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھیں۔ ناجیہ بیاہ کر شہر چلی گئی جبکہ شہناز کا نصیب اپنے اسی گاؤں میں لکھا تھا وہ یہیں رہ گئی۔

شادی کے بعد نا جو تو چند ایک بار اس سے ملنے گاؤں آئی۔ لیکن شہناز ایک بار بھی بہن کے ہاں نہ جا سکی۔

اب جو اس نے اتنے اصرار سے بلایا تو اس سے رہا نہیں گیا۔ کرامت اللہ تو تھا ہی اس کی خوشی میں خوش ہونے والا۔ فوراً دونوں کے شہر جانے والی بس کے ٹکٹ کٹوا لایا۔

''تم نہیں چلو گے ہمارے ساتھ؟''

''جانتی تو ہو۔ میں چلا گیا تو پیچھے زمینوں کا سارا کام کون سنبھالے گا؟'' کرامت اللہ کو اسے ''نہ'' کہنا ہمیشہ مشکل لگا کرتا تھا۔ اور وہ اتنی فرماں بردار تھی شوہر کے منہ سے کبھی کبھار نکلنے والی ''نہ'' کو بغیر کسی حجت کے قبول کر لیتی۔

ماں جی کا منہ بنا ہوا تھا۔ ناگواری چہرے پر سجائے اسے تیاری کرتے دیکھتی رہیں۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔

''بہن سے ملنے کی خوشی ایک طرف ماں جی! آپ کو، اپنے گھر کو چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ بی حاجن سے کہا ہے میرے پیچھے آپ کا بہت سارا خیال رکھے گی۔''

ماں جی نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا شہناز خود

ہی بولتی رہی۔ جانے سے پہلے کہا۔

''میں جانتی ہوں آپ خوش نہیں ہیں۔ لیکن جاتے وقت ''خیر سے جاؤ خیر سے آؤ'' کی دعا ہی دے دیں ماں جی!''

نجانے کیوں یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں اور آواز بھر آگئی تھی۔ ماں جی کے لب باہم پیوست رہے وہ زبردستی ان کے گلے لگ گئی۔

☆☆☆

کرامت اللہ ان کا بہت تابع دار بیٹا تھا۔ ان کی کل جمع پونجی۔ جسے اپنے خون پسینے سے سینچ کر انہوں نے جوان کیا تھا۔ شادی کے دو سال بعد ہی شوہر کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیوگی کی کڑی دھوپ میں کرامت اللہ کا وجود ہی ان کے آج اور آنے والے کل کی چھاؤں تھا۔ ماہ وسال نے رفتار پکڑی۔ ان کے دل میں اپنے کڑیل جوان بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان جاگا۔ بیٹے نے چپکے سے اپنے دل کی خواہش بتادی۔ وہ جو اپنی پسند سے بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے کے لیے پورا گاؤں چھان لینے کا ارادہ باندھ رہی تھیں چپ کی چپ رہ گئیں۔

''میں نے آپ کو صرف اپنی خواہش بتائی ہے ماں جی! باقی آپ اگر کسی اور کو بیاہ کر لانا چاہتی ہیں تو وہ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں۔''

ماں نے سوچا میرا مان جوٹوٹا سوٹوٹا۔ کیوں نہ بیٹے کی خواہش کا ہی مان رکھ لیا جائے۔ خواہ بجھے دل سے ہی سہی۔ دل کا شکوہ زبان پر لائے بنا وہ شہناز کو دلہن بنا کر لے آئیں۔ جس نے تھوڑے ہی عرصے میں ان کے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ لیکن وہ ان کے بیٹے کی پسند تھی۔ وہ کیسے اس کو اپنی پسند بنا لیتیں؟

☆☆☆

اور آج وہ شہناز کیا گئی انہیں روشن دوپہر پر زرد شام کا گماں ہوا۔ دل کو جکڑتی اداسی..... کاموں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے قدموں کی چاپ سننے سے آج ان کی سماعتیں محروم تھیں۔ ہنڈیا میں ڈوئی گھمانے سے باورچی خانے کے باہر تک آج چوڑیوں کی کھنک نہیں گونجی تھی اور اس کی بات بات پر شگوفے کی مانند پھوٹتی ہنسی۔

''کم بخت پہلی بار کہیں گئی ہے اس لیے دماغ سے اتر نہیں رہی۔ اور میرا علی حسن.....'' ان کا ذہن پوتے کی طرف چلا گیا۔

''چلو دو چار دنوں کی تو بات ہے آجائیں گے تو پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔''

افق کے پار صرف سورج نہیں ڈوب رہا تھا۔ کچھ اور بھی تھا جو آہستہ آہستہ ڈوبا جا رہا تھا۔

شاید ان کا دل..... تب ہی زوردار آواز کے ساتھ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا تھا۔

''ماں جی ہم برباد ہو گئے..... ہمارا کچھ بھی نہیں بچا.....'' کرامت اللہ بین کرتا گھر آیا تھا۔

''کیا ہوا کرامت اللہ؟ کسی نے گندم کے گودام میں آگ لگا دی؟''

''گودام بھرے رہیں گے ماں جی! مگر جانے والے لوٹ کر نہیں آئیں گے اب

شہر جانے والی بس کو حادثہ پیش آگیا تھا۔ ٹرالر سے بہت زوردار ٹکر لگی تھی۔ بس الٹ گئی۔ موقع پر جاں بحق ہونے والے مسافروں میں شہناز اور علی حسن بھی تھے۔''

وہ اونچا لمبا مرد ماں کی گود میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ماں جی وحشت زدہ سی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دیوانہ وار اندر کمرے کی طرف بھاگی تھیں۔

اندر کچھ نہیں تھا۔ نہ شہناز نہ اس کی قل قل کرتی ہنسی۔ یا شاید ہر جگہ وہ ہی تھی۔

''جاتے وقت خیر سے جاؤ، خیر سے آؤں کی دعا ہی دے دیں ماں جی!'' اور ماں جی زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

☆

اس ماہ دسمبر میں

اس ماہ دسمبر میں
نئی رُتوں کے پیمبر میں
شاید کہ وہ لوٹ آئے
بچھڑا تھا جو
پچھلے نومبر میں
اس ماہ دسمبر میں
کب سے خود کو کھو بیٹھے ہیں
کچھ اپنی ذات کی
بھول بھلیوں میں
کچھ اُس کی یاد کے سمندر میں!
اس ماہ دسمبر میں
شاید کہ وہ لوٹ آئے!
شاید کہ وہ لوٹ آئے!

حمیرا شفیع

اُلٹ تعبیر ہوتے جا رہے ہیں
سو بے توقیر ہوتے جا رہے ہیں

گھروں کے خواب تھے سب کے دلوں میں
مکاں تعمیر ہوتے جا رہے ہیں

بسایا اس طرح سے اپنا آنگن
کہ خود ہی بے گھر ہوتے جا رہے ہیں

کبھی جو جان تھے ہر داستاں کی
پسِ تحریر ہوتے جا رہے ہیں

مری سانسوں کی تھے جو دسترس میں
وہ جوئے شیر ہوتے جا رہے ہیں

بہت محفوظ جو سمجھے تھے قلعے
وہ اب تسخیر ہوتے جا رہے ہیں

ترے جو شعر ابرکؔ قہقہے تھے
بڑے دلگیر ہوتے جا رہے ہیں

ابرکؔ

وہ کون ہیں جو غم کا مزہ جانتے نہیں
بس دوسروں کے درد کو پہچانتے نہیں

اس جبرِ مصلحت سے تو رُسوائیاں بھلی
جیسے کہ ہم اُنہیں وہ ہمیں جانتے نہیں

کم بخت آنکھ اُٹھی نہ کبھی اُن کے رُوبرو
ہم اُن کو جانتے تو ہیں، پہچانتے نہیں

واعظ خلوص ہے ترے اندازِ فکر میں
ہم تیری گفتگو کا بُرا مانتے نہیں

حد سے بڑھے تو علم بھی ہے جہل دوستو
سب کچھ جو جانتے ہیں، وہ کچھ جانتے نہیں

رہتے ہیں عافیت سے وہی لوگ اے خمارؔ
جو زندگی میں دل کا کہا مانتے نہیں

خمارؔ بارہ بنکوی

قفس میں جیسے چمن کی ہوا نہیں لگتی
خدا نہ چاہے تو کوئی دُعا نہیں لگتی

خیالِ یار سے خالی دکھائی دیتی ہے
یہ بندگی مجھے عقدہ کشا نہیں لگتی

میں سُن رہا ہوں سب ہی کو الگ الگ لیکن
کوئی صدا مجھے تیری صدا نہیں لگتی

وہ سانس ہو کہ ہو وہ آس، دونوں بیگانی
یہ زندگی تجھے کیا اک سزا نہیں لگتی؟

جو باخبر ہے وہ غافل ہے میرے دُکھ سے ظفرؔ
یہ بات سچ تجھے لگتی ہے یا نہیں لگتی

صابر ظفرؔ

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے۔ ام المومنین ام سلمہؓ نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے جو زہریلی بکری کا گوشت کھایا تھا، اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر سال تکلیف ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے اس وجہ سے جو مصیبت پہنچی ہے، وہ تو اس وقت میری تقدیر میں لکھی جا چکی تھی۔ جب آدم علیہ السلام ابھی مٹی (کی شکل) میں تھے۔"

معاف کرنا،

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ السلام سے فرمایا۔

"میں نے تیرا درجہ اور نام اس بنا پر بلند کیا کہ تُو نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا۔"

ایک حدیث میں وارد ہے کہ "اگر تُو اپنے بھائیوں کی غلطی اور خطا کو معاف کر دے گا تو تیری عزت و بزرگی میں اضافہ ہو گا۔"

اللہ کے رسولؐ سے محبت،

حضرت جعفر بن محمد اپنے والد حضرت محمد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے جوڑے آئے جو انہوں نے لوگوں کو پہنا دیے۔ شام کو لوگ وہ جوڑے پہن کر آئے۔

لوگ ان کے پاس آ کر ان کو سلام کرتے اور ان کو دعائیں دیتے۔ اتنے میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی والدہ حضرت فاطمہؓ کے گھر سے نکلے اور لوگوں کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ان کے جسم پر ان جوڑوں میں سے کوئی جوڑا نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر آپ غمگین اور پریشان ہو گئے۔ اور آپ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور فرمایا۔

"اللہ کی قسم! تم لوگوں کو جوڑے پہنا کر مجھے خوشی نہیں ہوئی (کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کو تو پہنا نہیں سکا۔)"

لوگوں نے عرض کیا۔ "اے امیر المومنین! آپ نے اپنی رعایا کو جوڑے پہنا کر اچھا کیا ہے۔"

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "میں اس وجہ سے پریشان ہوں کہ ان دونوں لڑکوں کے پاس ان جوڑوں میں سے کوئی جوڑا نہیں ہے۔ یہ جوڑے ان دونوں سے بڑے ہیں (اس وجہ سے ان کو جوڑے نہیں دیے تھے۔)

پھر انہوں نے یمن کے گورنر کو خط لکھا کہ "حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لیے جلدی سے دو جوڑے بھیجو۔"

چنانچہ انہوں نے دو جوڑے بھیجے تو حضرت عمرؓ نے ان دونوں حضرات کو پہنا دیے۔

درجہ،

حضرت اصبغ بن نباتہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

"اے امیر المومنین! مجھے آپ سے ایک کام ہے جسے میں آپ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے اللہ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ اگر آپ میرا وہ کام کر دیں گے تو میں اللہ کی بھی تعریف کروں گا اور آپ کا بھی شکریہ ادا کروں گا۔ اور اگر آپ نے وہ کام نہ کیا تو بھی میں اللہ کی تعریف کروں گا اور آپ کو معذور سمجھوں گا کہ یہ

کام آپ کے بس میں نہیں ہے۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا "تم اپنا کام زمین پر لکھ کر مجھے بتا دو کیونکہ زبان سے مانگنے کی ذلت میں تمہارے چہرے پر دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

چنانچہ اس نے زمین پر لکھا۔

"میں ضرورت مند ہوں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ایک جوڑا میرے پاس لاؤ۔"

چنانچہ وہ جوڑا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آدمی کو دے دیا۔ اس آدمی نے وہ جوڑا لے کر پہن لیا پھر اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعریف میں یہ اشعار پڑھے۔

ترجمہ:

"آپ نے تو مجھے ایک ایسا جوڑا پہنایا ہے جس کی خوبیاں پرانی ہو کر ختم ہو جائیں گی۔ اور میں آپ کو عمدہ تعریف کے ایسے جوڑے پہناؤں گا جن کی خوبیاں ختم نہ ہوں گی۔

تعریف، تعریف والے کے تذکرے کو اس طرح زندہ رکھتی ہے جس طرح بارش کی تری میدانی اور پہاڑی علاقوں کو زندہ کرتی ہے۔

جس خیر کے کام کی اللہ تمہیں توفیق دے، تم زندگی بھر اسے کرتے رہو اور ایسے رغبتی سے اسے مت چھوڑو کیونکہ ہر بندے کو اپنے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ ملے گا۔"

(یہ اشعار سن کر) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"میرے پاس دینار لاؤ۔"

چنانچہ آپ کے پاس سو اشرفیاں لائی گئیں۔ آپ نے وہ اشرفیاں اس آدمی کو دے دیں۔

حضرت اصبغ کہتے ہیں "میں نے کہا اے امیرالمومنین! آپ اسے ایک جوڑا اور سو دینار دے رہے ہیں؟"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہاں! میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کے درجے کے مطابق معاملہ کرو اور اس آدمی کا میرے نزدیک یہی درجہ ہے۔"

نفس پر قابو

حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں "حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کے ہاں گئے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ٹھنڈا شوربا اور روٹی رکھی اور شوربے پر تیل ڈال دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"ایک برتن میں دو سالن (ایک شوربا اور دوسرا تیل) میں مرتے دم تک ایسے سالن کو نہیں چکھ سکتا۔"

خواہش پرستی

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ "اے موسیٰ! تمہارا اٹھکانا قبر ہے۔ پس چاہیے کہ جسم کو خواہش پرستی سے دور رکھو اور جس کو اچھی نعمتیں ملیں اور دل کی آرزو آئے۔ وہ نیک لوگوں میں شمار نہیں ہوگا۔"

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"فلک چہارم پر دو فرشتے آپس میں ملے۔ ایک نے کہا کہ "میں اس لیے جا رہا ہوں کہ فلاں ماہی گیر کو مچھلی کے جال میں پھنسا دوں کیونکہ فلاں یہودی اس کا خواستگار ہے، دوسرے فرشتے نے کہا "میں زمین پر اس لیے جا رہا ہوں کہ فلاں عابد کے پاس لوگ روغن کا پیالہ لائے ہیں۔ میں اس کو گرا دوں۔"

سردار

حضرت ابوعلی رباطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ رازی کا رفیق سفر بن کر سفر کو روانہ ہوا۔ انہوں نے فرمایا۔

"راستے کا سردار تم بنو گے یا میں؟"

میں نے کہا "آپ بنیں۔" تو فرمایا "جو کچھ میں کہوں گا اسے ماننا پڑے گا۔"

میں نے کہا "بسر و چشم۔"

فرمایا "توبرہ لاؤ۔"

میں ان کے فرمانے سے توبرہ لایا۔ زادِ راہ،

کپڑے اور جو سامان موجود تھا، اس توبرہ میں بھر کر اپنی پیٹھ پر لاد لیا اور چل پڑے۔

میں نے انتہائی اصرار کے ساتھ عرض کیا۔

"یہ سامان مجھے دے دیں کہ میں اٹھا لوں گا تاکہ آپ تھک نہ جائیں۔"

تو فرمایا۔

"تمہیں یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اپنے سردار پر حکم چلاؤ۔ اب تم کو فرماں برداری کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ساری رات مینہ برستا رہا اور آپ میرے اوپر چادر تانے کھڑے رہے تاکہ بارش مجھ پر نہ پڑے۔ جب میں گفتگو کرتا تو فرماتے۔

"میں تمہارا سردار اور امیر ہوں۔ تم میرے مطیع فرمان ہو۔" میں اپنے دل میں کہتا۔

"کاش میں ان کو سردار نہ بناتا۔"

حسد،

امام اصمعیؒ بوڑھے ہو چکے تھے لیکن صحت و توانائی قابل رشک تھی۔ کسی نے پوچھا۔

"حضرت! آپ کی عمر کیا ہے؟"

امام اصمعیؒ نے جواب دیا۔ "ایک سو بیس سال۔"

اس شخص نے حیرت سے کہا۔ "اوّل تو اتنی عمر ہر ایک کو ملتی نہیں اور دوم آپ کی قابل رشک صحت و توانائی۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟"

امام اصمعیؒ نے جواب دیا۔ "اس کا کوئی راز نہیں۔ زندگی کی قاتل ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے حسد، اور میں زندگی بھر حسد سے دور رہا ہوں۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

اقوالِ دانش،

- نظریات کے لیے جنگ نہ کی جائے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔
- احمق اور مردہ لوگ اپنے خیالات تبدیل نہیں کرتے۔ (لاویل)
- وہ جو اپنے خیالات تبدیل نہیں کرتے۔ خود اپنی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور سچائی سے نفرت کرتے ہیں۔ (جوبرٹ)
- وہ جو اپنے نظریات پر قائم رہتے ہیں۔ اکثر غلط ہوتے ہیں۔ (جوبرٹ)
- مرض کا باپ کوئی بھی ہو، خراب غذا اس کی ماں ضرور ہوتی ہے۔ (جارج ہربرٹ)

نادیہ یاسر۔ گوجر خان

ضمیر،

- یہ انسان کے اندر خدا کی دھیمی مگر واضح آواز ہے۔ (ینگ)
- ضمیر ہمارے جسم میں ایسی مقدس آواز ہے جو ہم سے کہتی ہے، ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ، کوئی ہستی تمہیں دیکھ بھی رہی ہے۔ (میکلن)
- ضمیر کی اندرونی چیخ نہ تو کان سن سکتے ہیں اور نہ ہی زبان اس کے کرب کو ظاہر کر سکتی ہے۔ (چیمبرز)
- کوئی تکیہ اتنا ملائم نہیں ہوتا جتنا صاف ضمیر۔ (فرانسیسی کہاوت)
- ضمیر انسانی روح کی پاکیزہ پکار کا نام ہے۔ (موزلی)

منیبہ، اریبہ شمشاد۔ آزاد کشمیر

جواہر پارے،

- نیا سال عمر کی سڑک پر لگا ہوا خطرے کا نشان ہے جو زندگی کا نہیں دلوں کا رشتہ بھی توڑ دیتا ہے۔ کبھی روکتا ہے، کبھی ٹوکتا ہے اور آنے والے دنوں کی تلخیوں، توقعات اور امیدوں کے ٹوٹتے موڑوں اور اسپیڈ بریکروں سے باخبر کرتا ہے۔
- کہتے ہیں کبھی کوئی ایک کسی شخص کی منزل ہو جاتا ہے۔ نہ دولت نہ طاقت وہی ایک وجود مرکز بن جاتا ہے، سوچوں کا محور بن جاتا ہے۔

(اختر عباس)

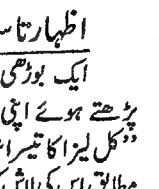

سوچ

ایک عمر رسیدہ دیہاتی جوڑا پہلی بار شہر آیا۔ ایک فیشن ایبل علاقے سے گزرتے ہوئے بڑے میاں ہر راہ چلتی عورت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ آخر تنگ آ کر بڑی بی نے کہا۔

''افضل کے ابا! کچھ شرم کرو، کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ شاید تم نے زندگی میں کبھی عورت نہیں دیکھی۔''

بڑے میاں ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''کوئی اور تو کیا سوچے گا۔ میں تو خود اس وقت یہی سوچ رہا ہوں۔''

خوش فہمی

ایک شادی شدہ جوڑا وزن چیک کرنے والی مشین پر وزن چیک کر رہا تھا۔ مشین نے پرچی نکالی جس پر لکھا تھا۔

''آپ بہت خوب صورت ہیں۔ آپ کی عادتیں بہت اچھی ہیں۔ آپ بہت مخلص ہیں۔'' اور وزن لکھا تھا ڈھائی من۔

بیوی اترا کر بولی۔ ''دیکھیے مشین کتنی اچھی ہے۔ خوبیاں میری اور وزن آپ کا بتا دیا۔''

مطالبہ

بیوی نے اپنے شوہر کے خلاف علیحدگی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس نے جج کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا۔

''جناب، میں نہ تو اس کی دولت کی خواہش مند ہوں، نہ حق مہر طلب کرتی ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر مجھے اسی حالت میں چھوڑ دے جس حالت میں، میں شادی سے پہلے تھی۔''

''شادی سے پہلے تم کس حالت میں تھیں؟'' جج نے پوچھا۔

''بیوہ۔'' بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔

اظہار تاسف

ایک بوڑھی غیر شادی شدہ عورت نے اخبار پڑھتے ہوئے اپنی ہم عمر غیر شادی شدہ سہیلی کو بتایا۔ ''کل لیزا کا تیسرا شوہر بھی انتقال کر گیا اور وصیت کے مطابق اس کی لاش کو نذر آتش کر دیا گیا۔''

بوڑھی سہیلی نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔ ''کیسی عجیب دنیا ہے ہم میں سے کچھ ایسی ہیں کہ جنہیں ایک بھی شوہر نصیب نہیں ہوتا اور کچھ ایسی بھی ہیں جو شوہر پر شوہر نذر آتش کرتی رہتی ہیں۔''

بڑھاپا آ گیا

ایک شخص اپنے دوست سے کہہ رہا تھا ''میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں جس طرح لوگ مجھ سے باتیں کرتے ہیں، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔''

''تم بوڑھے تو نہیں ہوئے۔'' دوست نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا! لوگ کس انداز سے باتیں کرتے ہیں۔''

''پہلے مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے جبکہ اب، کہتے ہیں کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟'' اس نے جواب دیا۔

ضرورت برائے شریک حیات

حسین ہو، کنواری ہو، حافظ ہو، ڈاکٹر ہو، دانشور ہو، سادہ لوح ہو، کمر پتلی ہوں، گردن لمبی ہو ستواں ناک ہو، نازک ہونٹ ہوں، زبان زیادہ لمبی نہ ہو، آواز سریلی ہو، چوبیں گھنٹے جاگتی رہے اور سوتے ہوئے غضب لگے، آنکھیں نشیلی ہوں سیاہ ناگن سی زلفیں ہوں، گھنی پلکیں ہوں باریک ابرو، عمدہ حسب نسب، کسب سے استانی ہو، خوش مزاج ہو خوش طبع ہو، ہرنی سی چال ہو، رس گلے جیسی میٹھی ہو، عنبر جیسی مہک ہو، چلتی ہوا سی ہو، اڑتی پتنگ سی ہو لکھے تو عصمت چغتائی لگے، بولے تو نیہا ککڑ لگے، گالیاں دے تو پھول لگے، طعنے دے تو مشورے محسوس ہوں، گالیاں دے تو پھول لگیں۔

ڈانٹ ڈپٹ کرے تو بیگم لگے، سختی سے پیش آئے پڑوسن کا گمان ہو، بات کرے تو راحت دے، خاموش ہو تو سکون دے۔

☆

خالدہ جیلانی

تحریم _____ محراب پور
سن کر تمام رات میری داستان غم
وہ مسکرا کر بولے بہت بولتے ہو تم

فضہ بلال _____ ڈیفنس گارڈن
جو تکلف کی حد سے آگے نہ بڑھی
وہ ملاقات بھی داستان بن گئی

طوبیٰ فیصل _____ علی پور چٹھہ
سوچتے ہیں بنا ہی ڈالیں اب
کوئی فرقہ اداس لوگوں کا

بشریٰ محسن _____ کراچی
کیا حسن اتفاق ہے، ان کی گلی میں ہم
اک کام سے گئے تھے کہ ہر کام سے گئے

ماریہ علی _____ قصبہ کالونی
عمر کا حساب کر ڈالا
اس نے پھر لاجواب کر ڈالا
ہم خزاں کا اجاڑ منظر تھے
اس نے چھو کر گلاب کر ڈالا

اقصیٰ ناصر _____ گلستان جوہر
وقت نے وہ خاک اڑائی کہ دل کے دشت سے
قافلے گزرتے ہیں پھر بھی نقش پا کوئی نہیں

زبیدہ ریاض _____ حیدرآباد
اس زندگی کے حسن کی تابندگی نہ پوچھ
جو حادثوں کی دھوپ میں تپ کر نکل گئی

مدیحہ، ایمان _____ گارڈن
ان سے پوچھ کبھی چہرے بھی پڑھے تم نے
جو کیا کرتے ہیں کتابوں کی باتیں اکثر

اقرأ _____ کراچی
خوش مزاجی بھی مشہور بھی، اب سادگی بھی کمال ہے
ہم شریر بھی انتہا کے تھے، اب سنجیدگی بھی کمال ہے

آسیہ جاوید _____ (بارہ دری) علی پور چٹھہ
اسے پانا اسے کھونا، اسی کے ہجر میں رونا
یہی گر عشق ہے محسن تو ہم تنہا ہی اچھے ہیں

نوبیہ قطب _____ کراچی
کہتے ہیں چپ چاپ سے رہتے ہیں وہ اکثر
نہ لفظوں میں سنا ہے کہ سنوارا نہیں کرتے
دن رات کہ ان کے گزرتے ہیں پریشاں
آرام سے ہم بھی تو گزارا نہیں کرتے

ارم کمال _____ فیصل آباد
جو دیکھتے تیری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نوال افضل گھمن _____ گجرات
ایک مدت کے بعد آئے ہو
پھر بھی جانے کی بات لائے ہو
اتنا ٹھہرو کہ دل ٹھہر جائے
ہم نے مانا کہ تم پرائے ہو

نمرہ عاقب _____ گرین سٹی
زباں ابھی سے کہے میری داستان الفت کیوں
ابھی نگاہ میں تاب کلام باقی ہے

صدف عمران _____ کے ڈی اے
ان کی نظر میں میری تباہی کے واسطے
اتنا خلوص تھا کہ شکایت نہ ہو سکی

صائمہ سلیم _____ کراچی
میں ایک آنسو ہی سہی، ہوں بہت انمول مگر
یوں نہ پلکوں سے گرا کر مجھے مٹی میں ملا

عائشہ _____ گوجرہ
میرے عشق سے ملی ہے تیرے حسن کو شہرت
تیرا ذکر ہی کہاں تھا میری داستاں سے پہلے

بقیہ خط آپ کے

خط بھیجنے کی جو جلدی ہے کہ وقت پر جائے اور پس چھپ جائے ان شاء اللہ۔

تیسری اور سب سے اہم وجہ مجھے آپ کے ادارہ کو شکریہ ادا کرنا تھا میرے افسانے چھپ گئے وہ بھی لگاتار آگے پیچھے بہت شکریہ آپ کا میرے الفاظ یہ اعزاز دینے کے لیے ماہا اور تبسم دونوں بہنوں کو کہنا تھا کہ میرا ادارے والوں سے کوئی تعلق واقفیت نہیں تھی کہ میرے افسانے فوراً چھپ جاتے۔ بات صرف صحیح وقت کی ہے آپ کا وقت جب آتا ہے نا تو کوئی روکاوٹ راستے میں حائل نہیں ہوسکتی ورنہ 2014 سے کوشش کررہی تھی۔ چھپ کہ نہ دیں اور جب وقت آیا تو فروری 2020 کو رجسٹری کروائیں اور مارچ میں چھپ بھی گئیں۔ بس اللہ کا شکر جس نے یہ وقت دکھایا۔

پیاری مدیحہ..... شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ مزید کہانیاں لکھیں۔ جس طرح ہر کہانی شائع نہیں ہوتی اسی طرح ہر کہانی ریجیکٹ بھی نہیں ہوتی۔ یہ پرچا ہمارا نہیں ہماری لاکھوں قارئین کا ہے۔ کہانیوں کا انتخاب کرتے ہوئے ہم ان کی رائے کو مقدم رکھتے ہیں۔

ارم کمال.....فیصل آباد سے لکھتی ہیں

ٹائٹیل میں ماڈل کی ہنسی مسکراتی تصویر سیدھی دل میں اتر گئی۔ حمد اور نعت روح کو معطر کر گئیں۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ہر قدم پر راہ دکھاتی ہیں۔ اذیکا ڈینیل سے ملاقات بھرپور رہی سب سے زیادہ مزا مجھے خطوں کی بزم میں آتا ہے جہاں ساری بہنیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوتی ہیں آپ کے محبت بھرے جوابات دل کو ایک الگ ہی سرشاری سے روشناس کراتے ہیں۔ اس دفعہ خطوں کی بزم میں ثمینہ اکرم اور کوثر خالد چھائی رہیں۔

نیا سلسلے وار ناول ''نور القلوب'' تنزیلہ ریاض نے شروع میں ہی چونکا دیا۔ عندلیب زہرا کی ''واپسی''، ''کیسا ہے نصیبا'' سے ملتی جلتی لگی۔ میمونہ صدف کی ''قوام'' ذہن کے دریچوں کو جھنجوڑ گئی مرد کو خدا نے قوام بنایا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مرد اپنے قوام ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بڑی باتیں تو جانے دیں اگر عورت اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کرلے۔ کسی سے بات کرلے، گھر پر اپنی مرضی سے کسی کی دعوت بھی کرلے تو بھی مرد حضرت بڑا فساد پیدا کرتے ہیں۔ نعیمہ ناز کا ''شہر تمنا'' بالآخر اختتام پذیر ہوا۔ سارے بچھڑے روکے ہنستے مل ہی گئے۔

طلال کا جو انجام ہوا، وہ اسی کو ڈیزرو کرتا تھا۔

''شکایت'' میں آس نے روحیہ کو جو رخ دکھایا شکر ہے روحیہ کی سمجھ دانی میں آگیا۔ ''عناد'' زبردست مکمل ناول پہلی سطر سے جو پڑھنا شروع کیا تو آخری سطر تک نظر ہٹی نہیں اینڈ سے دل خوش ہوا۔ فرح بخاری کا ''وہ نازنین'' بھی ختم ہوا۔ حالانکہ ابھی میرا دل تھا کہ کم از کم ایک قسط اور ہوتی ابھی تو جا کر کہیں بھاگم دوڑ ختم ہوئی تھی۔ بہرحال فرح بخاری کی تحریر نے کافی عرصے مسمرائز کرکے رکھا۔ شام کی حویلی میں ردا کی موت کے شاک سے دل ابھی تک باہر نہیں نکلا۔ موحد کشف کے بارے میں کچھ برا نہیں سوچنا کیونکہ کشف مجھے بہت پیاری ہے اپنی تمام تر بدتمیزیوں اور حماقتوں کے ساتھ ''گڑیا'' نور نظر کی ایک سبق آموز تحریر رہی۔ جب ہمارے معاملات، احساسات اور محبتیں میانہ روی سے آگے نکل جائیں تو ہی گڑیا جیسے کردار تشکیل پاتے ہیں۔ میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا کیونکہ آج میں نے میاں صاحب سے کہا آج میرا کچن کا بائیکاٹ ہے لہٰذا ہوٹل سے رجوع کریں۔

پیاری ارم! آپ نے کچن کا بائیکاٹ کرکے ہمیں خط لکھا ہے۔ ہم آپ کا خط ضرور شائع کریں گے لیکن آپ کے میاں صاحب تو مفت میں مارے گئے نا۔ ان کا کیا قصور کہ آپ نے انہیں ہوٹل کا راستہ دکھادیا خیر چلیں کبھی کبھی ایسا بھی چلتا ہے۔

تفصیلی تبصرہ بہت اچھا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

ایمن نیازی نے بستی ملوک سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں میرا تعلق بستی ملوک سے تھوڑے فاصلے پر واقع چک سے ہے جس کا نام W.B.372 ہے۔ میں نے

میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت شوق ہے اور لکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ میری کزنیں اور بہنیں سب پڑھتی ہیں اور میری بہن ہمیشہ کہتی ہے کہ میں خط لکھوں گی لیکن نہ لکھ سکی اور میں آج لکھ رہی ہوں۔

پیاری ایمن! ان پڑھ ہونا علیحدہ بات ہے اور ذہانت، صلاحیت اور مطالعہ اپنی جگہ۔ تعلیم صرف ڈگریوں کا نام نہیں ہے۔ نصابی تعلیم نہ ہونے کے باوجود آپ کے والدین نے آپ کو رسالے پڑھنے سے نہیں روکا یہ بہت بڑی بات ہے۔

آپ نے کسی کہانی کے بارے میں نہیں لکھا۔ آئندہ خط لکھیں تو کہانیوں کے بارے میں بھی اپنی رائے لکھیں۔

رضوانہ وقاص نے لہری پور کرلاں

سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شہر تمنا کیا بات ہے نعیمہ ناز کی، بہت اچھا اینڈ کیا ویلڈن سب بچھڑوں کو ملا دیا۔ شاہ میر نے درست فیصلہ کر کے اچھا بھائی بھتیجا بن کر دونوں کو ساتھ رکھ لیا۔ طلال کے ساتھ ہونا تو ایسا ہی چاہیے تھا۔ سرمد کا سن کر دل خفا ہوا کرنٹ لگ کر مر گیا۔ لیکن نائلہ نے اچھا نہیں کیا۔ سزا تو ملنی تھی نائلہ کو "نازنین"، جبار چچا نگار چچی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا پہلے جوان بیٹی چلی گئی پھر ذکی بے چارے کو کرنٹ لگ گیا۔ لیکن اسے اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔ نازنین کے لیے کیا سوچے بیٹھا تھا۔ اسفند، رئیس دونوں کو محبت مل گئی۔ نصیر، رباب کی شادی ہوگئی۔ فرح بخاری نے بھی اینڈ اچھا کیا۔ افسانہ گڑیا پڑھا والدین، بھائیوں کی لاڈلی تھی۔ ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ ماڈل ثناء احمد ہنسی مسکراتی پیاری لگ رہی ہے۔ پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں ساری کی ساری بہت ہی اچھی ہیں۔ انٹرویو، اذکا کا پسند آیا۔ خط آپ کے پڑھا میرا خط مختصر کر کے باقی سب کے تفصیلی۔ مجھے آپ سے شکایت ہے۔ ثمینہ اکرم آپ کو عمرے کی مبارک باد اللہ کرے ہم بھی اللہ کا گھر دیکھنے جائیں (آمین) آپ کو نانی کی مبارکباد قبول ہو۔ ثانیہ مرید آپ کے گاؤں کا حال پڑھا اچھا لگا۔ یہی حال ہمارے گاؤں کا ہے۔ ہمارے گاؤں میں بھی شادیوں میں بہت مزہ آتا ہے۔ ابھی بھی ہمارے خاندان میں شادی ہے۔ امی کے ماموں زاد کی ڈھولک رکھی ہوئی ہے۔ 10 تاریخ بارات ہے۔ آپ کو میری نعت بھی پسند نہیں آئی اور شعر بھی لیکن میں بھی ہمت ہارنے والی نہیں۔

پیاری رضوانہ.....! آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ بہنیں ہمیں کتنے طویل خط لکھتی ہیں جن دوسری بہنوں کے خط آپ کو تفصیلی لگے اگر آپ ان کے دس بارہ صفحات کے خط دیکھ لیتیں تو حیران رہ جاتیں۔ ہم نے ان کے دس صفحات صفحات کاٹ کر دو صفحات شائع کیے ہیں۔ لیکن ایک بات کا یقین رکھیں کہ ہم آپ نے خط خواہ کتنے ہی طویل کیوں نہ ہو پورے پڑھتے ہیں۔

شعاع آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔

مریم بشیر اٹک کینٹ سے لکھتی ہیں

تقریباً پچیس سال پرانی قاری ہوں۔ 1995 میں میں نے ماہا ملک کا ناول جو چلے تو جہاں سے گزر گئے پڑھا تھا۔ تب میں 8th کلاس میں تھی۔ اس کی آخری قسط نہیں پڑھ سکی تھی کیونکہ میری بہن کی دوست اور ہماری دور پرے کی کزن وہ رسالہ لے گئی تھی بعد میں پھر ناول منگوا کر پڑھا تھا۔ زندگی میں بہت نشیب و فراز آئے۔ بہت سارے پیارے ساتھ چھوڑ گئے لیکن ساتھ نہیں چھوٹا تو خواتین شعاع کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ آج میں تین بچوں کی ماں ہوں۔ ماشاء اللہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بڑی بیٹی ماشاء اللہ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے اور دوسری سترہ سال کی ہونے والی ہے بیٹا نو سال کا ہو گیا ہے ہمارے گھر میں رسالے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ میرے میاں (چچا زاد بھائی) تھوڑے اسلامی ہیں، تبلیغی جماعت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان سے چھپ کر پڑھتی ہوں شادی کو انیس سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک اجازت نہیں ہے، کہتے ہیں ان رسالوں کی کہانیاں جھوٹی ہوتی ہیں تم اسلامی بک پڑھ لیا کرو لیکن میری رسالوں سے محبت اتنی ہے کہ

آپ سوچ بھی نہیں سکتیں اور یقین مانیے میرے پاس یہ رسالے میری زندگی کا کل اثاثہ ہیں اور واحد تفریح ہے میرے پاس یہ رسالے کیونکہ آج کے جدید دور میں میرے پاس دو مہینے ہوئے موبائل بھی چھن چکا ہے، وہ بھی بٹن والا بس اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی۔ آپ کو بس دعا کی درخواست ہے تمام قارئین سے۔

اب آتی ہوں رسالے کی طرف میرا خط لکھنے کی وجہ فرح بخاری کا ناول وہ نازنین ہے جو اس ماہ اختتام کو پہنچا۔ میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ یقین مانیے اس ناول کی ہر قسط کا میں نے بڑی شدت سے انتظار کیا ہے۔ فرح بخاری کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد اتنا اچھا ناول لکھنے پر۔ فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد، راشدہ رفعت بھی بہت پسند ہیں۔

سب سے مشکل مرحلہ تو خط پوسٹ کروانے کا ہے دعا کریں پوسٹ ہو جائے اور آپ تک پہنچ جائے اگر میرا خط لیٹ بھی پہنچے تو خدارا اشاعت ضرور کریں۔

اصل زندگی بہت تلخ ہے ہم، اتنی رسالوں کو پڑھ پڑھ کر جی رہے ہیں۔ میرے پاس جب پڑھنے کو کچھ نہ ہو تو میں پرانے رسالے خرید کر پڑھتی ہوں اور اپنا ٹائم پاس کرتی ہوں۔ دسمبر کے مہینے میں میرے میاں چالیس دن کے لیے جماعت کے ساتھ چلے جاتے ہیں تب سردیوں کی لمبی راتوں میں رسالے پڑھ کر ٹائم گزارتی ہوں۔ رسالہ میں زیادہ تر خود ہی خریدتی ہوں اگر بازار نہ جا سکوں تو میری ایک کزن ٹیچر ہے بھلا ہو اس کا لا دیتی ہے۔ میری بڑی بہن جو میری جیٹھانی بھی ہے وہ بھی بہت شوق سے رسالے پڑھتی ہے۔

میرا خط لمبا تو بہت ہو گیا ہے لیکن مجھے ایک ناول کے بارے میں پوچھنا ہے۔ شاید شازیہ چوہدری کا مکمل ناول تھا، ہیروئن کا نام اور ناول کا نام یاد نہیں ہیروئن کی بہن کا نام گلناز تھا کہانی کچھ اس طرح تھی کہ گھر کا ماحول مذہبی اور سخت ہوتا ہے اور اسی سختی کی وجہ سے ہیروئن کی بہن گلناز پاگل ہو جاتی ہے۔ اور ہیروئن کی بہن گلناز کی شادی بھی اینڈ میں ہیرو کے ساتھ ہو جاتی ہے پلیز مجھے اس ناول کا نام بتا دیں۔

پیاری مریم! آپ کے حالات جان کر دلی دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیاں دور کرے۔ اور آپ کو اپنی اولاد کا سکھ نصیب کرے آمین۔

شعاع سے آپ کی طویل وابستگی اور محبت ہمارے لیے باعث خوشی بھی ہے اور کامیاب ہیں تب ہی ہماری قارئین کی وابستگی قائم ہے۔ اطمینان بھی اطمینان یہ کہ ہم شعاع کا معیار برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ جس کہانی کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے۔ ہمیں یاد نہیں ہے قارئین میں سے کسی کو یاد ہو تو ہمیں بتا دیں۔ ہم شائع کر دیں گے۔

عظمیٰ نے شہر کچھی والہ سے لکھا ہے

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ شعاع، خواتین، کرن، عمران سیریز پرچے میرے گھر میں تب سے آ رہے ہیں جب میں ابھی خود بھی دنیا میں نہیں آئی تھی۔

ہمارا جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ 1990 میں میری آنٹی اس گھر میں آئیں، ان کی شادی کے بعد یہ پرچے بھی ہماری فیملی کا حصہ بنے پھر اس کے بعد میری ماشاء اللہ چار باجیاں اور میں خود اس پرچے سے ایسے جڑ گئے کہ یہ رشتہ آج تک ویسے ہی برقرار ہے۔ 2014 میں میری بڑی باجی کی شادی ہوئی۔ اور وہ اپنے جہیز میں اپنے آج تک کے سارے جمع کیے رسالے بھی ساتھ لے گئیں۔ بہت یادیں وابستہ ہیں پرانے دنوں سے، کہنے کو بہت کچھ ہے۔ آج بھی میں آپ کو ای میل کر رہی ہوں آپی پر بہت ڈرتے ہوئے کہ پتا نہیں الفاظ کا چناؤ ٹھیک کر رہی ہوں یا نہیں۔

پیاری عظمیٰ! آپ کی آنٹی نے ہمارے پرچوں کو آپ سے متعارف کرایا۔ ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کریں۔

الفاظ کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ ہمارے لیے الفاظ اہم ضرور ہیں لیکن جذبات سے زیادہ نہیں۔ آپ کی شعاع سے طویل عرصہ سے وابستگی اور محبت ہمارے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہمارے لیے اس

سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ آپ کی باجی جہیز میں سارے جمع کیے ہوئے ڈائجسٹ لے کر گئیں۔

ہانیہ ہارون ہارون آباد ضلع بھاول نگر سے شریک محفل ہیں

کئی مہینوں سے دل ناداں اس خواہش میں مچل رہا تھا کہ ہمارا خط شعاع کے گلدستے میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرے۔ بندی ''ناچیز'' پچھلے تین سالوں سے شعاع کی مستقل قاری ہے۔ تین سال اس لیے کیونکہ آٹھویں جماعت میں تھی جب شعاع، کرن اور خواتین ڈائجسٹ میں افسانے پڑھنے کا آغاز کیا۔ دل کو کچھ ایسے بھائے کہ اب چھوڑنے کا سوچوں تو زندگی ویران معلوم ہوتی ہے۔ تو جناب تین سال قبل افسانوں سے شروعات کی۔ ماما جانی نے بہتیرا روکنے کی کوشش کی حالانکہ خود بھی یہ تین رسائل پندرہ سال سے دل سے لگائے ہوئے ہیں مگر ہمارا پڑھنا ناگوار گزرا کہ کہیں پڑھائی کا حرج نہ ہو۔ مگر ہم بھی اپنے نام کے ایک ہی نکلے اور منوا کر ہی دم لیا۔ چنانچہ انہیں اجازت دینے ہی بنی۔ اور آج ہم الحمدللہ گیارہویں جماعت میں زیر تعلیم ہیں اور ہر ماہ باقاعدگی سے پورے اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان شماروں سے ہمیں بہت سی نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم اللہ کا شکر ہے اس عمر میں بھی خاصے سمجھدار ہیں۔ (آہم!)

اب بات ''شمارے کی ہو'' ''وہ نازنین'' کی اینڈنگ شان دار تھی، فرح آپی سیرب! میمونہ صدف کا ''قوام'' دل کو چھو گیا۔ ''عناد'' بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ تنزیلہ ریاض کے ناول ''نورالقلوب'' کی پہلی قسط پڑھ کر ہی سحر زدہ سی ہوگئی۔ کیا انداز تحریر ہے ان کا۔ ماشاءاللہ! اللہ کامیابی سے ہمکنار کرے (آمین) شہر تمنا میں طلال کے انجام کا بس تھوڑا سا ذکر۔ بھلا کیوں؟ اسے تو عبرت ناک سزا ملنی چاہیے تھی۔ خیر جو ملی، وہ بھی کچھ کم تو نہیں تھی۔ ''شام کی حویلی میں'' میر منصور پر بہت غصہ آیا۔ موجد تو میری سمجھ سے ہی باہر ہے۔ عجیب دھوپ چھاؤں سا شخص ہے۔ افسانے سب ہی بیسٹ تھے۔ ''نورنظر کا گڑیا'' اداس کر گیا۔

پیاری ہانیہ: شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے خواہ مخواہ سوچ بچار میں وقت ضائع کیا۔ ہمیں پہلے ہی خط لکھ دیتیں۔ آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے ہمیں تو یقین ہی نہیں آرہا فرسٹ ایئر کی طالبہ اتنا اچھا۔ خط لکھ سکتی ہے اور اتنی پختہ سوچ رکھتی ہے۔ اب باقاعدگی سے ہماری محفل میں شرکت کرتی رہیے گا۔

تسنیم کوثر کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

نومبر کا شعاع پڑھا ہمیشہ کی طرح اچھا، پیارا، تیکھا میٹھا اور دلکش لگا۔ نئے ناول نورالقلوب کے بارے میں دو تین اقساط پڑھ کر ہی کچھ اپنی ناقص رائے دے سکیں گے یقیناً ہی عمدہ ناول ہوگا کیونکہ رائٹر بھی تو ماشاءاللہ تنزیلہ ریاض ہیں۔ شہر تمنا کا اختتام ہوا۔ اس ناول نے ابتدا سے اینڈ تک بھول بھلیوں میں مبتلا رکھا مگر اینڈ اچھا رہا۔ اسے بس ایوریج کہانی کہہ سکتے ہیں اور جناب وہ نازنین کا کیا کہیں، یہ بھی الجھی ہوئی مشکل اسٹوری تھی مگر اینڈ بہت خوب صورت رہا۔ آپ کا کیا خیال ہے ہم نے ٹھیک کہا ہے نا۔ البتہ شام کی حویلی میں بہت اچھا لگ رہا ہے۔ رخسانہ نگار عدنان محنت سے لکھ رہی ہیں اور جناب میمونہ صدف کا قوام تو بے حد عمدہ لگا، ان کے ناولٹ کی کہانی ہمیں بہت پسند آئی اور ایک بات بتاؤں۔ ہم نے قوام لفظ شاید کبھی نہیں سنا تھا شاید قوام محافظ کو کہتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ افسانوں میں شازیہ جمال طارق کا شکایت اچھی تحریر تھی اور عندلیب زہرا نے واپسی بھی اچھے انداز میں رقم کی اور نورنظر کی گڑیا بھی اچھی کہانی تھی انہوں نے ایک اہم ٹاپک پر قلم اٹھایا ہے۔

پیاری تسنیم! قوام اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا ہے۔ اپنی عورتوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کی ضروریات پوری کرنا بھی ان پر فرض کیا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سلمیٰ مسرت خیابان سرسید راولپنڈی سے لکھتی ہیں

نومبر کا شعاع کھولتے ہی موڈ خوش گوار ہوگیا ثمینہ اکرم اور شمع خالد کے خط دیکھ کر، میں سب قارئین بہنوں کے خط بہت اپنائیت سے پڑھتی ہوں۔ ثمینہ آپ نے میرا تعارف پسند کیا۔ بہت شکریہ۔ آپ سے غائبانہ دوستی اس دن سے ہے جب آپ کے بیٹے معیز کا ایکسڈنٹ ہوا اس وقت میں بھی غم سے چور تھی۔ میرا بھائی اور میرے شوہر کا بھتیجا میرے بھانجوں کا والد میرا بہنوئی جس کے ساتھ ہمارے اتنے سارے رشتے تھے وہ چشمہ بیراج میں انجینئر تھا، ایکسیڈنٹ نے ہم سے جدا کردیا تو شعاع میں آپ کا خط پڑھ کر مجھے یہ غم مشترکہ لگا پھر آپ کا تعلق کراچی سے ہے جہاں میرا گولڈن دور گزرا۔ آپ کا شمع خالد کو دیا مشورہ بہت پسند آیا کہ قرآن کے ساتھ ہمارا تعلق دوستی ایسی ہی ہونی چاہیے اس بار آپ نے تنزیلہ ریاض کا ناول دے کر دیرینہ خواہش پوری کردی، وہ نازنین کا اختتام زبردست تھا اتنے طویل اور خوب صورت ناول کا اینڈ پھیکا ہی ہونا چاہیے تھا اکتوبر کے ناول زرتاشہ پر بھی تبصرہ کروں گی زبردست موضوع تھا۔ سورۃ النساء میں بہت تفصیل سے مرد کی دوسری شادی کے بارے میں سمجھایا گیا ہے لیکن مسئلہ وہی ہے کہ لوگ زندگی کو کھیل تماشا سمجھتے ہیں۔ آپ ہمیں ایک ماہ پہلے کے سلسلوں پر بھی تبصرہ کرنے دیا کریں کیونکہ ہم جیسے مصروف لوگ آہستہ آہستہ پڑھتے ہیں اور الحمدللہ لکھنے والوں کے لفظوں کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں میں سوچتی تھی کہ شاید جوانی میں ہی رسالوں کا شوق رہے گا لیکن زندگی کے ہر دور میں سیکھنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور ہم ہر بار کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں میرا بس چلے تو ہر لڑکی کو پابند کردوں کہ ان تحریروں کو باقاعدگی سے پڑھیں، تعلیم تو عام ہے لیکن تربیت اور عمل کی شدید کمی ہے۔ لکھنے کو بہت کچھ دل چاہتا ہے لیکن فرصت کی شدید کمی ہے، میں اور میرے شوہر بہت مصروف زندگی گزار رہے ہیں بہت ساری ذمہ داریاں ہیں پھر بھی میری کوشش ہوگی کہ کم از کم سلسلوں میں شرکت کروں یا کم از کم تبصرے کے ساتھ حاضر ہوتی رہوں۔

نئے سال میں شعاع میں کوئی نیا سلسلہ بھی شروع کریں ویسے اس وقت سارے سلسلے ہی شان دار ہیں۔

سلمیٰ مسرت! ہمارا تو خیال تھا کہ آپ اپنے تمام فرائض سے سبک دوش ہوکر تمام ذمہ داریوں سے آزاد زندگی گزار رہی ہیں۔ لیکن آپ نے بتایا کہ آپ کی بہت ساری ذمہ داریاں ہیں۔ آپ ان مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھتی ہیں اس کے لیے بہت شکریہ۔ نیا سلسلہ ضرور شروع کرتے مگر مسئلہ صفحات کا ہے۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے ہم بہت سے سلسلے نہیں دے پاتے ہیں۔ دعا کریں کہ ڈالر پرانی قیمت پر آجائے اور کاغذ کی قیمتیں معمول پر آجائیں۔ تو ہم صفحات بڑھادیں گے۔

بنت ضیاء اللہ نے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

مجھے شعاع کی سب سے اچھی بات یہ لگتی ہے کہ اس کا آغاز پیارے نبیؐ کی باتوں سے کیا جاتا ہے۔ جو اندھیری رات میں جگنو کی طرح راستہ دکھاتی ہیں۔ مجھے شعاع کی ہر کہانی دلچسپ لگتی ہے۔ اس میں ہر موضوع پر بات کی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری چیزیں مثلاً حمد، نعت پیاری باتیں سب کچھ کمال ہے۔ میں نے ایک تحریر کا آغاز کیا ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو کیا میں اپنی یہ تحریر آپ کو بھیج سکتی ہوں۔

بنت ضیاء اللہ! آپ ضیاء اللہ صاحب کی صاحب زادی ہیں، ضیاء اللہ صاحب نے آپ کا کوئی نام بھی رکھا ہوگا۔ اور یقیناً بہت پیار سے رکھا ہوگا۔ آپ اپنا نام ضیاء اللہ صاحب کے ساتھ لکھتیں تو ہمیں زیادہ اچھا لگتا۔ کہانیاں لکھنے کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں ضرور لکھیں اور یقین رکھیں کہ اچھی ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

صدف ناز انصاری، مقدس ناز انصاری اور طوبیٰ شوال انصاری نے ملتان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں آپ کسی کی اجازت یا مشورے کی محتاج بھی نہیں لیکن کچھ تجاویز اور مشورے ہیں۔

اب ٹائٹل پر آنے والی لڑکیوں کے انٹرویو اور انٹرویو والی شخصیات کے ٹائٹل شائع کیے جائیں۔ کتنی ہی ماڈلز اور اداکائیں ہیں جو بوڑھی ہوگئیں لیکن ہم انہیں شعاع یا خواتین کے سرورق پر کبھی براجمان نہ دیکھ سکے۔ حتیٰ کہ صائمہ، ریما اور میرا وغیرہ بھی کبھی ہمارے پیارے رسالوں کی زینت نہ بن سکیں۔ موجودہ دور میں ماہرہ خان، مہوش حیات یا صباء قمر جیسی سپر اسٹار بھی اس اعزاز کے انتظار میں ہیں۔ ان شخصیات کو سرورق پر لانے کے لیے آپ کو کوئی سپیشل شوٹ بھی نہیں کرنا ہوگا۔ بس نیٹ سے اٹھا کے کوئی بھی تصویر ٹائٹل کے معیار کے مطابق لگا دی جائے اس کے برعکس جن ماڈل گرلز کے ٹائٹلز آپ دیتے ہیں وہ کم وبیش درجن مرتبہ ٹائٹل کی زینت بن چکی ہیں مثلاً فریحہ اعجاز، صائمہ انصاری، رانیہ خان وغیرہ، ان کے چہروں کو بار بار دیکھ کر ہم بور ہو چکے ہیں۔ اکثر قارئین سرورق پر تصویر کے بجائے قدرتی مناظر دینے کی بات بھی کرتی ہیں۔ اس کے لیے آپ ماڈل کے بیک گراؤنڈ میں ہر دفعہ کوئی خوب صورت سا نظارہ دے دیا کریں۔ تاہم یکسانیت سے بچنے کے لیے حل یہ ہے کہ موسم اور تہواروں کی مناسبت سے تصاویر کا انتخاب کیا جائے رمضان میں دوپٹہ اوڑھے اور کبھی ساڑھی یا جدید ڈیزائن میں فیشن کے حساب سے تو کبھی مکمل اور منفرد پوز کے ساتھ فوٹو چنا جائے۔ سرورق کی شخصیت کے عنوان سے ماڈل گرل کا ایک دو صفحات پر مشتمل مختصر تعارف بھی شائع کیا جائے۔ یہ سلسلہ آپ نے کم وبیش بیس سال قبل شروع بھی کیا تھا۔ آپ دیکھیے گا یہ سلسلہ کتنا کامیاب ہوگا۔ ہم نے بھی صرف ٹائٹل پر اتنی بحث اس لیے کی کیونکہ یہ کسی بھی جریدے کا چہرہ اور مرکزی اہمیت کا حامل وہ حصہ ہے جس پر سب سے پہلے نظر جاتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں، سب قارئین پڑھیں اور اس سے متعلق اپنی رائے دیں۔ اسی سے اندازہ لگالیں ہمیں شعاع کی تحریروں اور اندرونی سلسلوں کے معیار کی کتنی فکر ہوگی۔ اس پر بحث پھر کبھی کرلیں گے۔

صدف، مقدس اور طوبیٰ! آپ نے جو مشورے دیے ہیں ان مشوروں میں سے کچھ مشوروں پر ہم پہلے ہی عمل کرتے ہیں۔ بہار کے موسم میں پھولوں والے، محرم اور رمضان میں سلیقے سے دوپٹہ سر پر اوڑھے اور عید، بقرعید پر ہم تیار کئی سنوری لڑکیوں کے ٹائٹل دیتے ہیں۔ ریما، میرا، اور صائمہ کے انٹرویوز اتنی بار شائع ہو چکے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی ایک بات بھی نئی نہیں ہوگی۔ جو غیر معروف شخصیات ہم ٹائٹل پر دیتے ہیں وہ نام کے علاوہ اپنے بارے میں کچھ شائع نہیں کرانا چاہتیں، ظاہر ہے کہ ہمیں ان کی خواہش کا احترام کرنا ہوتا ہے۔

شعاع سے آپ کی دلچسپی بلکہ محبت کا ہمیں اندازہ ہوگیا ہے اور اس کے لیے ہم تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

دسمبر 2020

کے شمارے کی ایک جھلک

- ''ایک تھی مانو'' نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- ''رقص شرر'' فائزہ ثمرین کا مکمل ناول،
- ''سب کھیڈ نصیباں دا'' حنا بشریٰ کا مکمل ناول،
- ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' راحت جبیں کا نیا ناول،
- نصرت یوسف، حمیرا عروش، عندلیب زہرا، فرح انیس، عنبرین ابدال، زینب نور اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- نمرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- باصلاحیت فنکار ''حامد نوید'' سے باتیں،
- مقبول مصنفہ ''فاخرہ جبیں'' سے ملاقات،
- ''کرن کرن روشنی'' احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، خبریں و بریں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر 2020 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

1۔شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟

7th کلاس میں اسٹارٹ کیا تھا خواتین اور شعاع۔اس سے پہلے جاسوسی، سسپنس، جواب مرض، آداب عرض سرگزشت وغیرہ پڑھتے تھے۔لیکن ایسا اپنے سحر میں کسی نے نہ جکڑا جیسے ان تینوں نے جکڑا ہم نے 2000 سے لیکر 2020 تک کے تقریباً سب شمارے پڑھ لیے۔ایک ریڑھی والے بابا تھے ہاشمی چوک پر (دریا خان کی سب سے مصروف سڑک) ہوتے تھے۔ہم پاکٹ منی کے حساب سے ان کی ریڑھی تلپٹ کرتے اور پرانی کتابیں خریدتے۔ہم لوگ سر جھکائے بس تلاش کرتے جاتے تھے۔

2۔دن کا آغاز

صبح فجر کی اذان پر امی، ابو اٹھتے ہیں۔ابو مسجد میں جبکہ امی اور ہم گھر میں نماز پڑھتے ہیں پھر ناشتے کے لیے میں کچن میں چلی جاتی ہوں بس ہو گیا نا دن کا آغاز؟

3۔افسانوں کی دنیا کیسی لگتی ہے؟

افسانوی دنیا کسے بری لگتی ہے تو مجھے بھی بہت پسند ہے لیکن الحمدللہ کبھی اس دنیا کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا۔بس سب ٹھیک ہے اور اتنا کافی ہے۔

4۔''خامیاں'' اور ''خوبی''

بقول میری ایک دوست صبا کے سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ حد درجہ جذباتی ہوں اور سب سے بڑی خوبی ایک اچھی اور حساس لڑکی ہوں اور بہت اچھی دوست ہوں بقول بہن کہ غصہ بہت زیادہ ہے اور ''خوبی'' بولتے ہوئے تھکتی نہیں ہو (یہ خوبی ہے کیا؟) ایجوکیٹڈ لوگوں سے بہت مہذبانہ انداز سے بولتی ہو۔کسی کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتیں، سب کو ہنسانا چاہتی ہوں کسی کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتی ہوں غریب پرور ہوں ملنسار اور خوش اخلاق بھی کسی نے کہا تھا اینگری، جینیس، بریلینٹ اور آؤٹ اسپوکن ہوں۔

نعتیں بہت خوب صورت پڑھتی ہوں۔میرے استاد کہتے ہیں بے انتہا خوب صورت آواز ہے قریباً 101 فیصد لوگ آواز کی تعریف کرتے ہیں جلد اعتبار کرنے اور جلد بازی میں فیصلے لینے والی، دوستوں پر جان نچھاور کرنے والی، چیزیں اور کام ٹھیک کرنے کے چکر میں سب غلط کر کے بات بات پر رونے والی کوکنگ، پڑھائی، کڑھائی، سلائی اور لڑائی میں طاق ہوں اور ہاں میں بے حد متلون مزاج ہو (بہت ہو گیا نا اب تو شرم بھی آنے لگی ہے لکھتے لکھتے)

5۔شعاع میں پسندیدہ تحریر؟ کسی کردار میں جھلک؟

شہر زاد، یارم، بن باھی بے حد پسند تھے اس کے علاوہ کوئی چاند رکھ — میرے ہاتھ پر، ضم سے صحر تک، نازنین بہت پسند ہیں اور شہر زاد ناول کی در شہوار کے کردار میں اپنی بے انتہا مماثلت نظر آئی۔اور رخسانہ نگار کا ناول آبگینے اور صائمہ کا ''توبہ'' اف بہت خوب صورت ناولز تھے۔

6۔بارش سے لگاؤ؟

اف ف ف بارش تو میرا جنون ہے، میرا عشق، کچھ بارشیں کبھی نہیں بھولوں گی ہاں وہ بارش بھی کبھی نہیں بھولوں گی جس میں فرزانہ گھر لی میرے ساتھ ''چھپا کے چھئی'' کھیلیں گی (کھیلیں گی نا فری، آئی لائک یو)

7۔پسندیدہ شعر؟

وہ اور وعدہ وفا کرے؟
تم بھی ناحسن کمال کرتے ہو!
جانے کس بات پر وہ ہم سے خفا ہیں محسن
خواب میں بھی ملتے ہیں تو بات نہیں کرتے
چاہتیں دیکھ کر لگتا تھا بچھڑنا ہی نہیں

نظر ایسی لگی تعلق کوئی بچا ہی نہیں۔
اور بہت سارے ہیں کون کون سے لکھوں؟

8۔ پسندیدہ کتابیں؟

نمل، حالم، الف، جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، زندگی تم ہو، قرا قرم کا تاج محل، بیلی راجپوتانا کی ملکہ، دل موم کا دریا، وہ جو قرض رکھتے تھے، پیر کامل، آب حیات دربار دل، پارس، مصحف، جفت ساز، متاع جاں ہے تو، خدا اور محبت، مقدس، بچپن کا دسمبر، شام رنگ سیاہ اور یہ صرف میرے فیورٹ ہیں کیونکہ جتنے ہم نے ناولز پڑھے ہیں ان کا تو کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔

9۔ پسندیدہ اقتباس؟

یوں تو بہت سارے ہیں اور سب کے سب سامنے بھی موجود ہیں لیکن جب ایک انتخاب کیا تو سب نے ہی منہ بسور لیا ویسے انتخاب تو میرے لیے بھی بہت مشکل تھا تو جناب میں نے تسلی دینے کے لیے سب کو ہی چھوڑ دیا۔ اب آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ہاشم ندیم کی تحریریں میرے اقتباس ہیں۔

10۔ پسندیدہ رائٹرز؟

جناب کس کا نام لکھیں اور کس کا چھوڑیں۔ کنیز نبوی، نایاب جیلانی، عمیرہ احمد، نمرہ احمد، سائرہ رضا، سمیرا حمید، ایمل رضا، ام طیفور، بنت سحر، فرزانہ کھرل، افشین نعیم، ماہا ملک، نگہت سیما، فرحت اشتیاق، منشا محسن، منعم ملک، راحت جبیں عنیزہ سید، نازیہ کنول انزی، سباس گل، سمیرا شریف طور اور میں نے چونکہ فی میل کے ساتھ ساتھ میل رائٹرز کو بھی بہت پڑھا ہے تو ان میں غلام قادر، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، طاہر جاوید مغل، ہاشم ندیم، حسام بٹ، کاشف زبیر (مرحوم)، مریم کے خان، امجد جاوید بہت پسند ہیں اور ہاں اپنی پیاری بہنیں (زینب نور، کوثر خالد، ڈاکٹر فریال، ریحانہ چوہدری، ماہا اور تبسم وغیرہ) پڑھ کر رائے دیں گی تو میں مشکور و ممنون کیوں کہ یہ سب مجھے بے حد پسند ہیں۔

☆

اداره خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو
نگہت عبداللہ
قیمت -/400 روپے

کسی راستے کی تلاش میں
میمونہ خورشید علی
قیمت -/350 روپے

اُجالوں کی بستی
فاخرہ جبیں
قیمت -/400 روپے

ایک میں اور ایک تم
تنزیلہ ریاض
قیمت -/350 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

اُمِّ الصبور

امانت

جس زمانہ میں یونس علیہ السلام نینوائی کے باشندوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے تھے وہ زمانہ آشوری حکومت کے عروج کا زمانہ تھا اور ان کا طرز حکومت قبائلی تھا اور ان کی آبادی تقریباً ایک لاکھ نفوس تھی۔

نینوی نہایت ہی ترقی یافتہ ملک تھا۔ یہاں کے باشندے پختہ مکانوں میں رہتے تھے اور ذریعہ آمدنی نہ صرف زراعت تھی بلکہ صنعت وحرفت بھی تھی۔

یہاں کے لوگ خوشحال اور عیش کوش تھے۔ انہیں زندگی کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ زندگی کی آسائش نے ان کی سوچ کو بدل دیا تھا اور وہ لوگ ایک خدا کی پرستش کرنے کے بجائے بت پرستی میں مبتلا تھے۔

ان کا خیال تھا کہ زندگی کی تمام نعمتیں ان بتوں ہی کے کرم سے ہیں اگر ہم انہیں خوش رکھیں گے تو یہ بھی ہمیں زندگی گزارنے کی نعمتوں سے سرفراز کرتے رہیں گے۔ اپنے اس نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ کے نام پر بت مخصوص کر رکھے تھے اور انہیں ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔

یوناہ بن امتی ان سب سے جدا نظریہ کا حامل تھا۔ اس کا شعور اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کہ پتھر کے تراشے ہوئے یہ بت انسانی زندگی میں دخل دے سکتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ زمین سے جو کچھ بھی اگتا ہے، وہ سب ایک ایسی ہستی کا کارنامہ ہے جو آسمانوں پر رہتی ہے۔

یوناہ بن امتی سن شعور کو پہنچتے ہی غور وفکر میں ڈوب گیا۔ وہ لوگوں سے بہت کم بات کرتا تھا، لیکن وہ اس معاشرے اور لوگوں کا گہری نظروں سے مشاہدہ کرتا رہتا تھا اور بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ لوگ بھٹکے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ صحیح راہ سے ہٹ چکے ہیں۔ ان کے شعور میں باطل قوتوں نے ڈیرہ جما لیا ہے لہٰذا مناسب ہے اس بات کا سدباب کیا جائے، لیکن وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ لوگ اس کی بات مانیں گے یا نہیں۔

یوناہ بن امتی ایک رات جب سونے کی خاطر بستر پر لیٹا تھا اور ابھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نیلے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے تو اس نے دیکھا کہ آسمان شق ہوا اور اس میں سے سفید وسبز رنگ کی روشنی زمین پر پڑنے لگی۔ پھر اس روشنی میں ہی ایک نورانی ہیولا نمودار ہوا اور وہ یوناہ بن امتی سے یوں مخاطب ہوا۔

"یوناہ! میں آسمانی رب کا فرشتہ ہوں اور اپنے رب کی طرف سے یہ پیغام لایا ہوں کہ تو بستر سے اٹھ، اپنی قوم میں جا اور ان کو شرک وبت پرستی سے منع کر۔"

یوناہ بن امتی فرشتہ کی بات سن کر بستر سے اٹھا اور اسی وقت اپنی بستی کی گلیوں میں اعلان کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

حضرت یونس علیہ السلام نے اٹھائیس برس کی عمر میں اپنی قوم میں وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی اور تقریباً دس برس تک مسلسل رشد وہدایت کی تبلیغ کرتے رہے لیکن کسی نے بھی اعلان حق پر کان نہیں دھرا اور شرک وکفر میں مبتلا رہے۔

وہ گزشتہ نافرمان قوموں کی طرح اس پیغمبر کی دعوت حق کا مذاق اڑاتے رہے بالآخر یونس علیہ السلام اپنی قوم سے تنگ آ گئے اور آپ نے ان کے لیے بددعا کی۔

اپنی قوم کے لیے بددعا کرنے کے بعد حضرت یونس علیہ السلام دریائے فرات کے کنارے پہنچے۔ آپ اپنی قوم کو چھوڑ کر ترسیس جانا چاہتے تھے۔ اس وقت ایک کشتی کنارے پر موجود تھی جو مسافروں کو لے کر جا رہی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ناخدا سے بات کی اور کشتی میں سوار ہو گئے۔

جب کشتی دریا کے بیچ میں پہنچی تو ہوا نے زور باندھا اور اس کے ساتھ ہی دریا میں اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں، جس کی وجہ سے کشتی ڈگمگانے لگی۔ مسافر اور ملاح اس ناگہانی طوفان سے خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے عقیدہ کے مطابق چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔

"معلوم ہوتا ہے کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہے اور جب تک اسے کشتی سے جدا نہیں کیا جائے گا۔ یہ

طوفان نہیں ٹلے گا۔"

حضرت یونس علیہ السلام نے ان کی سرگوشیاں سنیں تو سوچا کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ کو میرا اس طرح فرار منظور نہ ہو۔ یہ سوچ کر انہوں نے کشتی کے مسافروں سے کہا۔

"میں ہی وہ غلام ہوں جو کہ اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہوں لہٰذا مجھ کو کشتی سے باہر پھینک دو۔"

ناخدا اور مسافروں نے یہ سن کر کہا۔

"اے شخص! تو ہمیں پاکباز دکھائی دیتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ کو دریا میں ڈال دیں۔"

اس کے بعد ناخدا نے مسافروں سے کہا کہ وہ آپس میں قرعہ ڈالیں اور جس شخص کا نام نکلے اسے دریا میں پھینک دیا جائے تاکہ ہم سب کو اس طوفان سے نجات ملے۔

مسافروں نے قرعہ اندازی کی اور حضرت یونس کا نام نکل آیا۔

لیکن انہوں نے اس کو نہیں مانا اور دوسری بار قرعہ ڈالا، اس دفعہ پھر ان ہی کا نام نکل آیا۔ اس طرح تیسری بار بھی قرعہ اندازی کی گئی اور ان ہی کا نام نکلا۔

لہٰذا مجبور ہو کر انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دریا میں پھینک دیا۔

ابھی حضرت یونس علیہ السلام دریا کی سطح سے ٹکرائے ہی تھے کہ خداوند قدوس نے ایک بڑی سی مچھلی کو حکم دیا کہ میرے نیک بندے کو نگل جا۔

مچھلی سطح آب پر تیزی سے تیرتی ہوئی آئی اور اس نے حضرت یونس علیہ السلام کو نگل لیا۔

جب حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنے کا احساس ہوا تو انہوں نے حق تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا اور ساتھ ہی اپنے اس فعل پر اظہار ندامت بھی کیا کہ وہ اپنی قوم کو بغیر حکم الٰہی چھوڑ کر چلے آئے۔ انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں گڑگڑا کر دعا کی۔

"اے الٰہی! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں۔"

حضرت یونس علیہ اسلام کی یہ گریہ اور آہ وزاری حق تعالیٰ نے قبول فرمائی اور مچھلی کو حکم دیا۔

"کہ ہم نے جس شخص کو بطور امانت تجھے دیا تھا اسے خشکی پر ڈال دے۔"

چنانچہ مچھلی نے ایسا ہی کیا اور حضرت یونس علیہ السلام کو ساحل پر اگل دیا۔

مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کا جسم اتنا ملائم ہو گیا تھا جیسے کسی پرندہ کا بچہ انڈہ میں سے نکلتا ہے جس کے بال تک نہیں ہوتے۔ غرض یہ کہ حضرت یونس علیہ السلام نہایت ہی نحیف و ناتواں حالت میں خشکی پر ڈال دیے گئے۔ انہوں نے اپنی اس حالت پر غور کرتے ہوئے آبادی میں جانے کے بجائے ویرانے نے ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور اس خاطر دریا کے کنارے جھونپڑی بنا کر رہنے لگے۔

آپ نے جھونپڑی کے آس پاس چند درخت بھی اگا لیے تاکہ جب وہ بڑے ہو جائیں تو اس کے سائے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ آپ ہر روز صبح و شام درختوں کو پانی دیا کرتے تھے اور سارا سارا دن ان کی نگہداشت میں گزر دیتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد درختوں نے نشوونما پانی شروع کر دی۔ آپ یہ دیکھ کر خوش ہوئے، لیکن یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ کیونکہ ایک دن پانی دیتے ہوئے آپ کی نظر درختوں کے تنے پر پڑی۔ تنوں پر کیڑا لگا ہوا تھا اور درختوں کی نشوونما رک چکی تھی۔ یہ دیکھ کر آپ کو سخت افسوس ہوا اور آپ نے نہایت ہی عاجزی سے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔

"اے باری تعالیٰ! میں نے کتنی محنت سے ان درختوں کی آبیاری کی، لیکن اب جبکہ یہ توانا ہونے والے تھے تو ان کو کیڑا لگ گیا اور یہ سوکھنے لگے ہیں۔"

باری تعالیٰ نے فوراً ہی جواب دیا۔

"اے یونس! تجھے ان درختوں کے سوکھنے اور تباہ ہونے کا اتنا افسوس ہے، لیکن جب تو نے نینوی کے لوگوں کے لیے ہم سے عذاب لانے کی دعا کی تو یہ نہ سوچا کہ مجھ کو ان کی بربادی کیسے گوارا ہو گی۔

کیا ہم اپنے بندوں کے لیے شفیق و مہربان نہیں ہیں؟"

حضرت یونس علیہ السلام نے کلام الٰہی سنا تو فوراً اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا اور آپ واپس اپنی قوم میں چلے گئے۔

گزشتہ اقوام میں سے صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم ایسی تھی، جس نے عذاب آنے سے قبل اسلام قبول کر لیا اور وہ خدا کی سچی مطیع و فرمانبردار ہو کر عذاب الٰہی سے بچ گئی۔

☆

شکریہ

کچھ عرصہ قبل انوشے اشرف نے جانوروں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والے کراچی کے ادارے اے سی ایف اینمل کا دورہ کیا تھا (حیرت ہے جہاں انسانوں کی بحالی کے ادارے نہ ہوں وہاں جانوروں کی بہبود کا ادارہ ہونا باعث حیرت ہے۔) جہاں انہوں نے کتوں، بلیوں اور گدھوں سمیت دیگر جانوروں کے علیحدہ علیحدہ شیلٹرز کا دورہ بھی کیا اور لوگوں کو اس ادارے کے متعلق آگاہ کیا، جو جانوروں کی بحالی کے لیے کام کر رہا ہے۔

حال ہی میں انوشے ترکی گئیں تو وہاں انہوں نے گلی محلوں میں کتوں اور بلیوں کو لوگوں کے ساتھ دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا (کیوں بھئی؟) اور ساتھ ہی ترکوں کی تعریف بھی کی اور کہا کہ ترکی میں انسان اور جانور ایک ہی گلی میں گھومتے اور رہتے ہیں۔ (یہاں انسان انسان کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں آپ جانوروں کے ساتھ رہنے کی بات کرتی ہیں۔) انوشے نے جانوروں سے محبت اور ان کا احساس کرنے پہ ترک عوام کا شکریہ بھی ادا کیا۔ (لیکن آپ کیوں شکریہ ادا کر رہی ہیں؟)

تنقید

ترک ڈراما سیریل ارطغرل غازی کی اداکارہ باندے سوباسی ترکی کی بہترین اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ مس ترکی، کا خطاب بھی جیت چکی ہیں وہ ڈراما ارطغرل کی خوب صورت اداکاراؤں میں سے ایک ہیں۔ باندے سوباسی نے ارطغرل کے پہلے سیزن ترگت الپ کے مقابل مرکزی کردار ادا کیا تھا انہیں ڈرامے میں بہت بہادر اور سچائی کے لیے لڑنے والی خاتون دکھایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ صرف ایک ہی سیزن میں اداکاری کے باوجود لوگ ان کے کردار کو بھلا نہیں پائے ہیں۔

باندے سوباسی پاکستانیوں کی جانب سے ان کے لباس پر تنقید اور منفی تبصروں سے پریشان ہیں، کچھ عرصہ قبل حلیمہ خاتون کا کردار ادا کرنے والی اداکارہ اسریٰ بلیجک کے لباس پر تنقید کی تھی۔ اس کے بعد اسری نے سوشل میڈیا پر واضح پیغام دیا تھا کہ جو لوگ ان کے لباس کو پسند نہیں کرتے۔ انہیں چاہیے کہ وہ سوشل میڈیا پر انہیں فالو نہ کریں۔ باندے سوباسی کا کہنا ہے کہ "یہ بہت حساس معاملہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی اداکار جب اسکرین پر کوئی کردار ادا کرتا ہے تو مداح اسے اسی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ میرا کام صرف اپنی پیشہ ورانہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا اور اپنے کردار کو زندگی دینا ہے۔ اصل زندگی میں میں باندے سوباسی ہوں۔ اپنے کردار کو پسند کرنے پر اپنے مداحوں کی شکر گزار ہوں لیکن ذاتی زندگی میں ملنے والے منفی تبصروں اور تنقید سے بالکل خوش نہیں ہوں۔

اعتراف

بالآخر گلوکار ہارون بھی شادی کے بندھن میں بندھ گئے، ہارون کی شادی ہنزہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی فروا حسین سے ہوئی۔ دونوں کی پہلی ملاقات 2014ء میں فروا کی ایک کزن کے توسط سے ہوئی اس کے بعد دونوں کا رابطہ سوشل میڈیا کے ذریعے رہا لیکن ملاقات نہ ہو سکی اور دونوں اپنی زندگی کی مصروفیات میں گم رہے۔ 2020ء میں دونوں کی ملاقات دوبارہ ہوئی اور پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس بارے میں فروا کہتی ہیں کہ

درمیان دوسرے ون ڈے میں امپائرنگ کرکے اس فارمیٹ میں سب سے زیادہ 209 میچز سپروائز کرنے کا ریکارڈ توڑ دیا۔

علیم ڈار سے قبل یہ ریکارڈ جنوبی افریقا کے امپائر روڈی کرٹزن کے پاس تھا۔ اس حوالے سے علیم ڈار کا کہنا ہے کہ ”ٹیسٹ اور ون ڈے کی لسٹ میں ٹاپ پر آنا ان کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ علیم ڈار اس سے قبل ٹیسٹ امپائرنگ میں بھی ٹاپ پر ہیں۔ ان کے پاس یہ دونوں عالمی اعزاز ہیں۔ اب ان کی نظریں انٹرنیشنل ٹی ٹوئنٹی میچز میں امپائرنگ کے عالمی ریکارڈ پر ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

ہم نے ایک ندی پر نو تعمیر کردہ ایک ایسا پل دیکھا جو ابھی سے شکست وریخت کا شکار تھا! دروہاں ایک بورڈ آویزاں تھا کہ یہ پل حکومت فرانس کے تعاون سے تعمیر کیا گیا، تو میں نے ایک مقامی شخص سے کہا کہ کمال ہے یہ فرانس والے بھی اتنا دو نمبر کام کرتے ہیں تو وہ ہنس کر کہنے لگا۔ ”تارڑ صاحب ان کا کیا قصور ہے، اسے تعمیر کرنے والا ٹھیکے دار تو پاکستانی تھا۔

(کاروانِ سرائے۔ مستنصر حسین تارڑ)

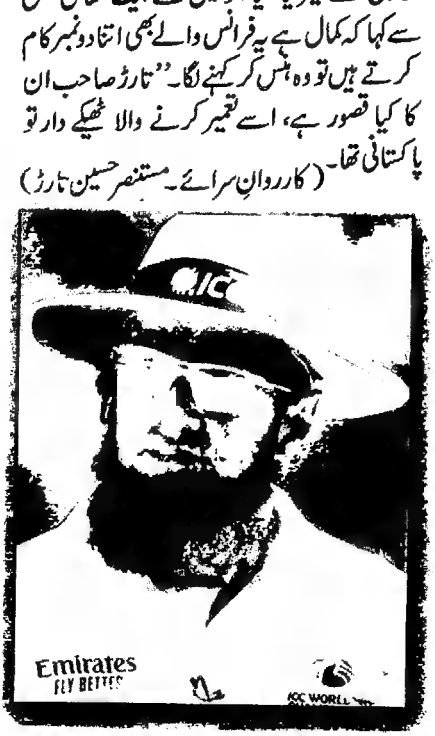

2020ء میں ہم نے چند ملاقاتیں کیں اور ایک دوسرے کو جاننے لگے (سچ میں) صرف دو ہفتوں بعد ہارون نے مجھے پرپوز کردیا اور یہ اعتراف کرکے کہ وہ مجھے پسند کرنے لگے ہیں، مجھے حیران کردیا (حیران یا پریشان کردیا۔) میں نے خوشی سے حیرت زدہ ہوکر فوراً ہاں کہہ دی (ہائیں اس سے پہلے کیا کسی نے پرپوز نہیں کیا تھا کیا؟) میں فوری طور پر جان گئی کہ ہم ایک دوسرے لیے بنے ہیں۔ مجھے یہ بات اچھی لگی کہ انہوں نے کوئی تعلق رکھنے کے بجائے شادی کی بات کی، اس لیے ہم نے وقت ضائع نہ کرتے ہوئے چند ہفتوں میں شادی کا فیصلہ کیا۔

ریکارڈ

پاکستان کا قومی کھیل ہاکی ہے لیکن عوام اور حکمرانوں دونوں کو دلچسپی کرکٹ سے ہے۔ کرکٹ کے دیوانوں کے لیے خبر ہے کہ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے پاکستانی امپائر علیم ڈار سب سے زیادہ ون ڈے انٹرنیشنل میچز سپروائز کرنے والے امپائر بن گئے ہیں۔

علیم ڈار نے پاکستان اور زمبابوے کے

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ہاٹ اینڈ سار سوپ

اجزاء:۔

چکن	سو گرام
یخنی	دو سے تین کپ
شملہ مرچ	ایک عدد
گاجر	ایک عدد
گوبھی	ایک چوتھائی
ہری پیاز	ایک عدد
چلی گارلک ساس	تین کھانے کے چمچے
ٹماٹو کیچپ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سفید مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
کارن فلور	چار کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد

ترکیب:۔

تین کپ چکن یخنی میں چکن ابلی ہوئی ریشے ریشے کر کے شامل کردیں۔ ساری سبزیوں کو لمبائی میں کاٹ کر شامل کردیں۔ پھر اس میں چلی گارلک ساس سویا ساس اور مسالے شامل کردیں، چار سے چھ منٹ تک پکائیں۔ جب یہ ابلنے لگے تو کارن فلور سے اس کو گاڑھا کرلیں۔ انڈے کو پھینٹ لیں۔ آدھے انڈے کو آہستہ آہستہ شامل کریں اور اسے دو سے تین منٹ تک پکاتے رہیں۔ آپ کا گرما گرم کھٹا سوپ تیار ہے۔ پیالے میں ڈال کر گارلک بریڈ اور بٹن مشروم کے سلائسز کے ساتھ پیش کریں۔

برگر

اجزاء:۔

بن	چار عدد
چکن	آدھا کلو
چاٹ مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
مسٹرڈ پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے
مایونیز	ایک کھانے کا چمچہ
چلی گارلک ساس	دو کھانے کے چمچے
سلاد پتے کھیرا ٹماٹر	حسب ضرورت

ترکیب:۔

چکن پر چاٹ مسالا، پسی لال مرچ، ادرک لہسن، نمک، لیموں کا رس، زردے کا رنگ، مسٹرڈ پیسٹ اور زیرہ لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ تیل گرم کر کے چکن فرائی کرلیں۔ اب برگر کو درمیان سے کاٹ کر ہلکا سا سینک لیں۔ اب اس پر مایونیز اور چلی گارلک ساس لگا کر چکن پیس رکھیں۔ پھر اس پر سلاد پتا، کھیرا اور ٹماٹر کاٹ کر رکھ دیں۔ آخر میں برگر کا دوسرا ٹکڑا رکھ کر سرو کریں۔

درباری مچھلی

اجزاء:۔

مچھلی	آدھا کلو
پسا ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
پسا زیرا	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ

ماہنامہ کرن

دسمبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

- اداکار ''آغا طلال'' سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار ''آغا مصطفیٰ حسن'' کہتے ہیں ''میری بھی سنیے''،
- اس ماہ ''طوبیٰ ممتاز'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،
- ''شادی مبارک'' مشہور رائٹر ''نزہت جبین ضیاء'' کی بیٹی کی شادی کا احوال،
- ''دامنِ سحاب'' مہوش افتخار کا نیا سلسلہ وار ناول،
- ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- ''کنارِ خواب جو'' فرح بخاری کا مکمل ناول،
- ''میرے چارہ گر'' نوشین فیاض کا ناول،
- ''کانچ سے سائبان'' مصباح علی سید کا ناولٹ،
- ''آخری کنارے پر'' سدرۃ المنتہیٰ کا ناولٹ،
- ''جوگا ہک پھولوں جیسا ہو'' شبانہ شوکت کا ناولٹ،
- قانتہ رابعہ، فرح طاہر، شمائلہ دلعباد اور زارا اعجز اکے افسانے اور مستقل سلسلے،
- **''کرن کتاب''**

مزے دار ریسیپیز کے ساتھ ایسے دلچسپ مضامین جو یقیناً آپ کی معلومات میں اضافہ کریں گے۔

دسمبر 2020ء کا شمارہ شائع ہوگیا

پسے ٹماٹر	دو کھانے کے چمچے
ڈرائی ریڈ فوڈ کلر	ایک سے دو قطرے
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
کٹا ہوا پودینہ	دو کھانے کے چمچے
میدہ	ایک چوتھائی کپ
پانی	تین سے چار کھانے کے چمچے
تیل	ایک چوتھائی کپ

ترکیب:۔

پہلے مچھلی کو دھو کر چھوٹے کیوبز کاٹ لیں۔ اب ایک پیالے میں ادرک لہسن، نمک اور لیموں کا رس شامل کر کے مچھلی پر لگا دیں۔ اور ایک طرف رکھ دیں۔ اب دوسرے پیالے میں زیرہ، دھنیا، گرم مسالا، لال مرچ، پسے ٹماٹر، ریڈ فوڈ کلر، اجوائن، ہرا دھنیا، پودینہ اور میدہ شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں اور پانی شامل کر کے گاڑھا سا پیسٹ تیار کر لیں۔ مسالا لگی مچھلی میں شامل کر دیں۔ اب توے یا کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ مسالا لگی ہوئی مچھلی کو ایک طرف سے رکھ کر تھوڑا تھوڑا سا فرائی کر لیں۔ جب سنہری رنگ آجائے تو دوسری طرف سے فرائی کر لیں۔ تیار ہونے پر نکال کر کسی بھی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

دھواں گوشت

اجزاء:۔

گوشت	ایک کلو
پیاز	آدھا کلو
پودینہ	ایک گٹھی
دہی	آدھا کلو
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن	چار جوئے
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

آدھی پیاز کو باریک کاٹ لیں اور باقی پیاز کے گول لچھے کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں پیاز کے لچھے، پودینہ اور ہری مرچیں ملا لیں۔ دیگچی میں گوشت، لال مرچ، نمک، دھنیا، باریک کاٹی ہوئی پیاز، لہسن ادرک اور تھوڑا سا پانی ڈال کر گوشت گلنے اور پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ اس میں تیل ڈال کر اچھی طرح سے بھون لیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو اس پر دہی، پیاز اور پودینے کی تہ لگائیں۔ کوئلے کو ایک ٹکڑا گرم کر لیں۔ دیگچی کے درمیان میں روٹی کا ٹکڑا رکھیں۔ اس پر گرم کوئلہ کا رکھ کر چند قطرے تیل ڈال کر ڈھکن ڈھانک دیں۔ پانچ منٹ دم پر رکھ کر دھواں گوشت ڈش میں نکالیں اور گرما گرم پیش کریں۔

پاؤ بھاجی

اجزاء:۔

گوار کی پھلی	آدھا پاؤ
آلو	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
پیاز	ایک عدد
مٹر	آدھا کپ
لہسن ادرک	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز ڈال کر تل لیں۔ سنہری ہو جائے تو ٹماٹر، مٹر، آلو، لال مرچ، نمک اور لہسن ادرک ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ آدھا کپ پانی ڈال کر پندرہ منٹ تک دھیمی آنچ پر پکائیں۔ آخر میں ایک چٹکی کلونجی ڈال کر سرونگ ڈش میں نکال کر پیش کریں۔

☆

سرد موسم میں بالوں کی دیکھ بھال

سرد موسم طبیعت پر اثر انداز ہونے کے ساتھ بالوں اور جلد کو بھی متاثر کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے بال خشک اور بے رونق ہوجاتے ہیں۔ سرد موسم میں گھر کے اندر اور باہر کا موسم مختلف ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے بالوں کی قدرتی چمک اور لچک متاثر ہوتی ہے۔ اسی طرح سر میں خشکی ہونا اور بالوں کے سرے پھٹ جانا یا زیادہ بال گرنا بھی سردی کے موسم کی عام شکایت ہے۔ سرد اور خشک ہواؤں کی وجہ سے سر کی نمی ختم ہوجاتی ہے جس سے بال خشک اور روکھے ہوجاتے ہیں۔

سر میں زیتون کا تیل لگائیں

سردی کے موسم میں درجہ حرارت کی کمی اور ٹھنڈی ہوائیں بالوں کی نمی ختم کردیتی ہے۔ زیتون کا تیل بالوں کی نمی بڑھانے اور سکون بخشنے کے لیے بہترین ہے۔ زیتون کے تیل کو ہلکا سا گرم کرکے بالوں اور سر میں لگا کر ہلکا ہلکا مساج کریں۔ بالوں کی نمی برقرار رکھنے کے لیے ہر دفعہ شیمپو کرنے سے پہلے لگائیں۔

گیلے بالوں کے ساتھ گھر سے نہ نکلیں

سردیوں میں بال سوکھنے میں وقت لگتا ہے، درجہ حرارت کم ہونے کی وجہ سے ہوا میں بھی بال نہیں سوکھ پاتے اور نہ ہی آپ ان کے سوکھنے کا انتظار کرپاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی گیلے بالوں کے ساتھ گھر سے نکلنے کی غلطی ہرگز نہ کریں۔ کیونکہ باہر کا سرد موسم بالوں کی جڑوں میں موجود پانی کو خشک نہیں ہونے دیتا۔ جس سے بال ٹوٹنے لگتے ہیں۔ سردی میں بال گرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ بالوں کو ایک دن پہلے دھولیں یا اگر جلدی ہو تو ڈرائر کا استعمال کرلیں۔

بالوں کو زیادہ جلدی نہ دھوئیں

بالوں کو جلدی جلدی دھونے سے سر کا قدرتی تیل ختم ہوجاتا ہے اور بالوں میں خشکی ہوجاتی ہے۔ سردی کے موسم میں بالوں کو ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ دھونا کافی ہوتا ہے کیونکہ سردی میں پسینہ نہیں آتا جس کی وجہ سے بال چکنے بھی نہیں ہوتے۔

بالوں کو زیادہ گرمی سے بچائیں

تیز گرم پانی کا شاور ہو یا بالوں کا اسٹائل بنانے والے گرم اوزار تمام چیزیں بالوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ بالوں پر استعمال ہونے والے گرم اوزاروں کا استعمال کم سے کم کریں۔ زیادہ گرمائش سے سر میں خشکی ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے بال کمزور ہوکر جھڑنے لگتے ہیں۔ خشکی کی وجہ سے سر میں خارش بھی ہوجاتی ہے۔ اسی طرح تیز گرم پانی بھی بالوں کو

نقصان پہنچاتا ہے۔ لہٰذا بالوں کو دھونے کے لیے نیم گرم پانی کا استعمال کریں۔

سرد موسم میں جلد کی حفاظت

موسم سرما شروع ہوتے ہی خواتین کو اپنی جلد کی خوب صورتی اور اس کی حفاظت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ ماہرین امراض جلد کے مطابق، سردیوں میں ہوا میں نمی کا تناسب کم ہوتا ہے اور یہ صورت حال انسانی جسم کی نمی کو کھینچ لیتی ہے۔ جلد اور ہونٹوں کے خشک ہو جانے اور پھٹنے کی شکایات بڑھ جاتی ہیں۔ سرد موسم میں جلد کی حفاظت پر تھوڑی سی توجہ دے کر اس کی خوب صورتی اور نکھار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

موئسچرائزر کا استعمال

خشک جلد کی حامل خواتین کو ایسے موئسچرائزر کا انتخاب کرنا چاہیے جو جلد کو مطلوبہ مقدار میں نمی فراہم کرے۔ حساس جلد کو سردیوں میں خاص طور پر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر چکنی جلد کی حامل خواتین کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ان کی جلد چونکہ چکنی ہے لہٰذا وہ سردیوں میں خشک نہیں ہوگی اور نہ ہی اسے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہے، جبکہ چکنی جلد والی خواتین کو بھی، سردیوں میں باقاعدگی سے موئسچرائزر اور جلد پر قدرتی اجزا کا استعمال کرنا چاہیے۔

میک اپ کا استعمال

سرد موسم میں میک اپ کرتے وقت بھی خاص خیال رکھیں۔ میک اپ سے پہلے کسی معیاری موئسچرائزر کا استعمال کریں۔ تاکہ جلد نرم و ملائم رہے اور میک اپ خشک اور پھٹا پھٹا محسوس نہ ہو۔ خشک جلد پر میک اپ اچھی طرح بلینڈ نہیں ہو پاتا۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک عجیب و غریب تاثر پیدا کرتا ہے اور جلد بھی کھردری محسوس ہوتی ہے۔

زیادہ گرم پانی خشکی بڑھاتا ہے

سردیوں میں گرم پانی سے نہانے کا مشورہ دیا جاتا ہے، تاہم یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ زیادہ گرم پانی بھی خشکی بڑھانے کا سبب بن سکتا ہے۔ بیسن سے نہانا بھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ بیسن کو دودھ یا دہی کے ساتھ ملا کر لیپ کر لیں، یہ ایک بہترین کلینزر کا کام دیتا ہے۔ جلد کی حفاظت کے لیے نہانے سے پہلے بے بی آئل یا کسی اور آئل کے چند قطرے پانی میں ڈال لیں اور اس کے ساتھ ساتھ کسی اچھے آئل سے جلد کا مساج کر کے نہانا بھی بہتر ہے۔

نرم و ملائم جلد

سردیوں میں جلد خشک ہونا ایک عام سی بات ہے۔ یوں تو خشکی کا اثر تمام جسم پر ہی ہوتا ہے لیکن ہاتھ اور چہرہ کھلے رہنے کے باعث زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے لیے رات کو سونے سے پہلے عرق گلاب۔ گلیسرین اور لیموں کا رس برابر مقدار میں لے کر اس میں تھوڑا سا روغن بادام یا زیتون باہم ملا کر رکھ لیں اور اس کو ہاتھ اور منہ پر لگائیں۔ اس سے خشکی نہیں ہوگی اور جلد نرم و ملائم رہے گی۔

ہاتھ پیروں کی جلد کی حفاظت

جن لوگوں کی جلد نازک ہوتی ہے سردیوں کے موسم میں ان کی جلد بہت اترتی ہے۔ اس کے لیے ایک چمچہ عرق گلاب میں دو بڑے چمچے گلیسرین اور ایک بڑے لیموں کا رس ملا کر کسی بوتل میں محفوظ کر لیں۔ رات کو سوتے وقت مساج کریں اور صبح دھو لیں۔ پھر کوئی اچھا سا لوشن لگا لیں۔ پانی کا کام کم کریں، یا دستانے استعمال کریں۔

pakistanipoint
www.pakistanipoint.com